
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
جولائی 2014

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے



مستقل سلسلے

جولائی 2014
جلد 28 شمارہ 11
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 91 بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا جولائی کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

اس ماہ رمضان المبارک کی بابرکت اور مقدس ساعتیں ہم پر سایہ فگن ہو رہی ہیں۔ یہ سعادت ہمیں نصیب ہو رہی ہے کہ ہم رمضان المبارک میں روزہ رکھ کر اور اپنے گناہوں سے توبہ استغفار کرکے اپنا دامن خیر و برکت سے بھرلیں۔

رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں قرآن پاک نازل کیا گیا جو تمام انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا، اس کو سننا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا رمضان المبارک کی خاص عبادات میں شامل ہے۔ ہم قرآن پاک پڑھتے ہیں، سنتے ہیں لیکن اس کے معنی اور مفہوم سے ناواقف رہتے ہیں۔ رمضان المبارک کے مہینے میں تلاوت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا وقت نکال کر اس کا ترجمہ بھی پڑھیں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ تاکہ ہم جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حکمت کے کیسے خزانے ہمیں عطا کیے ہیں۔

سالگرہ نمبر!

ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔ شعاع اپنے سفر میں ایک اور سال آگے بڑھ گیا۔ اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل ہو سکیں۔

قارئین سے سروے!

شعاع کے خاص نمبروں میں قارئین کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔ اس بار بھی قارئین سے سروے سالگرہ نمبر اور عید نمبر کے حوالے سے ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔

1. چاند رات کو آپ کی مصروفیات کیا ہوتی ہیں اور عید کا دن کیسے گزرتا ہے؟
2. وہ کون سی ڈش ہے جو عید کے دن آپ کے گھر میں لازمی طور پر بنتی ہے اور سب پسند کرتے ہیں۔ اس خاص ڈش کی ترکیب ہمیں بھی لکھ بھیجیں۔
3. شعاع میں شائع ہونے والی آپ کی پسندیدہ مصنفین کون سی ہیں اور وہ آپ کو کیوں پسند ہیں؟
4. اس سال شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں آپ کا پسندیدہ جملہ، شعر یا اقتباس جو آپ کو اچھا لگا ہو، قارئین سے شیئر کریں۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 15 جولائی تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

سمیرا حمید نے بہت کم عرصے میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کی تحریریں — زندگی کے دکھوں، تلخیوں اور انسانی فطرت کے تاریک پہلو کی عکاسی کرتی ہیں۔

اس بار سمیرا حمید نے اپنے انداز سے قدرے ہٹ کر ہلکے پھلکے خوشگوار انداز میں کہانی کا ناول لکھا ہے، جس میں زندگی کے کئی پہلو بھی سامنے آ رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے قارئین اسے پسند کریں گی۔

- پلم — سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- سمندر سے صحرا تک — کنیز نبوی کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ڈھل گیا ہجر کا دن — سدرۃ المنتہیٰ آصف کا مکمل ناول،
- فاخرہ گل، نمرہ، فائزہ افتخار اور نبیلہ عزیز کے ناولٹ،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- آئینہ خانے میں، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- قانتہ رابعہ، ثمینہ اشک، حمیرا نوشین، اور بینا کے افسانے،
- نئی فنکارہ عمر خان اور ارشد محمود کا انٹرویو،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،

حمد باری تعالیٰ

خلاق دو عالم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
سب کچھ ہے وہی اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

اس کے کرم نے پھول کھلائے ہیں دشت میں
ورنہ تو حسنِ موجِ صبا کچھ بھی نہیں ہے

روشن ہیں اس کے نور سے مہر و مہ و نجوم
ورنہ تو ان میں نور و ضیا کچھ بھی نہیں ہے

ہر اک نبی کا معجزہ اس کی ہی دین ہے
چاہے اگر نہ وہ تو عصا کچھ بھی نہیں ہے

جلوہ ہو کہ بینائی نظارہ کہ نظر ہو
تنویرِ الٰہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

وجدان پہ یہ حمد عطائے الٰہ ہے
ورنہ یہ میری فکرِ رسا کچھ بھی نہیں ہے

ریحانہ تبسم فاضلی

نعت رسول مقبول ﷺ

وہ ہے شاہِ عرب وہ ہے طٰہٰ لقب
وہ ہے جانِ جہاں اس پہ قربان سب
اس جہانِ محبت پہ لاکھوں سلام
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
بے وسیلوں کا تنہا وسیلہ بنا
بے سہاروں کا واحد سہارا بنا
ظلمتِ کفر میں وہ نویدِ سحر
شامِ غم میں سحر کا ستارہ بنا
اس نبیؐ کی رسالت پہ لاکھوں سلام
مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
وہ ہے بحرِ سخا، وہ ہے گنجِ عطا
وہ دعائے خلیل و حبیبِ خدا
اس کی شانِ سخاوت پہ لاکھوں سلام
وہ شہہِ ذی حشم ہے خدا کی قسم
وہ شفیع الامم ہے خدا کی قسم
اس نے راہِ ہدایت دکھائی ہمیں
وہ خدا کا کرم ہے، خدا کی قسم
اس چراغِ ہدایت پہ لاکھوں سلام!

بنتِ مجتبیٰ مینا

ادارہ

ماہ رمضان کے قیام (نماز تراویح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے (اللہ کے وعدوں پر) ایمان رکھتے ہوئے ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اور رمضان کا قیام کیا۔ اس کے وہ گناہ معاف کردیے جائیں گے جو پہلے (سرزد) ہوچکے ہیں۔"

(ترمذی)

فوائد و مسائل:۔

1۔ ہر عمل کے لیے خلوص نیت بہت ضروری ہے۔ روزے اور قیام کا ثواب بھی تب ہی مل سکتا ہے۔ جب یہ عمل خالص اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ہو، ریاکاری کے طور پر نہ ہو۔

گزشتہ گناہوں کی معافی سے عام طور پر صغیرہ گناہوں کی معافی مراد لی گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات کسی بڑی نیکی کی وجہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہوسکتا ہے۔ روزہ اور قیام جس قدر خلوص نیت کا حامل اور سنت کے مطابق ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ گناہوں کی معافی کا باعث ہوگا۔

نماز تراویح

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا۔

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رمضان کے روزے رکھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ایام میں قیام نہ فرمایا۔ حتیٰ کہ سات راتیں باقی رہ گئیں تو ساتویں رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز (تراویح) پڑھائی حتیٰ کہ تقریباً" تہائی رات گزر گئی، پھر اس سے متصل چھٹی رات آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام نہ فرمایا۔ پھر اس سے متصل پانچویں رات آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز (تراویح) پڑھائی حتیٰ کہ تقریباً" آدھی رات گزر گئی۔

ہم نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کاش آپ ہمیں اس رات کا باقی حصہ بھی عطا فرماتے۔" (پوری رات قیام فرماتے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص امام کے ساتھ اس کے فارغ ہونے تک قیام کرتا ہے۔ (اس کا) یہ (قیام) پوری رات کے (قیام کے) برابر ہوتا ہے۔"

پھر اس سے متصل چوتھی رات آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام نہ فرمایا۔ پھر اس سے متصل تیسری رات آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خواتین کو اور اہل خانہ کو اکٹھا کیا اور (بہت زیادہ) لوگ بھی جمع ہوگئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی حتیٰ کہ ہمیں خطرہ محسوس ہوا کہ ہماری فلاح چھوٹ جائے گی۔

(ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے) پوچھا گیا۔ "فلاح کا کیا مطلب ہے؟"

فرمایا۔ "سحری کا کھانا"

پھر فرمایا۔ "اس کے بعد مہینے کی باقی راتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز (تراویح) نہیں پڑھائی۔"

فوائد و مسائل

1۔ رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت کا اہتمام معمول سے زیادہ کرنا چاہیے۔

2۔ نماز تراویح نفل نماز ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مہینہ نہیں پڑھائی۔ صرف چند راتیں پڑھائی۔

3۔ نماز تراویح میں قیام، رکوع اور سجود وغیرہ طویل ہونے سے زیادہ وقت تک نماز ادا کی جاسکتی ہے اور کم تلاوت اور مختصر رکوع اور سجود کے ساتھ کم وقت میں بھی فراغت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس میں عام نمازیوں کے شوق اور ہمت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

4۔ نفل نماز میں تلاوت کی کوئی خاص مقدار مقرر کرنا ضروری نہیں، کسی دن طویل اور کسی دن مختصر قیام ہو سکتا ہے۔

5۔ طویل نماز پڑھنے کا ارادہ ہو تو تلاوت زیادہ کرلی جائے یا تلاوت ترتیل کے ساتھ کی جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فرمان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز رمضان میں بھی اور دوسرے مہینوں میں بھی وتروں سمیت گیارہ رکعت ہی ہوتی تھی۔ (بخاری)

6۔ نماز تراویح میں عورتوں اور بچوں کو بھی شریک ہونا چاہیے۔

7۔ سحری کا کھانا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روزوں میں امتیاز بھی ہے اور باعث برکت بھی۔ اس لیے فلاح کہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا رمضان تراویح نہیں پڑھائی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر یہ فرض ہو گئی تو امت کو اس پر عمل کرنا مشکل ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چونکہ یہ خطرہ نہیں رہا۔ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پورا مہینہ باجماعت تراویح کا اہتمام فرمایا۔

رات کا قیام (نماز تہجد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

"شیطان رات کو انسان کے سر کے پچھلے حصے میں رسی سے تین گرہیں لگاتا ہے۔ اگر انسان جاگ کر اللہ کا ذکر کرے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر جب اٹھ کر وضو کر لیتا ہے تو ایک (اور) گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر جب نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کی تمام گرہیں کھل جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ صبح کو چاق چوبند اور خوش باش ہوتا ہے۔ اسے بھلائی مل گئی ہوتی ہے۔ اگر (انسان) یہ کام نہ کرے تو صبح سست اور بوجھل طبیعت ہوتا ہے۔ اسے بھلائی نہیں ملی ہوتی۔"

1۔ شیطان ناری مخلوق ہے اور جن مخلوق ہے۔ اس کے بارے میں جو کچھ قرآن و حدیث سے ثابت ہو اس پر یقین رکھنا چاہیے۔

2۔ رسی، دھاگے یا بالوں میں گرہ لگا کر پھونک مارنا جادوگروں کا طریقہ ہے۔ قرآن مجید میں سورہ فلق ہے۔ "اور (میں) گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے (اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔) شیطان اس طرح انسان پر نفسیاتی اثر ڈال کر اللہ کی یاد سے غافل کرتا ہے جیسے کہ حدیث میں ہے کہ وہ ہر گرہ لگاتے وقت کہتا ہے۔ "ابھی بہت لمبی رات پڑی ہے، سویا رہ۔" (صحیح بخاری)

3۔ اللہ کی یاد شیطان کی تدبیروں کا بہترین توڑ ہے۔ جاگ کر اللہ کا نام لینا یعنی یہ دعا پڑھنا شیطان کی لگائی ہوئی گرہ کھول دیتا ہے۔ "تمام تعریفیں اس اللہ کی ہیں جس نے ہمیں موت دینے کے بعد (دوبارہ) زندگی بخشی اور (قیامت کے دن) آخر کار اسی کے پاس جانا ہے۔"

4۔ نماز تہجد شیطان کے شر سے محفوظ رکھنے والی ایک اہم چیز ہے۔

5۔ اللہ کی یاد اور نماز کی برکت سے روح کو آسودگی اور دل کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گریز پریشانی، بے سکونی اور سستی کا باعث ہوتی ہے۔

6۔ اللہ کی یاد سے دنیا کی بھلائی حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی رضا بھی نصیب ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین راتیں باجماعت قیام کیا

سیدنا ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (رمضان المبارک کے) روزے رکھے۔ (شروع میں) آپ نے ہمارے ساتھ مہینے میں سے کچھ بھی قیام نہ کیا۔ یہاں تک کہ 23 ویں رات کو آپ نے ہمیں قیام رمضان کرایا۔ پھر آپ نے 24 ویں رات چھوڑ کر 25 ویں رات کو۔ پھر 26 ویں رات کو چھوڑ کر 27 ویں شب کو اپنے اہل خانہ اور اپنی عورتوں کو اور سب لوگوں کو جمع کرکے قیام کیا اور فرمایا۔
"جو شخص امام کے ساتھ نماز عشاء ادا کرتا ہے۔ اس کے لیے پوری رات کا قیام لکھا جاتا ہے۔"

(سنن ابوداؤد)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تین رات کے بعد) فرمایا۔
"میں نے دیکھا ہے کہ تمہارا معمول برابر قائم ہے تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں تم پر (یہ نماز) فرض نہ کردی جائے۔ (اس لیے گھر سے نہیں نکلا) پس اے لوگو! تم اپنے اپنے گھروں میں (رمضان کی راتوں کا) قیام کرو۔ آدمی کی نفل نماز گھر میں افضل ہوتی ہے۔"

(صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شب قیام رمضان کرا کے لوگوں سے فرمایا۔ "تم اپنے گھروں میں پڑھا کرو۔" امام زہری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی یہی طریقہ جاری

رہا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ابتدائی دور میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا۔ (پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک امام کے پیچھے پڑھنے کا طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھا اور بوجہ خوف فرضیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل رمضان اختیار نہیں فرمایا تھا پھر سے جاری فرمایا۔)

(صحیح بخاری)

رمضان میں تہجد اور تراویح ایک ہی نماز ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 27 ویں رمضان المبارک کو اتنا لمبا قیام کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں سحری ہی فوت نہ ہو جائے۔

(ترمذی)

معلوم ہوا کہ ماہ رمضان میں تہجد اور قیام رمضان الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی نماز ہے۔ سرے سے منقول ہی نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی کسی رات کو تہجد اور قیام رمضان کا الگ الگ اہتمام کیا ہو۔

قیام رمضان

ابو سلمہ رحمتہ اللہ علیہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ
"رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات والی نماز کیسی تھی؟ سیدہ صدیقہ کبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا۔
"رمضان اور غیر رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز (بالعموم) گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔"

(صحیح بخاری)

سحری اور فجر کا درمیانی وقفہ

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے "انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر نماز فجر کے لیے کھڑے ہو گئے (اور نماز پڑھی) سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ

دونوں (سحری اور نماز) میں کتنا وقفہ تھا؟
تو انہوں نے بتایا کہ (سحری سے فراغت اور نماز میں داخل ہونے کا وقفہ) اتنا تھا جتنی دیر میں کوئی شخص قرآن حکیم کی پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھ لیتا ہے۔
(صحیح بخاری)

شب قدر کا بیان

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا۔ پھر آپ نے فرمایا۔ "مجھے شب قدر دکھائی گئی تھی۔ پھر بھلا دی گئی۔ اسے آخری دہائی کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔"

(بخاری)

1۔ شب قدر سال کی سب سے افضل رات ہے۔ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینے کی عبادت سے زیادہ فضیلت کی حامل ہے۔
2۔ شب قدر کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے اعتکاف کرنا سنت ہے۔ البتہ جو شخص اعتکاف نہ کر سکے اسے بھی راتیں عبادت میں گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
3۔ شب قدر بھلائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد نہ رہی کہ اس سال کون سی رات شب قدر ہے۔ ہر سال اسی رات میں ہونا ضروری نہیں۔
4۔ شب قدر آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔ اس لیے جو شخص دس راتیں عبادت نہ کر سکے۔ اسے یہ پانچ راتیں ضرور عبادت اور تلاوت و ذکر میں گزارنی چاہئیں تاکہ شب قدر کی عظیم نعمت سے محروم نہ رہے۔
اگرچہ علمائے کرام نے شب قدر کی بعض علامتیں بیان کی ہیں۔ لیکن ثواب کا دارومدار اس چیز پر نہیں کہ عبادت کرنے والے کو یہ رات معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ اس لیے اس پریشانی میں مبتلا ہونا چاہیے کہ ہمیں فلاں فلاں علامت کا احساس نہیں ہوا۔

رمضان کے آخری عشرے کی فضیلت

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔
"نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری دس دنوں میں اتنی محنت کرتے تھے جتنی اور دنوں میں نہیں کرتے تھے۔"

فوائد و مسائل

1۔ افضل ایام میں نیک اعمال کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔
2۔ رمضان کے آخری دس دن۔ سب سے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں۔ اسی طرح شب قدر کے علاوہ آخری عشرے کی باقی راتیں بھی رمضان کی دوسری راتوں کی نسبت افضل ہیں۔ اس لیے ان ایام میں ذکر و تلاوت اور صدقات و خیرات جیسی نیکیوں میں پہلے سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔

راتوں کو جاگنا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔
"جب آخری عشرہ شروع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگتے کمر کس لیتے اور گھر والوں کو بھی بیدار کرتے۔"

فوائد و مسائل

1۔ کمر کسنے سے مراد عبادت اور نیکی میں مزید محنت اور کوشش ہے۔
2۔ آخری عشرے کی اگر سب ہی راتیں عبادت

دونوں عیدوں کی راتوں کا قیام

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے اللہ سے ثواب حاصل کرنے کی نیت سے عیدین کی دونوں راتوں میں قیام کیا۔ اس کا دل

نہیں مرے گا۔ "جس دن (لوگوں کے) دل مر جائیں گے۔"

میں گزاری جائیں تو بہت بہتر ہے۔ ورنہ طاق راتوں کو تو اہتمام کرنا ہی چاہیے۔

3۔ نیکی کے کاموں میں اہل و عیال کو بھی شریک کرنا چاہیے' تاکہ وہ بھی عظیم ثواب سے محروم نہ رہیں اور اللہ کے ہاں بلند درجات حاصل کر سکیں۔

4۔ جاگنے کا مقصد عبادت' ذکر اور تلاوت میں مشغول ہونا ہے۔ بعض لوگ یہ فضیلت والی راتیں فضول بات چیت میں گزار دیتے ہیں' یہ انتہائی محرومی اور بدقسمتی کی بات ہے' خاص کر مساجد میں شور و غوغا' عبادت کرنے والوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔

5۔ بہت سی مساجد میں طاق راتوں میں اور خاص طور پر ستائیسویں رات کو وعظ و تقریر کا پروگرام ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے رات کا اکثر حصہ اسی مصروفیت میں گزر جاتا ہے۔

6۔ اسی طرح ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچے اور بڑے سب ہی عبادت و تلاوت کو بھول کر مسجد کے آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے شور شرابے میں لگے رہتے ہیں۔ جس سے نہ صرف عبادت کرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے' بلکہ یہ انتہائی قیمتی وقت فضول کاموں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے ان امور سے اجتناب کیا جائے۔

جانداروں پر رحم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دفعہ آدمی راستے پر چلا جا رہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی۔ اس نے ایک کنواں پایا تو اس میں اتر کر اس نے پانی پیا' پھر باہر نکل آیا۔ وہیں ایک کتا تھا جو پیاس کے مارے زبان باہر نکالے (ہانپتے ہوئے) کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس آدمی نے (دل میں) کہا۔ اس کتے کو بھی اسی طرح پیاس نے ستایا ہے' جس طرح مجھے اس کی شدت سے بے حال ہو گیا تھا' چنانچہ وہ (دوبارہ) کنوئیں میں اترا اور اپنا موزہ پانی سے بھرا اور اسے اپنے منہ سے پکڑے اوپر چڑھ آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل اور جذبے) کی قدر کی اور اسے معاف فرما دیا۔"

(یہ سن کر) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہمارے لیے چوپایوں (پر ترس کھانے) میں بھی اجر ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(ہاں) ہر تر جگر والے (جاندار کی دیکھ بھال) میں اجر ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے عمل کی قدر کی۔ چنانچہ اسے بخش دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔"

اور بخاری' مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

"ایک دفعہ ایک کتا کنوئیں کے گرد چکر لگا رہا تھا' اسے پیاس مارے دے رہی تھی کہ اچانک اسے بنی اسرائیل کی فاحشہ عورتوں میں سے ایک بدکار عورت نے دیکھا' پس اس نے اپنا موزہ اتارا اور اس کے ذریعے سے اس نے اس کے لیے (کنوئیں سے) پانی کھینچا اور اسے پلا دیا تو اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے بخش دیا گیا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی ہر مخلوق کے ساتھ حتی کہ جانوروں کے ساتھ بھی احسان کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت بڑی وسیع ہے' وہ اگر چاہے تو تھوڑے سے عمل کو بھی قبول فرما کر بندے کی مغفرت فرما دے۔

3۔ قاعدہ یہی ہے کہ کبیرہ گناہوں سے توبہ کی جائے' تاہم بسا اوقات خلوص نیت سے کیا ہوا نیک عمل بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور انسان کے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

بندھن

امبر خان ہمراہ ارشد محمود

شاہین رشید

کبھی کبھی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنہیں ہم بہت چاہتے ہیں جب وہ ہماری زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں پہلے جیسی شدت نظر نہیں آتی۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنہیں ہم چاہتے ہی نہیں ہیں مگر جب وہ ہماری زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ شخص ہماری زندگی کے لیے کتنا اہم ہے اسے ہم خواہ مخواہ نظر انداز کرتے رہے۔ ایسی ہی کچھ کی ایک کہانی "امبر خان" کی ہے۔ آیئے جانتے ہیں امبر خان کی شادی کیسے ہوئی اور اب کیسی گزر رہی ہے۔

"کیسی ہو امبر اور کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

"آج کل ماشاء اللہ سے بیٹے "چھوٹے" کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ بھی ایک فل ٹائم جاب ہے اور یہ جاب ضروری بھی ہے اور مزے دار بھی ہے۔"

"نام کیا ہے اور عمر کتنی ہے؟"

"یہ ابھی سوا سال کا ہے اور اس کا نام "ابوبکر" ہے مجھے یہ نام بے انتہا پسند تھا اور ہم میاں بیوی نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکا ہوا تو "ابوبکر" رکھیں گے اور اگر لڑکی ہوئی تو "فاطمہ" رکھیں گے۔ساس سسر چونکہ ذرا مذہبی ٹائپ کے ہیں تو وہ تو بہت ہی خوش ہوئے البتہ میری امی کو تھوڑا سا اعتراض تھا کہ اتنا بڑا نام پھر لوگ نام بگاڑتے ہیں تو کتنا بھی سے گا تو میں نے کہا کہ لوگ جو بھی بولیں مجھے ان کی پروا نہیں ہے اور اللہ اس نام کی اور ہمارے بیٹے کی خود ہی حفاظت کرے گا۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟"

"شادی کو تقریباً" ساڑھے چھ سال ہوگئے ہیں اور یقیناً" اب آپ پوچھیں گی کہ پہلی اولاد اور اتنی دیر سے تو۔ شروع میں پلان نہیں تھا پھر ایک دو گڑبڑ بھی ہوگئی۔ بس پھر جب اللہ کی مرضی ہوئی تو "ابوبکر" صاحب آگئے۔"

"اپنی شادی کے بارے میں اور میاں صاحب کے بارے میں بتاؤ؟"

"میرے میاں صاحب کا نام ارشد محمود ہے۔ ایم بی اے سے انہوں نے گریجویشن کیا ہے اور گرافک ڈیزائنر ہیں اور ہماری شادی ہوئی ہے 13 مارچ 2009ء کو۔"

"کوئی ملاقات تھی۔ کوئی ریلیشن تھا فیملی کا؟"

"آپ کو پتا ہی ہے کہ ان کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے تو یہ پہلے ان کے پاس جاب کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ پسند کرتے تھے مجھے پھر انہوں نے امی سے بات کی میں نے کہہ دیا کہ مجھے ان سے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں۔۔۔؟"

قہقہہ۔۔۔ "کیوں کہ یہ مجھے پسند نہیں تھے اور۔۔۔"

"ارے۔۔۔ لیکن اور کیوں پسند نہیں تھے؟"

"ہاں... ہاں بالکل لکھ دیں... میں تو ٹی وی انٹرویوز میں بھی صاف صاف کہہ دیتی ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور... دراصل ہر انسان کی اپنی ایک چوائس ہوتی ہے۔ بہت چھوٹی تھی کہ شوبز میں آگئی تھی اور شوبز میں اتنے ہینڈسم لڑکے تھے تو ان کو دیکھ کر ذہن میں یہی تھا کہ ایسا ہو' ویسا ہو۔ نویں کلاس میں تھی جب میں اس فیلڈ میں آئی... آپ خود سوچیں کہ عمر تو کچی تھی نا... پھر آہستہ آہستہ ہی میچور ہوتا ہے۔ پھر جب عقل آئی تو میں نے امی سے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے مجھے آپ کی پسند سے ہی شادی کرنی ہے تو ارشد امی کی ہی پسند ہیں۔"

"اچھا گڈ... تو پھر ارشد صاحب کب پسند آنا شروع ہوئے؟"

بے ساختہ ہنستے ہوئے... "مت پوچھیں... سب نے دل کر ہاں کروائی مجھ سے۔"

"اوہو... پھر ہاں کرنے کے بعد کیا ری ایکشن تھا تمہارا؟"

"امی سمجھاتی رہتی تھیں کہ وہ میرا دیکھا ہوا ہے... بڑوں کے فیصلے اور تجربے بہتر ہوتے ہیں۔ ابھی تم نوجوان ہو' میری باتیں سمجھ میں نہیں آرہی' ایک دن ایک وقت آئے گا کہ 'تمہیں میرا فیصلہ ٹھیک لگے گا۔' بس امی کی بھری ہوئی چابی نے مجھے چلا دیا اور شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ 'واقعی بہت خیال رکھنے والے بہت اچھے انسان ہیں۔'"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور اس دوران ملنا جلنا مطلب ڈیٹ وغیرہ...؟"

"ہاں ہاں... ملنا جلنا 'آنا جانا' رہتا تھا اصل میں مجھے بہت ٹائم چاہیے تھا کہ میں ان کو اچھی طرح جان لوں اور اس کام میں مجھے آٹھ سال لگ گئے۔ آٹھ سال کے بعد میں نے شادی کی۔ ان کا میں نے بہت دل توڑا' میری بہن بھی کہتی تھیں کہ تم نے ایک اچھے انسان کو بہت پریشان کیا۔"

"بڑی بات ہے ورنہ تو لڑکے کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے ایک بار ریجیکٹ کیا ہے تو میں سو بار کرتا ہوں... پھر شادی کے بعد کوئی بدلہ کوئی انتقام تو نہیں لیا ارشد صاحب نے؟"

"نہیں اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا کیوں کہ یہ بہت اچھے مزاج کے ہیں بلکہ یہ مجھے کہتے ہیں کہ تمہارا مزاج بہت گرم ہے' تھوڑا اسے آپ کو ٹھنڈا رکھا کرو... انہیں پتا ہے کہ میرا مزاج کیسا ہے اور میں کسی بھی وقت کچھ کہہ سکتی ہوں؟"

"ارشد محمود صاحب کا تعلق کہاں سے ہے اور کتنے فیملی ممبرز ہیں؟"

"یہ لوگ ایبٹ آباد کے ہیں۔ دو نندیں ہیں میری۔ ایک دیور اور ایک جیٹھ ہیں۔ دیور دبئی میں ہوتے ہیں۔ جیٹھ کراچی میں' ان کی پوسٹنگ ہوتی رہتی ہے۔ ساس ہیں' سسر جی نہیں' تو کبھی کہیں... سالوں بعد ہم لوگ اکٹھے ہوتے ہیں' کبھی کسی تہوار پہ تو کبھی کسی تقریب میں۔"

"سسرال کو کیسا پایا... رسمیں وغیرہ ہوئیں' آپ کی تو بھگت ہوئی؟"

"جیسا کہ میں نے بتایا کہ ایبٹ آباد سے تعلق ہے تو ان لوگوں کے مزاج میں اور کلچر میں بھی کافی فرق ہے۔ میں جب وہاں جاتی ہوں تو بہت آؤ بھگت ہوتی ہے

اور بہت عزت بھی دیتے ہیں اور جب ابوبکر کو پہلی بار لے کر گئی تو بہت شاندار استقبال ہوا' پھر ان کے آبائی گاؤں بھی گئی۔ وہاں تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہم لوگ منسٹر ہیں' ان کے گاؤں والے بہت عزت خاطر کرتے ہیں' مجھے وہاں سب 'ٹی وی والی' بولتے ہیں۔"

"شادی سے پہلے ارشد مزاج کے کیسے تھے اور شادی کے بعد کوئی تبدیلی آئی مزاج میں؟"

"شادی سے پہلے تو لڑکی کو پتا ہوتا ہے نا... قہقہہ' پھر تو جی حضوری ہو رہی ہوتی ہے۔ ساس کی بھی خدمت ہو رہی ہوتی ہے۔ مجھے قابو کرنے کے لیے میری بہنوں سے بہت اچھے تعلقات رکھے ہوئے تھے... شادی کے بعد یہ چیخ چلا کر بھی تو



میں منہ سے بولتی تھی اور وہ جج حاضر ہو جاتی تھی۔ اب
اچھا ہاں سے تو میں گا کروں گا۔ اب یا دو [illegible] کرنی پڑتی
ہے۔"

"آپ بتا رہی ہیں کہ رسم و رواج میں فرق ہے اور کھانے وغیرہ میں؟"

"جی ہم اردو اسپیکنگ اور یہ پٹھان ہیں تو بہت زیادہ فرق ہے رسم و رواج میں بھی اور کھانے وغیرہ میں بھی۔ ہم لوگ ذرا آزاد خیال ہیں جبکہ پٹھان لوگوں کے ہاں بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جذباتی بھی بہت ہوتے ہیں ان کے یہاں عزت غیرت بہت ـــ ہوتی ہے۔ سخت پردہ ہوتا ہے کسی غیر مرد کے سامنے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سر پہ دوپٹہ ہر وقت لینا پڑتا ہے۔

اور جہاں تک رسموں کی بات ہے تو ہماری طرف کی رسمیں زیادہ مزے دار ہوتی ہیں اور ان کے یہاں جو جرگوں میں شادیاں ہوتی ہیں وہ زیادہ اچھی ہوتی ہیں مگر میری شادی ایبٹ آباد میں نہیں ہوئی تھی ان کے یہاں روایتی ڈانس گانا بہت مزے کا ہوتا ہے اور کھانوں کے ٹیسٹ میں بھی فرق ہے۔ ان کے کھانے بہت پھیکے ہوتے ہیں۔ ہمارے کھانے چٹ پٹے ہوتے ہیں۔ اب تو خیر ان کو بھی چٹ پٹے کھانوں کی عادت ہو گئی ہے۔ جب اپنے گاؤں جاتے ہیں تو بالکل بھی نہیں کھا پاتے۔"

"پٹھانوں میں غصہ بہت ہوتا ہے تو یہ کیسے ہیں؟"

"ان کا پورا گھرانہ بہت غصے والا ہے۔ لیکن یہ خود بہت نرم مزاج ہیں۔ سہہ لیتے ہیں۔ اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھتے ہیں اگر کبھی بہت ہی زیادہ غصہ آجائے تو بس یہ ہوتا ہے کہ گھر سے چلے جاتے ہیں کئی گھنٹوں کے لیے اور پھر میں اپنی ساس کو فون کر کے فوراً ان کی شکایت کر دیتی ہوں۔"

"نکاح اور رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے آپ کے؟"

"نکاح کے وقت تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ امی میرے پاس بیٹھی تھیں اور میں امی سے کہہ رہی تھی کہ آپ "ہاں" بول دیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دن مجھے بہت شدید بخار تھا اور جب تک شادی کی

ساری تیاری میں نے خود کی تھی تو میں بے انتہا تھک بھی گئی تھی۔ مہندی کے دن میرا نکاح ہوا تھا مجھے اتنی گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔"

"لباس کے معاملے میں بھی فرق ہے؟"

"پہلے دن کا عروسی جوڑا لال رنگ کا تھا جبکہ مجھے لال رنگ پسند نہیں تھا مگر میں نے اپنی نند کے اصرار پر بنوا لیا تھا۔ لیکن پہلے دن کا جوڑا بہت اچھا تھا۔ باقی جوڑے بھی میں نے اپنی پسند سے بنوائے تھے۔ ولیمہ کا گولڈن تھا۔"

"شادی کے فائدے ہیں یا نقصان؟"

"دونوں ہی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہے کہ جو کھائے وہ پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ ویسے بیچلر لائف کا اپنا ہی مزا ہے۔ جبکہ میرج لائف میں ذمہ داریوں کا بہت بوجھ ہوتا ہے۔ سب کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تو میں تو یہی کہوں گی کہ شادی ضرور کریں مگر ذرا لیٹ کریں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"

"منہ دکھائی میں ڈائمنڈ رنگ ملی تھی اور ہنی مون پورا پاکستان گھوم پھر کر منایا۔ میرے دو ولیمہ ہوئے تھے ایک کراچی میں اور ایک ایبٹ آباد میں۔ تو ہمارا ہنی مون بھی دو بار ہوا ایک بار مری گئے اور ایک بار جب ولیمہ کے لیے ایبٹ آباد گئے تھے۔"

"رومانٹک مزاج کون ہے آپ یا ارشد صاحب؟"

"یہ تو بالکل بھی رومانٹک مزاج نہیں ہیں۔" قہقہہ "کوئی خاص اظہار نہیں کرتے جبکہ میں بہت رومانٹک مزاج ہوں۔ ارشد بہت سادہ مزاج ہیں۔"

"کوئی اچھی اور بری عادت۔ بچت کی عادت کس کو ہے؟"

"اچھی عادت یہ ہے کہ ماشاء اللہ صابر بہت ہیں۔ میرے ارد گرد کے سب دوست احباب تو یہی کہتے ہیں کہ تمہیں برداشت کر رہے ہیں اور بری عادت یہ کہ لیٹ آتے ہیں تو میں چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔ اور بچت کی عادت تو میری گھٹی میں ہے۔ میرے خیال میں ایک اگر فضول خرچ ہو تو دوسرے کو لازمی سمجھ دار ہونا چاہیے۔"

"گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"بالکل۔ پہلے تو نہیں کرتے تھے یہ لیکن میں تو ضرور کرواتی ہوں اب۔ ابوبکر کے وقت مجھے مکمل بیڈ ریسٹ کہا گیا تھا تو سارے کام انہوں نے ہی کیے تھے۔ کیوں کہ ان کا بھی تو بچہ تھا اس لیے انہوں نے تو سارے کام خوشی خوشی کیے۔"

"جب والدہ گھر جاتے ہیں آپ دونوں تو یہ تو اپنی زبان میں بات کرتے ہوں گے تو آپ کی سمجھ میں آجاتی ہے؟"

"جی ہمیشہ اردو زبان میں بات کرتے ہیں۔ سمجھ میں تو آجاتی ہے مگر بولنے میں مجھے دشواری ہوتی ہے۔ ہندکو سے بہتر مجھے پنجابی لگتی ہے اور پنجابی میں بول لیتی ہوں۔"

"شام کو گھر آنے پر ساری دن کی روداد سناتی ہیں؟"

" SMS کر دیتی ہوں۔ سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ شام کا انتظار کون کرے اور میں سمجھتی ہوں کہ جو میں کر رہی ہوں بالکل صحیح کر رہی ہوں میں چپ بیٹھا کر نہیں رکھ سکتی۔ مردوں کے بالکل بھی نخرے نہیں اٹھانے چاہئیں ورنہ یہ خراب ہو جاتے ہیں۔ عورت کو نخرے اٹھوانے چاہئیں۔"

"آپ کہہ رہی تھیں کہ شادی جلد نہیں کرنی چاہیے تو آپ کے خیال میں لڑکے اور لڑکی کو کس عمر میں شادی کر لینی چاہیے؟"

"اب تو لوگ ذرا دیر سے شادی کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ دیر سے شادی نہیں کرنی چاہیے کہ پھر اولاد میں مسئلہ ہوتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ "ہائے یہ تو بڑھاپے کی اولاد ہے" تو جلدی شادی کرلیں تو بہتر ہے۔"

"اسلام میں۔؟"

"جی جی مجھے معلوم ہے اور میں انہیں کہہ بھی دیتی ہوں۔ یہ کہتے ہیں تم کیسے ایسی ایسی باتیں سوچ لیتی ہو۔ کبھی کہتے ہیں۔ آج کون سا اسٹار پلس کا ڈرامہ دیکھ لیا تھا۔"

"ارشد صاحب کا کیا دل چاہتا ہے کہ آپ ہر وقت فٹ فاٹ رہا کریں؟"

"نہیں میں بالکل سیدھی سادھی سی ہی اچھی لگتی ہوں۔ اور میں عادی ہو گئی ہوں ان کی باتوں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت کا صحیح روپ سادگی میں ہی نظر آتا ہے۔"

"سالگرہ مناتی ہیں؟"

"بالکل۔ بچپن سے شوق ہے۔ بڑے چھوٹے بھی اور شادی کی سالگرہ بھی مناتی ہوں۔ شوق سے تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے خود لا لا کر دیتے تھے اب زبردستی لینا پڑتا ہے۔ شادی سے پہلے تو یہ جو دیتے تھے لے لیتی تھی مگر شادی کے بعد اگر یہ ڈائمنڈ کا تحفہ نہ دیں تو بس پھر میری ان کی خوب لڑائی ہوتی ہے۔" قہقہہ۔ "ایک بار انہوں نے "ایکس فور" لا کر دیا کہ بے بی اب کوئی کریڈٹ تحفہ خرید لو مگر میں نے کہا کہ "ایکس فور" (موبائل) سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہے۔"

"آپ کے ہاتھ کا کون سا کھانا پسند ہے؟"

"میرے ہاتھ کے پکے ہوئے سارے کھانے پسند ہیں۔ کیوں کہ میرے ہاتھ میں ذائقہ ہے اور وہ عورت ہی کیا کہ جس کے ہاتھ میں ذائقہ نہ ہو۔ میری ماں نے مجھے ہر کھانے میں پرفیکٹ کیا ہوا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس لڑکی کو اچھا کھانا پکانا نہ آتا ہو وہ اپنا گھر اچھے طریقے سے نہیں بسا سکتی۔ میری ساس میرے پکائے ہوئے کھانے بہت پسند کرتی ہیں اور جب میں سسرال جا کر پکاتی ہوں تو میری ساس اپنے آس پاس کے سب لوگوں کو بتاتی ہیں کہ یہ میری بہو نے پکایا ہے۔"



"اچھا۔ سال کی تگ و دو کے بعد جب شادی ہو گئی تو ارشد صاحب نے کمرے میں آکر پہلا جملہ کیا بولا تھا؟"

"یہ تو اتنے تھکے ہوئے تھے کہ کمرے میں آتے ہی کلاہ اتار اور لیٹ گئے کہ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے اتنا عجیب لگا۔ میں نے دل میں کہا "آج تو کوئی اچھی بات کر لیتے" کوئی رومینٹک جملہ بول دیتے" قہقہہ۔ "اصل میں شادی کی ساری تیاری انہوں نے اکیلے کی۔ اس لیے بہت تھک چکے تھے تو میں نے بھی بے ساختہ کہہ دیا۔ کم سے کم اتنا ہی کہہ دیتے کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

"اسبر! بہت شکریہ اتنا اچھا انٹرویو دینے کا اور مصروفیات میں سے ٹائم نکالنے کا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم انٹرویو کا اختتام کیا۔

سرورق کی شخصیت

دستک دستک دستک

شاہینہ رشید



مصطفیٰ چوہدری

"کیا حال ہیں۔ آپ کا پورا نام چوہدری محمد مصطفیٰ ہے چوہدریوں والا رعب ہے؟"

"نہیں چوہدریوں والا رعب نہیں ہے اور رعب ہونا بری بات ہے۔ اس لیے رعب نہیں ڈالتا۔"

"لوگ چوہدریوں کو بہت اونچی سمجھتے ہیں کہ جی ان کی تو زمینیں ہوں گی مزارعے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔"

"زمینیں تو ہماری ہیں اور کام کرنے والے بھی الحمد للہ کا شکر ہے کہ ان پر رعب نہیں ڈالتے۔ کسی کو کمتر نہیں سمجھتے۔"

"آپ کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی خوب صورتی بہت مشہور ہے۔ یہاں کراچی کیوں آئے اور کیا کشمیر آنا جانا لگا رہتا ہے؟"

"یہاں کیا کر رہا ہوں یا کیوں آگیا تو جناب اللہ نے یہاں رزق باندھا ہوا ہے اس لیے اور کشمیر واقعی بہت خوب صورت ہے۔ آنا جانا رہتا ہے کیوں کہ وہاں ہمارے دادا دادی اور دیگر رشتے دار کزن وغیرہ ادھر رہتے ہیں۔ سال میں ایک دو چکر تو ضرور لگتا ہے۔ میں تو اللہ کی سے جیواں۔"

"ہاں۔ لیکن شوبز میں بھائی کی وجہ سے آئے؟"

"ہاں بھائی کی وجہ سے۔ مرتضیٰ (بھائی) نے ایک شو ڈیزائن کیا تھا "فور مین شو" جو سیاسی طنز و مزاح کا شو تھا اس سے قبل میں نے آرٹ تھیٹر کیا ہوا ہے تھیٹر کے ساتھ تو جب یہ آئیڈیا مرتضیٰ کے ذہن میں آیا تو پھر سر جوڑ کر بیٹھے لکھا اور پیش کر دیا تو اور پھر اللہ کا کرم ہو گیا سب کو بہت پسند آیا اور سلسلہ چل پڑا۔"

"کشمیر اپنا۔ پاکستان بھی اپنا۔ کبھی دل چاہا کہ دوسرے ملک جا کر رہوں؟"

"ارے نہیں۔ دوسرے ملک میں جاتا ضرور ہوں وہاں کے قوانین سے متاثر بھی ہوتا ہوں مگر وہاں کبھی رہنا نہیں چاہتا کیوں کہ مجھے اپنا ملک بہت پیارا ہے اور ہم خوامخواہ اپنے ملک کو انڈر ایسٹیمیٹ کرتے ہیں اپنے ملک کا سفیر بن کے جاتا ہوں۔ ہمارے ملک کے لوگ گوروں سے زیادہ عقل مند ہیں۔ گزشتہ سال ایک ریسرچ ہوئی تھی امریکا میں امریکا کے بیشتر شہریوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے جھنڈے میں جو اسٹارز ہیں ان کا کیا مطلب ہے۔ ہمارے لوگ ان کو آئیڈیلائز کرتے ہیں۔ اچھی بات ہے لیکن اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو کبھی بھی انڈر ایسٹیمیٹ

نہیں کرنا چاہیے۔"

"نہیں تو یہ کہوں گی کہ سب قوانین ڈنڈے کے زور پر ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگ جب ملک سے باہر جاتے ہیں تو قوانین کو فالو کرتے ہیں اور اپنے ملک میں بے لگام ہوجاتے ہیں کہ کوئی پکڑ دھکڑ اور جرمانہ نہیں ہے؟"

"جی یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا اپنی شخصیت کو کس طرح بیان کریں گے؟"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ پھر بھی۔ بہت اچھا لڑکا ہے پیارا۔ لگتا برا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔"

"اپنے پروگرام میں بہت سے لوگوں کی آپ نے پیروڈی کی۔ کوئی ناراض ہوا؟"

"دلچسپ بات بتاؤں 'ہم نے بہت سے سیاست دانوں کی پیروڈی کی مگر آج تک کوئی ناراض نہیں ہوا اپنی پیروڈی انجوائے کرتے ہیں جبکہ ہمارے ٹی وی کے فنکار بُرا مان جاتے ہیں اور آپ کو یہ سن کر شاید حیرانی ہوگی کہ اکثر سیاست دان جب ہم سے ملتے ہیں تو بڑے پیار سے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے فین ہیں۔ اس وقت واقعی احساس ہوتا ہے کہ واقعی ان کا ظرف بہت بڑا ہے۔"

"کس کی پیروڈی ابھی تک نہیں کی اور کس کی ہٹ ہوگئی؟"

"کچھ چہرے ایسے ہیں جو میرے چہرے پر فٹ نہیں آتے یعنی جن کا میک اپ نہیں کرسکتا مگر ان کی آوازیں میں بہت اچھی نقل لیتا ہوں۔ ویسے دیکھا جائے تو کافی لوگوں کی پیروڈی کرچکا ہوں۔ اور کون سی ہٹ ہوئی تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بیشی کے ساتھ سب کو ہی پسند کیا گیا ہے۔"

"آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا ایک فون نمبر تو آدھے پاکستان کے پاس ہے تو لوگ تنگ تو بہت کرتے ہوں گے؟"

"جی کافی لوگوں کے فون آتے ہیں مگر اچھی بات ہے کہ میں تنگ بالکل بھی نہیں ہوتا کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ہمیں کچھ سمجھتا ہے تو ہمیں فون کرتا ہے۔ میں ان سوالوں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ تنگ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"بالکل۔ لڑکیوں کے بھی آتے ہوں گے؟ کیا لگتا ہے؟ اور شادی اپنی پسند سے کریں گے؟"

قہقہہ۔ "جی بالکل لڑکیوں کے بھی فون آتے ہیں اور بس ٹھیک ہی لگتا ہے۔ شادی تو ظاہر ہے ارینج ہوگی والدین کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔"

"مستقبل کا کیا پلان ہے؟"

"بہت کچھ سوچا ہوا ہے۔ کچھ چیزیں ہیں دماغ میں جو کرنی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل شاہ جی کے ساتھ پروڈکشن ہاؤس بنایا۔ ہم دونوں شاء اللہ اس کے تحت کام کریں گے اور "شاہ جی پروڈکشن ہاؤس" کہلائے گا۔"

"کون سے چینلز شوق سے دیکھتے ہیں؟"

"مجھے نیوز چینلز بہت پسند ہیں اور انٹرٹینمنٹ چینلز بھی شوق سے دیکھتا ہوں مگر پسندیدہ ترین چینل نیشنل جیوگرافک ہے ڈسکوری ٹائپ کے چینلز بہت پسند ہیں۔"

"آج کل لوگوں کا بہترین مشغلہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہمارے یہاں کے لوگوں کا بہترین مشغلہ فضول باتوں میں وقت ضائع کرنا ہے۔ ہم پریکٹیکل گراؤنڈ میں کچھ نہیں کرتے اور اپنے آپ کو معتبر بنانے کے چکر میں ہی رہتے ہیں۔ ملک کی ترقی باتوں سے نہیں کچھ کرکے دکھانے سے ہوتی ہے۔"

شبنم ثانی

"کیسی ہیں آپ فیس بک پہ تو خوب ملاقات رہتی ہے سوچا آج کچھ آپ کے ڈرامے کے حوالے سے بھی بات کرلیں۔ کیا خیال ہے؟"

"جی جی بالکل۔"

"یہ آپ کا پہلا سیریل ہے۔ کیا رسپانس مل رہا ہے اور سمیع ثانی صاحب تو جوانی سے اس فیلڈ میں ہیں۔ آپ کیسے آگئیں؟"

"جی یہ میرا پہلا سیریل ہے اور رسپانس حیرت انگیز طور پر بہت اچھا آرہا ہے۔ بہت حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ سب سے زیادہ تو میاں صاحب نے کی ہے اور مجھے تو ابھی بھی شاید اس فیلڈ میں آنے کا خیال نہ آتا اور نہ ہی میرا ایسا کچھ ارادہ تھا' لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ روبینہ اشرف۔ جو اس سیریل کی ڈائریکٹر ہیں۔ ان سے میری تیس سال پرانی دوستی ہے' بالکل بہنوں جیسی۔ تو اس سیریل میں کام کرنے کا انہوں نے ہی کہا بلکہ تنگ کیا اور ان کا کہنا کیسے ٹال سکتی تھی۔ انہیں پورا بھروسا تھا کہ میں یہ رول کرلوں گی۔"

"اور آپ نے ان کے بھروسے کو پورا کیا؟"

"بہت شکر گزار ہوں اپنے رب کی کہ اس نے عزت رکھ لی ہے اور میں کسی حد تک ان کے معیار پر پوری اتری ہوں' ورنہ روبینہ اشرف جیسی اچھی ڈائریکٹر کسی بات پر خاص طور پر اداکاری کے معاملے میں کمپرومائز کرنے والی خاتون نہیں ہیں اور مجھ پر بھاری ذمہ داری تھی کہ اپنے نام سے جڑے دو ناموں کو میں شرمندہ نہیں ہونے دوں۔ ان میں ایک نام روبینہ اشرف کا اور دوسرا میرے اپنے میاں صاحب کا تھا دونوں ہی نامور ہیں۔"

"کام اچھا لگ رہا ہے اور کہیں مشکل پیش آئی؟"

"بہت اچھا لگ رہا ہے لوگ بہت تعریف کر رہے ہیں اور مشکل بھلا کیسے پیش آسکتی تھی۔ سیٹ پر میرا بہت خیال رکھا جاتا تھا کیوں کہ روبینہ جانتی تھیں کہ میں ان مشکلات کو سہنے کی عادی نہیں ہوں جو ایک ریگولر فنکار کو فیس کرنا پڑتی ہیں اس لیے سب کچھ بہت آرام سے ہو گیا۔"

"بہت بری چچی دکھائی گئی ہیں۔ آپ اصل زندگی میں چچی نہیں ہیں لیکن اگر ہوتیں تو؟"

"اور اصل میں چچی ہوتی تو ہرگز ایسی نہ ہوتی۔ اصل میں مجھے شروع میں یہ رول کرتے وقت بہت الجھن ہوتی کہ یہ میری نیچر سے الٹ تھا پھر سمیع نے سمجھایا کہ ایکٹنگ اسی کو کہتے ہیں اور آپ کی کامیابی اسی میں ہے کہ لوگ آپ کو اس رول میں قبول کرلیں بس پھر میں نے اور کچھ نہیں سوچا اور اس رول کو اپنے اوپر طاری کرلیا۔ اس لیے سب کو پسند آرہا ہے۔"

"مزید آفرز آئیں؟"

"آفرز تو پہلی قسط آن ایئر ہونے سے پہلے ہی آنا شروع ہوگئی تھیں کیوں کہ کئی لوگوں نے مجھے سیٹ پر کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک سوپ میں کام کرنے کی ہامی بھی بھرلی تھی اور ایک دن ریکارڈنگ بھی شروع کروادی تھی' مگر بہت لمبا کام تھا اس لیے پھر چھوڑ دیا۔"

"تو بس یہ پہلا آخری اور پہلا سیریل ہوگا؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے' لیکن چونکہ زیادہ ٹائم نہیں دے پاؤں گی تو اس لیے سیریل کروں گی سوپ نہیں۔"

"کیسے رول کریں گی؟"

"بہت سوچ سمجھ کر رول کروں گی۔ ایسے رول نہیں کروں گی کہ گھر والے دیکھ کر شرمندہ ہوجائیں؟"

"بچے ہیں اس فیلڈ میں؟"

"بچوں میں دوسرے نمبر والا بیٹا ایک سوپ میں آرہا ہے' جو سمیع نے ہی ڈائریکٹ کیا ہے۔ باقی اپنی پڑھائیوں میں مصروف ہیں۔ ویسے اس کام میں ٹائم بہت لگتا ہے اس لیے اگر بچے آئے بھی تو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی آئیں گے۔"

"آپ اچھی خاصی اسمارٹ ہوا کرتی تھیں مگر اب...؟"

قہقہہ... "بھئی اس کے لیے تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ "کبھی ہم بھی خوب صورت تھے" مگر کیا موٹے لوگ انسان نہیں ہوتے؟ ویسے موٹے ہونے سے کچھ نہیں ہوتا بس عقل موٹی نہیں ہونی چاہیے۔"

قہقہہ... "اصل میں لوگ موٹے لوگوں کا اتنا مذاق بناتے ہیں کہ بیچارہ موٹا بندہ ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہے اور وہ اس کو اپنا جرم سمجھنا شروع ہوجاتے ہیں۔"

"آج کل کے ڈراموں کے بارے میں کچھ کہنا پسند کریں گی؟"

"ضرور۔ ہمارے ڈرامے ریٹنگ کے چکر میں اپنی روایات کو بھول چکے ہیں' ہر توی خود کو رائٹر اور ڈائریکٹر سمجھ بیٹھا ہے۔ پروڈیوسر اور چینل کی خواہش پوری کرنے کے لیے اندھی دوڑ کا حصہ بن گیا ہے۔ ڈائریکٹر اور رائٹر پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کو سمجھیں اور اپنے ڈراموں کو ریٹنگ کے چکر میں برباد نہ کریں۔"

گلزار حسین (شیف)

"کیا حال ہیں جی اور کیسی چل رہی ہے آپ کی کوکنگ "آپ کی جاب؟"

"الحمد اللہ بالکل ٹھیک۔ اور جاب "کوکنگ" دونوں پرفیکٹ چل رہی ہیں۔"

"میری نظر میں تو ہر پروفیشن اہم ہے' مگر میں نے دیکھا ہے کہ دو تین پروفیشن ایسے ہیں جس پر لوگ بات بناتے ہیں ایک نرسنگ ایک درزی اور ایک شیف کا۔ ایسا ہے نا؟"

"جی بالکل ایسا ہے۔ ہمارے ملک میں شیف کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب لوگ ہر پروفیشن کو اہمیت دینے لگے خواہ نرسنگ ہو یا ٹیلرنگ اب تو ہم جہاں جاتے ہیں ہماری بہت عزت ہوتی ہے۔ لوگ با عزت سمجھتے ہیں۔"

"بعض شوق بچپن سے ہی پروان چڑھتے ہیں تو کیا آپ کا شوق بھی؟"

"کچھ ایسا ہی تھا ۔۔۔ یہ شعبہ مجھے اپنی طرف کھینچتا ضرور تھا۔ چنانچہ گریجویشن کے بعد میں شیف کی ٹریننگ لینے کے لیے جاپان چلا گیا۔ مختلف کورسز کیے' ٹریننگ لی اور پھر تھائی لینڈ جا کر بھی ٹریننگ لی تاکہ کانٹی نینٹل کھانے پکانے بھی آجائیں۔"

"پھر پاکستان آئے یا وہیں کے لوگوں کو فیض یاب کیا؟"

"وہیں جاپان میں ہی جاب کرلی اور پھر وہیں ہی ایک لڑکی کو مسلمان کرکے شادی بھی کرلی۔"

"اتنا عرصہ ملک سے باہر رہے۔ پھر پاکستان آنے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟"

"1991ء سے 2005ء تک وہاں رہا۔ 2005ء میں پاکستان آیا اور خیال کیسے آیا تو بس اپنے ملک سے جب محبت جاگ اٹھے "آجانا چاہیے اور میں پاکستان آکر بہت خوش ہوں۔"

"پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟"

"پیسہ۔۔۔؟ اچھی پیسہ ہی پیسہ ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ ہماری تنخواہ کئی پروفیشنل لوگوں سے زیادہ ہے۔ بس اللہ کا ہم پر بڑا کرم ہے۔"

"مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ کھانے پکانے کا شعبہ خواتین کا کہلاتا ہے' مگر میدان مرد حضرات نے مار لیے ہیں۔۔۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ مرد حضرات اس کام کو باقاعدہ سیکھتے ہیں پروفیشن کے طور پر' اس لیے وہ کامیاب ہیں اور اب سب وہ بڑے بڑے ہوٹلز اور ریسٹورنٹ میں کام کرتے ہیں۔"

"آپ نے کہا کہ اس فیلڈ میں بہت پیسہ ہے۔ تو کیا نوجوان اس طرف آرہے ہیں یا شرم کا مسئلہ ہے؟"

"نہیں نہیں۔۔۔ کوئی شرم کا مسئلہ نہیں ہے۔ اب واقعی تعداد میں لوگ بلکہ نوجوان آرہے ہیں اور بہت محنت کے ساتھ کام کرتے ہیں کیوں کہ اب تو یہ باقاعدہ پروفیشن بن گیا ہے۔"

"آپ دنیا کو کوکنگ سکھاتے ہیں کیا بیگم کو بھی آپ نے ہی سکھائی ہے کوکنگ؟"

"نہیں' انہوں نے بھی وہیں سے ٹریننگ لی جہاں سے میں نے لی ہے۔ جاپان کے جس ٹریننگ سینٹر سے میں نے کورسز کیے' وہیں میری مسز بھی کورس کررہی تھیں۔ مجھے پسند آگئیں اور میں نے ان کو مسلمان کرکے شادی کرلی اور اسلامی نام روبینہ رکھا۔ 1994ء میں ہماری شادی ہوئی۔ ہماری ایک بیٹی ہے۔"

"گھر کی ساری ذمہ داری بیگم کے سر ہے۔ کوکنگ بھی بیگم ہی کرتی ہیں اور بہت شاندار کھانا پکاتی ہیں۔"

"ہوں۔۔۔ گڈ۔"





خط لکھنے کا پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو اور ہمارے پیارے وطن کو سلامت رکھے۔ آمین

پچھلے ماہ نایاب نے اپنے بھائی کی رہائی کے بارے میں لکھا تھا۔ اس ماہ موصول ہونے والے تمام خطوط میں قارئین نایاب کے بھائی کی رہائی پر خوشی کا اظہار کیا اور ان کے والدین کو بیٹے کے ملنے پر مبارک باد دی ہے۔

آپ کی محبت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ ہم ان سطور کے ذریعے نایاب جیلانی تک آپ کی مبارک باد پہنچا رہے ہیں۔ نایاب جیلانی آپ کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔
پہلا خط جڑانوالہ سے کوثر خالد کا ہے، لکھتی ہیں۔

ایک مسئلہ تو گھر میں ہوا مگر وہ صرف میرا تعلق تو آپ سے ہے۔ چونکہ پچھلے دو ماہ سے آپ نے تعلق توڑ رکھا ہے۔ تمام رسالہ اس بار بہت اچھا ہے۔ جو کہ میرے ساتھ نئے

کو بھی پسند آیا۔ مگر مجھے دل سے کیا تعریف کریں "پیارے نبی" میں اس بار نفلی موضوع تھے۔ الحمد للہ ہم نے بھی استخارہ تو کیا کسی سے باقاعدہ دعا بھی نہیں کروائی۔ صرف اس لیے کہ ہم اپنا ہر کام خود ہی کرنا چاہتے ہیں۔

"خدا آپ کے" پڑھ کر بہت اداس ہو گئے کہ ہم شامل محفل نہ تھے "اک تھی مثال" کبھی تو آپ بھی اپنے حصے کی خوشیاں ضرور ملیں گی "مصحف سے مصحف تک" نام ہی سے کہانی کی سمجھ آ گئی۔ مگر نبیلہ عزیز کا قلم تو رہیں "نظر میں جھلکتی" ان کی شخصیت سے ہم بہت مرعوب ہیں۔ ناک لگا لگا کر تھک گئے۔ "بت شکن" اختتام پذیر ہوئی۔ اچھی اینڈنگ۔ امایہ جذبات کی ملکہ ہیں۔ لیکن امایہ ناز کوشش پر ہاتھ چومنے کو دل چاہا۔ "کمہاری کا گھر" موضوع خوبصورت انداز تحریر متاثر کن۔ "تماشائے اہل کرم" "میرا سید ہوں یا سائنا رضا، فلیڈیا" کرچی ہیں ان پر۔ تعریف کے لیے الفاظ میسر نہیں۔

"میرا گزرتا" انتہا ہو گئی خود غرضی کی۔۔۔ بلکے کو وہاں بھی کیا موقع دیا۔ "من پسند" شکر ہے جلد ہی عقل آ گئی پہنچ صاحب کو۔ "مقلق پسند" ارے آپ نے تو مجھے میرا ماضی یاد دلا دیا۔ یعنی آخر سال سے وہاں تک ہماری مقلق پسندی کی طرح مشہور تھی۔ خالہ جیسی تو واقعی توبہ۔ مگر الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا معاملہ تھا۔ ہم ڈانٹنے میں پہل کسی معاملے میں بھی نہیں کر سکتے۔ مگر ہماری طرح اتنی لمبی ہوتی ہے کہ خدا پناہ، کسی کو بھی ہم غلطیاں شروع کرنے کا حق بھی نہیں دیتے۔ خط لکھنے سے پہلے ہو مراسلہ کچھ ایسا ہی تھا۔

"پرندے" اک سادہ سی پُر سبق تحریر تھی۔ خدا گواہ ہم تو اسی آزادی سے رہتے ہیں۔ "شعاع" کا ساتھ بڑا مزے کا تھا اور شعر تو ہمارا عزیز از جان۔

"ملنے کی گھڑی" نایاب جیلانی آپ نے تو دھڑکنیں ہی روک دیں۔ معلوم نہ تھا آپ کے ساتھ ایسا سانحہ ہوا ورنہ ہم بھی شریک دعا رہتے۔

"تاریخ کے جھروکے" اور "کھٹا میٹھا"۔۔۔ تو یہی بھلی۔۔۔

اب اجازت۔ تو بہت وہ کے ساتھ ہم رات کا کھانا گھر والوں کو کھلا لیں۔ ورنہ ہمیں بہت بددعائیں ملیں گی بھوکے پیٹوں کی۔ آج ہم نے بیسن بھرے کریلے پکائے ہیں۔ کیا آپ کھانا پسند فرمائیں گی؟

پیاری کوثر! آپ کھلائیں گی تو ضرور کھائیں گے۔

قیمہ بھرے کریلے، چنے کی دال بھرے کریلے تو ہم نے بھی کھائے ہیں لیکن بیسن بھرے کریلے اس ڈش کا نام پہلی بار سنا ہے۔ آئندہ ماہ میں اس ڈش کی ترکیب ضرور بھیجیے گا۔

آپ کے پچھلے خطوط لیٹ موصول ہونے کے باعث شامل نہ ہو سکے۔ کراچی میں کسی بھی وقت ہڑتال ہو سکتی ہے جس کی بنا پر ڈاک کا سلسلہ بھی گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ آپ سے کیا ہم اپنے کسی بھی قاری سے تعلق نہیں توڑ سکتے، آپ کو ٹینشن ہوئی، اس کے لیے معذرت۔ دوسرے مسئلے کے بارے میں تو آپ نے بتایا ہی نہیں ویسے آپ جتنی سمجھدار ہیں ہمیں یقین ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی مسئلہ ہو بھی تو زیادہ دیر نہیں رہے گا۔ آپ حل کر لیں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ایلیہ بتول اور الوین فاطمہ نے ملتان کے گاؤں W.B/22 سے لکھا ہے

ناول کی بات کی جائے تو مجھے اس کی ڈریسنگ تو بہت زبردست لگی اور کہانیاں ان کی تو آپ بات ہی نہ کریں اتنی اچھی ہر لفظ منفرد اور دلچسپ۔ کنیز نبوی کو دیکھ کر تو خوشی سے ناچنے کو جی چاہتا تھا لیکن سمواحمد کو نہ دیکھ کر تھوڑی مایوسی ہوئی۔ "ایک تھی مثال" میرا فیورٹ ناول ہے رخسانہ نگار عدنان بڑی خوب صورتی سے ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ "کماری کا قصر" بھی اچھا ناولٹ تھا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ مجھے [illegible] بہت اچھا سلسلہ لگتا ہے۔ کنیز نبوی کا انٹرویو تصویر کے ساتھ شائع کریں۔

ایلیا اور الوین! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کنیز نبوی کا انٹرویو تو ضرور دیں گے لیکن تصویر کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ کنیز نبوی سید ہیں اور شرعی پردہ کرتی ہیں۔ اس لیے وہ تصویر شائع نہیں کرائیں گی۔

ثمینہ اکرم نے بہار کالونی کراچی سے لکھا ہے

ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ماڈل کا جدید اسٹائل کا کیا زبردست سوٹ پہنا ہے ماڈل نے۔ ہر چیز بالکل پرفیکٹ ہے۔ اس ماہ کا نہ صرف ٹائٹل زبردست لگا بلکہ [illegible] افسانے اور مکمل ناول ایک سے بڑھ کر ایک۔

بہترین افسانہ سمیرا حمید کا "عالم لاہوت" رہا۔ جو عشق حقیقی اور عشق مجازی کی عملی تفسیر نظر آیا۔

دوسرا افسانہ "پرندے" قرۃ العین کا اچھا لگا۔ یہ افسانہ بھی بہت دلچسپ اور پُرمقصد لگا۔

شہزادی عباس خلجی کے ناول میں گو کہ اس کی کہانی اتنی نئی نہ تھی۔ پھر بھی جدا انداز بیان نے اسے انفرادیت بخشی۔ "ایک تھی مثال" میں اب دکھ کے سوا کچھ نہیں —

ناولٹ "کماری کا قصر" اس مرتبہ بازی لے گیا۔ اس میں ہمدان کا کردار مجھے بہت زبردست لگا۔

"شعاع کے ساتھ" میں ثوبیہ نور کا دلچسپ احوال پڑھا۔ "یادوں کے جھروکوں میں" "انوکھا شہر" کا عجیب و غریب احوال پڑھ کر [illegible] ہونق رہ گئی۔ اصل میں آخر میں کتاب کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ ناولٹ "بت شکن" پہلی قسط سے آخری قسط تک میری توجہ حاصل کیے رہا۔ دیلاذن۔ لامیہ شاہ زین جیسی خود پرست عورت اپنے انجام کو پہنچی۔

نایاب جیلانی آپ کو اپنے بھائی سے ملن کی گھڑی بہت بہت مبارک ہو۔ سواد شاہ کی رہائی کے لیے دعا کرنے والوں میں میرے ہاتھ بھی شامل تھے۔

"بندھن" میں شادی کا احوال پڑھ کر یاد آیا کہ میں تو خرابی طبیعت کی وجہ سے فائزہ عباس کی شادی کا احوال لکھ ہی نہیں پائی۔ اب کیا میں لیٹ ہونے کے باوجود یہ احوال بھیج سکتی ہوں۔

پیاری ثمینہ! حسب معمول شعاع پر آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ فائزہ کی شادی کا احوال ضرور بھجوائیں۔

حرا قریشی ملتان سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

صبح سجیے حمد پر نعت اور نعت پر حمد کا عنوان لکھا دیکھا۔ ہمارے نبی کی پیاری باتیں پڑھتے ہیں تو یوں لگتا ہے کچھ دیر کے لیے اسی جگہ، اسی دور میں پہنچ گئے ہوں۔ زاد راہ میں کیا خوب صورت دعائیں تھیں بے اختیار سبحان اللہ کہا۔ استخارہ کے بارے تفصیل پڑھ کر دماغ کی کھڑکیاں مثل مشعل تابناک ہو گئیں۔ "کہی نہ جائے" پڑھ کر دبی دبی خواہش پھر سے انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گئیں۔ تو جناب عزیز شعاع ہمیں بھی تبصرہ کرنے کا موقع فراہم کیجیے۔

ایک ماہ پھر مصنف کی [illegible] تبصرہ تھا۔ آمنہ زریں کا "بندھن" میں فائق اور ثانیہ کی گفتگو سے بھی

الفت کشید کی۔ خطوط میں تفصیلی تبصرے ذوق و شوق سے پڑھے۔ سب سے پہلے سمیرا حمید کا افسانہ پڑھا جو کہ نمبر پر بھی اول نمبر پر "عالم لاہوت" پڑھ کر کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے۔ "خود غرض" نگہت یاسمین "حقیقت بیان کرتی چھوٹی سی تحریر تھی۔ "کمہاری کا گھر" میں پڑھا۔ اس قدر پرانی کی توقع نہ تھی۔ "من پسند" "اگر ہم سب ذوالجلال کی پسند پر قانع ہو جائیں تو ہماری پسند ہمارے ناک قربان ہو جائے۔" "مصالحہ پسند" بھی دل پسند سٹوری تھی۔ "شعاع کے ساتھ" میں تسلسل کے ساتھ مرشح بھی بانکا پانا نمایاں تھا۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ "ولی امید کا ستارہ ہے" ایک ایسی تحریر ہے پڑھ کر ذہن کے در پیچے پر کئی سوال براجمان ہو گئے۔ "تو نے کچھ سے زندگی کی نوید دے کر دریڈ کو تنہا کیوں کر دیا؟" لیدر اگر زنش کو چاہتا تھا تو شادی ضروری تو نہیں تھی" مائیں تو گھر سنوارتی ہیں پھر ثاقب کی ماں نے اسے ایسے مشورے کیوں دیے؟" بہت خوب صورت بات "پرندے" میں کی گئی۔ "تیرے سنگ حسین ہے رہ گزر" پڑھ کر من و سلویٰ یاد آ گئی۔ ویل ڈن شہزادی صاحب۔ "صنم سے صمد تک" "کنیز نبوی" کا اسم خاص دیکھ کر دل مسرت سے اچھلنے لگا۔ ہم تجسس میں ہیں کہ عمیرا کی آگے کیا پلاننگ ہوگی اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

پیاری حرا! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے مگر صفحات کی مجبوری ہوتی ہے اس لیے پورا خط شائع نہیں کر سکتے کیونکہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہنوں کے خطوط شائع کیے جائیں۔ چھوٹے شہروں میں اور دیہات میں خط پوسٹ کرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے اور جب ان کے خط شائع نہیں ہوتے تو جتنی تکلیف انہیں ہوتی ہے اس سے بڑھ کر ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ حرا آپ افسانوں پر توجہ دیں۔ کوئی اچھی کہانی اپنے اردگرد تلاش کریں اور اسے الفاظ کا جامہ پہنائیں کیونکہ آپ لفظ پر قادر ہیں۔

نگہت نورین عطاء اللہ نے محلہ دین پورہ سیالکوٹ سے لکھا ہے

جون کا شمارہ ہاتھ میں آیا۔ یہ کیا اتنا برا ٹائٹل۔ (معذرت کے ساتھ) نبیلہ عزیز نے قسط کیوں نہیں لکھی۔ "بہت شکن سکا" واہ بھئی واہ مزہ آ گیا۔ نایاب جی اب خاموشی اختیار نہیں کرنی۔ کنیز نبوی "صنم سے صمد تک" کا مطلب بتا دیں۔ باقی اقتباس پر۔ عمیرا جی ویل ڈن آپ ایسے کردار کہاں سے لے آتی ہیں آپ۔۔۔۔

"عام زندگی۔۔۔ عام خوشیاں۔۔۔ عام دکھ۔۔۔ درد دل زندگی کا مزہ عام ہونے میں ہے۔" تنزیلہ ریاض کے کس ناول کی لائن ہے ضرور بتائیں۔ اقتباس سخت ہیں۔ مگر پھر بھی پڑھنے دیتے ہیں۔ امام مسجد ہیں میرے ابا! مجھے فخر ہے۔

کنیز نبوی، سائرہ رضا، عنیزہ سید اور تنزیلہ ریاض کا تعلق کہاں سے ہے اور یہ بھی بتائیں کہ سیالکوٹ سے کوئی مصنفہ تعلق رکھتی ہیں کہ نہیں!

نگہت بہنا! معذرت خواہ ہیں آپ کو ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ صرف ایک سطر پڑھ کر ناول کے بارے میں بتانا بہت مشکل ہے۔ اگر آپ کوئی لائن ناول کا نام لکھ کر لکھتیں تو ضرور شائع کر دیتے۔ مصنفوں کی لسٹ تو پرچے میں کئی بار شائع ہو چکی ہے شاید آپ نے نوٹ نہیں کیا۔ صنم بت کو کہتے ہیں اور صمد اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔ اس قسط میں وضاحت ہے۔ عنیزہ سید کا تعلق ڈسکہ سیالکوٹ سے ہے۔ کنیز نبوی سندھ سے، سائرہ رضا کراچی سے اور تنزیلہ کا تعلق اوکاڑہ سے تھا۔ اب شادی کے بعد بحرین میں ہوتی ہیں۔

صائمہ مشتاق احمد حافظ آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سیکنڈ ایئر میں تھی جب آخری بار آپ کو لکھا تھا۔ اب ماسٹرز کیے بھی چھ ماہ ہو گئے ہیں۔

سرورق میں ماڈل کے کپڑے تو خوبصورت تھے مگر ماڈل کا انداز بہت نامناسب لگا۔ شمارہ بہت اچھا تھا۔ سائرہ رضا اور سمیرا حمید نئی لکھنے والوں میں سے میری موسٹ فیورٹ رائٹرز ہیں۔ ان کی وجہ سے پرانی رائٹرز کی یاد بھی اب کم آتی ہے۔ "بت شکن" کی تو کیا ہی بات ہے۔ نایاب خان سے بھرپور انصاف کی امید ہے۔ نایاب یونہی بغیر وقفے کے اچھے اچھے کرداروں اور کہانیوں سے ہمیں محظوظ کرتی رہیں گی۔ سدرۃ المنتہیٰ اور جویریہ احمد کے ناولٹ بھی بے حد اچھے تھے۔ "مصالحہ پسند" کے شروع کے دو صفحات پڑھ کے تو مجھے بے ساختہ شازی بلی کی یاد آ رہی۔

افسانوں میں سمیرا حمید کا "عالم لاہوت" نمبر لے گیا۔ شہزادی عباس کی کہانی کا مرکزی خیال پرانا مگر انداز نیا تھا۔

ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ لڑکا بچپن کی محبت کو لمحوں میں بھول کر نئے راستوں کو کھوجنے نکل پڑتا ہے اور لڑکی اس کی مالا جپتی رہتی ہے۔ لڑکی ایسے ہرجائی کو قبول ہی کیوں کرتی ہے؟

پیاری صائمہ! ایک طویل عرصہ کی خاموشی کے بعد آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی پر آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اتنی طویل خاموشی کیوں؟

اس میں شک نہیں کہ نئی مصنفین بہت اچھا لکھ رہی ہیں لیکن پرانی مصنفین کی اپنی جگہ ہے اور قارئین کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ ہیروئن ہرجائی ہیرو کو کیوں قبول کر لیتی ہے تو غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ صبح کا بھولا شام کو آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ پھر کچھ معاملے دل کے بھی ہوتے ہیں۔ جو دل کو عزیز ہوتے ہیں ———— دل ان کی غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔

گکھڑ منڈی شریف سرائے عالمگیر سے شازیہ قیصر تشریف لائی ہیں

شادی سے پہلے بھائی ہی رسالہ لا کر دیتے تھے اور اب قیصر کے بغیر ہی لاتے ہیں۔

"رقص بسمل" نے پاکر بڑی اداسی چھوڑی۔ "ایک تھی مثال" "میں خاتون بن آیا" "مسکان" بذات خود اچھا ناول تھا۔ "بت شکن" "ایک زبردست" اپنے انجام کو پہنچے۔ امایہ خان کو مبارک باد "کناری کا گھر" بھی اچھا تھا معذرت کے ساتھ "عالم الاہوت" "میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"تاریخ کے جھروکے" اپنا پسندیدہ سلسلہ پڑھا تو اس بادشاہ کی قبر پر جوتے مارنے کی خواہش کو بڑی مشکل سے دبایا۔ شازیہ سعید میری فیورٹ ایکٹرس ان کو پڑھ کر بڑا اچھا لگا۔ شعاع کے سارے ہی سلسلے اچھے ہیں۔ آپ سے ایک ریکویسٹ ہے کہ رسالے میں ایک مزاحیہ تحریر ضرور شامل کیا کریں۔

شازیہ اچھا ہوا آپ نے وضاحت کر دی ورنہ ہم نے بھی آپ کے شوہر کا نام قیصری لکھنا تھا۔ قیصر نام پہلی بار سنا ہے۔ ہماری اکثر قارئین یہ شکایت کرتی ہیں کہ ان کے والدین یا شوہر انہیں رسالے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں

ہے بلکہ آپ کے شوہر خود لا کر دیتے ہیں۔

مزاحیہ تحریریں ہمیں بھی پسند ہیں اور ہماری بھی خواہش ہوتی ہے کہ ہر ماہ کم از کم ایک مزاحیہ ہلکی پھلکی تحریر ضرور شامل ہو۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

رداشہزادی محسن وقاص بتمر قاسم ڈیونہ منڈی گجرات سے لکھتی ہیں

اس ماہ کا ٹائٹل ذرا بھی اچھا نہیں تھا۔ رقص بسمل ناول بہت اچھا جارہا ہے۔ اس میں مادر اکی ماں اور رضا سیدہ کا کیا رشتہ ہے "ایک تھی مثال" بھی بہت اچھا ہے۔ ہمارا دل کرتا ہے کہ بشریٰ اور عدیل جیسے ماں باپ کو کوئی مار دے۔ لائبہ خان کا ناول "بت شکن" بھی زبردست تھا ہم تینوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس کی ٹیچرز ہیں۔ اسکول کا نام الفلاح اکیڈمی ہائر سیکنڈری اسکول ڈیونہ منڈی گجرات ہے۔

پیاری ردا! محسن "فخر شعاع" کی بزم میں خوش آمدید آپ تینوں علم کی روشنی پھیلا رہی ہیں' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر نیک نیتی اور فرض شناسی کے جذبے سے سب استاد اپنے فرائض انجام دیں تو قوم کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ کسی طالب علم کی خفیہ صلاحیتوں کو پہچان کر انہیں آگے بڑھانے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا' طالب علموں کی اخلاقی تربیت اور صحیح سمت کی طرف رہنمائی ایک استاد کے فرائض میں شامل ہے۔ معذرت کہ یہ فرائض نبھانے سے ایک استاد کا فرض ادا نہیں ہوتا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ نبیلہ عزیز ناسازی طبع کے باعث قسط نہ لکھ سکیں۔

کائنات اصغر یوزوار نے وہیری سے لکھا ہے

ہلکے پھلکے ٹائٹل نے من تک شاد کر دیا۔ لیکن ماڈل کو دوپٹا پھیلا کر لینا چاہیے تھا۔ حمد و نعت کو پڑھنے کے بعد تھوڑا آگے بڑھے تو "بزم حسن" میں فائق اور ان کی مسز کا دوبارہ انٹرویو دیکھ کر غصہ آیا کیونکہ پہلے انٹرویو کو ابھی اتنا عرصہ تو نہیں گزرا۔ نایاب آپی! اس خوشی کے موقع پر آپ ہمارے لیے ایک زبردست ناول لکھیں۔ سمیرا حمید آپ کے لیے بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ آپ چھوٹی سائرہ

رضا ہیں' جو ہر موضوع پر لکھتی جاتی ہیں۔ "لمباری کا گھر" ول ان وینیہ احمد آپ نے زبردست اسٹوری لکھی۔ دستک میں ثانیہ سعید سے مل کر اچھا لگا کیونکہ "ٹی ازبی بی اینڈ گرلیں فل لیڈی" "اسید کا ستارہ" سعدیہ قاسمی نے زبردست لکھا۔ مکمل ناول دونوں نہیں پڑھے کیونکہ کنیز نبوی کو تو فرصت میں پڑھوں گی اور اگلے ماہ اکٹھے دونوں اقساط پر تبصرہ کروں گی۔

دوسری کراہیہ اور قریشہ تو ابھی فقط میٹرک اور آٹھویں جماعت کی اسٹوڈنٹ ہیں پھر بھلا عاصمہ اور واثق کو ان کی شادی کی فکر کیوں ہے۔ "شاعری کہے بولتی ہے" سلسلہ ختم ہو گیا کیا؟ اور ہاں آپ سے پوچھنا ہے کہ دستک وغیرہ میں آپ صرف چینلز کے ایکٹرز سے انٹرویو لیتی ہیں "تاریخ کے جھروکے" میں محمود غزنوی اور بہادر شاہ ظفر کو بھی سامنے لائیں۔ "شادی مبارک" بشریٰ گوندل کے احوال نے تو عادت لگادی کیونکہ اس گرمی میں تو مجھے بیوٹی پارلر کا میک اپ کھانے اور زیادہ رش کا سوچ کر ہی الجھن ہونے لگی۔ جون اور جولائی میں شادیوں کا احوال شائع نہ کیا کریں۔

پیاری کائنات! آپ تو شادی کا احوال پڑھ کر ہی گھبرا گئیں۔ ذرا سوچیں جن کی شادی ہوتی ہے اور جو شادیوں میں شرکت کرتے ہیں' ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ پھر یہ بھی ہے کہ شادی کب اور کس کے ساتھ لکھی ہے تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اب اگر کسی جون میں ہی شادی لکھی ہو تو کیا کیا جائے۔

رخسانہ نگار کے ناول میں اریبہ اور قریشہ چھوٹی ہیں لیکن لڑکیوں کو بڑے ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ اس لیے فکر تو ہونا ہی چاہیے۔ شاعری کہے بولتی ہے کا سلسلہ بند نہیں کیا گیا ہے۔ صفحات کی کمی آڑے آجاتی ہے۔ راحت جبیں اور فائزہ افتخار دونوں چینلز پر مصروف ہیں اس لیے آپ کی فرمائش پوری کرنے کے لیے قاصر ہیں اس ماہ کنیز نبوی کے ناول کی دوسری اور آخری قسط شائع کی جارہی ہے پڑھ کر اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

سعیدہ سحر قریشی ضلع بہاول نگر سے لکھتی ہیں

اس بار سارا شعاع لاجواب سب ناول اور تحاریر ایک سے بڑھ کر ایک۔ افسانے ابھی پڑھے نہیں لیکن ایک



خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2014ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "نیکیوں کا موسم بہار" قارئین سے خصوصی سروے،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "جمل"،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول "عہد الست"
- اسمائمہ بشیر کا مکمل ناول "خواب، خنک اور خوشبو"
- "جھوک دیپ" ایمل رضا کا ناولٹ،
- سائرہ رضا، راشدہ رفعت، فاخرہ، رابعہ فرحی نعیم، مہ شک حبیب اور آسیہ مقصود کے افسانے
- معروف رائٹر، ڈرامانگار اور شاعر ظفر معراج سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ "سلمیٰ حسن" سے باتیں،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے

اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ جولائی 2014 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

پڑھا' صفائی پسند اچھا لگا۔ اور ہاں ایک تھی مثال میں بھول گئی' پڑھتے وقت جس ٹینشن سے میں گزری۔ بس نہ ہی پوچھیں۔

صبیحہ سحر! شعاع پسند آیا بہت شکریہ۔ ناول کے بارے میں آپ کی شکایت نوٹ کرلی ہے آئندہ خیال رکھیں گے۔

کراچی سے عائشہ جمیل نے لکھا ہے

صنم سے صمد تک "تیز نبوی کا مکمل ناول بہت زبردست ہے۔ خصوصاً" ہاشم کا کردار مجھے بہت پسند آیا۔ میر انور حسین رضا! اف اس قدر خود غرض اور بے ضمیر کہ اپنی محبت کو پانے کے لیے اپنے ہی بھائی کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔ دیکھیں مظفر حسین' میاں حسین کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ شہزادی عباس خلجی کا ناول بس ٹھیک تھا۔ "بت شکن" لائبہ خان نے بے انتہا خوب صورت ناولٹ تحریر کیا۔ آخری قسط میں ہر ایک کردار کے ساتھ رائٹر نے خوب خوب انصاف کیا۔ ویل ڈن لائبہ جی۔ "امید کا ستارہ" "سدرۃ المنتہیٰ اور" کمہاری کا گھر" دونوں کے ناولٹ اچھے لگے۔ سدرہ اینڈ وجیہہ [illegible] گئیں۔ افسانے سب ہی اچھے تھے مگر "پردہ بے" قرۃ العین کی ہلکی پھلکی تحریر افسانوں پہ چھائی اور لاسٹ بٹ نائس میرا حمید صاحبہ بالاشبہ ادب کے افق پہ چمکتا ہوا وہ ستارہ جس نے بہت کم وقت میں اپنے الگ نام سے نام کمایا۔

مگر پھر بھی میرا جی! مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔ پلیز مائنڈ مت کیجیے گا آپ کی اکثر کہانیوں کے اینڈ بہت ہی عجیب سے ہوتے ہیں سمجھ میں نہ آنے والے۔ آپ کی تحریروں کا اینڈ پڑھ کر ایک تشنگی سی رہ جاتی ہے۔

پیاری عائشہ! آپ نے شعاع کی تحریروں کے ساتھ ساتھ تمام سلسلوں پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ اس کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

میرا حمید کی سب کہانیوں میں نہیں البتہ کچھ کہانیوں میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ کہانی جلد ختم کردی گئی۔ وہ بات بہرحال اپنی جگہ۔ ملیں کہانی تھی۔ اور اس کا اختتام بھی واضح تھا۔ میرا حمید تک ہم آپ کی رائے پہنچا رہے ہیں۔

نوابشاہ سے حنا پیاره خان نے لکھا ہے

مئی کا پورا رسالہ اچھا تھا۔ میں نے کہانی بھجوائی تھی۔ اس کا بتادیں۔

پیاری حنا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی کہانی قابل اشاعت نہیں۔ آپ مزید محنت کریں۔

عائشہ خان ٹنڈو محمد خان سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ ماڈل کا سوٹ بہت پیارا لگا۔ بت شکن' جیسا آغاز تھا اختتام ویسا نہ ہوا' ناول بے مطلب نہیں ہوا معلوم نہیں کیوں۔ کمہاری کا گھر۔ منفرد سے عنوان کا ناولٹ بہت پسند آیا۔ صنم سے صمد تک۔ پڑھنا شروع کردیا تھا مگر پھر چھوڑ دیا کیوں قسط وار تو نہیں۔ مگر دیکھا تو قسط وار تھا اس لیے اسے ادھر ہی چھوڑ دیا۔ حسین راہ گزر' ذاوا زبردست شہزادی عباس' بہت پیارا ناول لکھا۔ افسانہ خود غرض زبردست تھا۔ ہاشم پہ حیرت ہوئی۔ ہم بھی پانچ بہنیں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی ہیں۔ بلکہ میں اگر اپنی بہنوں کی کسی چیز کو پسند کرتی ہوں تو وہ جھٹ مجھے دے دیتی ہیں۔ اور میں بھی ایسی ہوں۔ میرا کل کا من پسند بھی اچھا لگا۔

شعاع کے ساتھ میں ثوبیہ نور کے شاعرانہ لب ولہجے میں تعارف بہت پیارا لگا۔ ملنے کی گھڑی ہے "ایک تھی مثال" رخسانہ نگار ہمیں رلا رلا کر جان لے لی گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے ناول پڑھنا بند کردیا۔ کیونکہ میرا دل بیٹھنے لگا۔ کیوں کیا آئی ہی بچی پر اتنا ظلم۔ کیسے ماں باپ ہیں۔

صفت جیسے کردار زہر لگتے ہیں۔ "خط آپ کے" میں "مسز نسیم چوہدری کی انٹری اچھی لگی۔ اور حنا سلیم اعوان اور رضوانہ شکیل کے خط پسند آئے۔

پیاری عائشہ! جس طرح پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں اسی طرح سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بہن بھی مختلف بھی ہوتی ہیں بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ آپ بہنیں آپس میں محبت کرتی ہیں تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

رخسانہ نفیسی اور الماس ملک نے ملتان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

تمام سلسلے وار ناول اچھے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگا رنگ سلسلے بھی بہت دلچسپ ہیں۔ میں ایک رائٹر ہوں۔ بچوں کے صفحات کے لیے ہفت روزہ رسائل میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ سلائی میں نے رائٹر ایوارڈ بھی وصول کیا ہے۔

رخسانہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو شعاع کے لیے بھی لکھیں۔ اچھی تحریروں کا ہم ہمیشہ خیر مقدم کرتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صبا عنایت بھریا روڈ سے لکھتی ہیں

نبیلہ عزیز بہت اچھی رائٹر ہیں۔ (رقص بسمل) پڑھ کر بہت اچھا لگا اور یہ کہانی بہت اچھی جا رہی ہے اور باقی سب ناولٹ بہت شوق سے پڑھے۔

پیاری صبا! ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے پہلی بار ہمت کر کے خط لکھا اور وہ شائع نہ ہو سکا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کائنات جہاں نے راولپنڈی سے لکھا ہے

میں کائنات جہاں' عمر سترہ سال' سات سال سے شعاع پڑھ رہی ہوں۔ اب ایف ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں' پنچ میں انگریزی لے اور بچوں کی کہانیاں بھی لکھیں۔ میرا لکھا ایک انگلش پلے ایک ایک ... چلا اور مجھے انعام بھی دیا گیا۔ شعاع میں میں نے ... رائٹرز اور کردار پڑھے جن میں نمرہ احمد کی تحریر سے سب سے زیادہ متاثر کن لگی۔

کائنات! دس سال کی عمر سے شعاع پڑھ رہی ہیں' اتنی چھوٹی عمر میں آپ نے اردو' انگریزی ڈرامے لکھے اور انعام بھی حاصل کیا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔

لاریب' ملازیب چونیاں سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

جون کے شمارے کا ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں لاجواب تھیں اور ایک بہت پرانی الجھن بھی دور ہو گئی کہ اگر دعائے استخارہ میں اپنی حاجت کا نام عربی میں نہ لے سکیں تو؟ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ استخارہ دن یا رات میں کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔

امہات کے نیچے فوائد و مسائل کا جو کام دیا جاتا ہے وہ بھی بہت مفید ہے۔ بہت شکریہ جزاک اللہ۔ آپ نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

سمیرا حمید بہتر سے بہترین اور مشکل سے مشکل تر لکھنے کی طرف جا رہی ہیں۔ وجیہہ احمد اور شہزادی عباس کی ہلکی پھلکی تحریریں پسند آئیں۔

کنیز نبوی بہت عرصہ بعد آئیں پر چھا ئیں نہیں۔ کیونکہ ان کی کہانی اچھی تو تھی پر عشق آتش اور محرومی سیریز والا مزہ بالکل نہیں تھا۔ (ناول کا اگلا حصہ پڑھ کر یہ رائے تبدیلی بھی ہو سکتی ہے)

سدرۃ المنتہیٰ کی کہانی اعلا تھی۔

لاریب' ملازیب! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ناقص مصنف نہیں یہ کام ہم لوگوں کا ہے۔ کنیز نبوی کے ناول کا دوسرا حصہ پڑھ کر آپ کی رائے یقیناً تبدیل ہو جائے گی۔

سمیرا انجم نے ضلع چنیوٹ سے لکھا ہے

خوبصورت ٹائٹل۔ واہ دل خوش ہو گیا۔ کمہاری کا گھر (معذرت) کہانی لکھی ہی گئی جبکہ رب کی جان سدرۃ المنتہیٰ کا بدولت امید کا ستارہ رہے۔ تمہارے جھوٹے میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔

آپی آج سے تقریباً 20 سال پہلے خواتین رسالے میں پلی بیٹے کا سایہ ناول آیا تھا پلیز باجی اگر آپ کے پاس وہ ناول ہے تو اسے دوبارہ شائع کریں۔ بہت شکن چمنی شاں۔ اور کہانی شروع ہوئی' آپینہ اتنا ہی اچھا لگا۔

تیرے سنگ میں شہزادی عباس خلجی نے کیسا الجھایا ہے ہم تو مرتضیٰ کا قصہ ہی ڈھونڈتے رہ گئے۔

سمیرا! شہزادی عباس خلجی کی کہانی مکمل تھی۔ آپ اپنے بک اسٹال والے کو پرچا دے کرائے تبدیل کرالیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اریبہ آصف اور عابدہ رانو نے کبیروالا سے لکھا ہے

اس دفعہ کا شعاع بہت پسند آیا۔ ٹائٹل اس دفعہ بہت ہی پیاری تھی۔ سب سے پہلے ہم نے ناول پڑھا وہ ہے "ایک تھی مثال" مثال کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا" بہت

"شکستہ" کی آخری قسط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا کہ عمر اور رائنہ ایک ہوگئے۔ اس کے بعد شہزادی عباس خلجی کا مکمل ناول "حسین رہگزر" نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ بہت تنگ شہزادی جی۔ ملاوٹ میں رجیبہ احمد کا "کساری کا گھر" بہت زبردست تھا۔ میرے بھتیجوں اریان حیدر اور آیان حیدر کی سالگرہ 27 جون کو ہے۔ شعاع کے ذریعے انہیں وش کرنا چاہتی ہوں۔

پیاری عابدہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہم آپ کا خط شامل کر رہے ہیں اور آپ کے بھتیجوں کے لیے

قارئین متوجہ ہوں!

1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

دعائیں بھی۔ لیکن یہ سلسلہ مبارک بادی کے پیغامات کے لیے نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں اگر تمام قارئین اپنے عزیز و اقارب کو مبارک باد دینے کے لیے یہ ذریعہ اختیار کریں تو پھر اس سلسلے میں صرف مبارکباد کے پیغامات ہی شامل ہوں گے۔ تبصرے کے لیے تو جگہ ہی نہیں بچے گی۔

کراچی سے یاسمین حقی نے لکھا ہے

"بت شکن" کی آخری قسط بہت شاندار رہی۔ عمر اور رائنہ مل ہی گئے بہت بہت مبارکباد ہو آپ کو امایہ خان! "ایک تھی مثال" اب بور کر رہا ہے۔ ہر قسط میں یکسانیت ہے۔ "کنیز ہوئی" مکمل ناول میں سب واضح ہوگیا ہے۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ خضر حسین کیا فیصلہ کرتا ہے؟ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوگا۔ "حسین رہگزر" اچھا ناول تھا۔ "کساری کا گھر" سب سے زیادہ پسند آیا۔ اگرچہ کہانی اتنی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ پر موضوع بہت اچھا تھا۔ نبیلہ کی بہت اچھی تحریر تھی۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ "مثالی بہو" زبردست تھا۔

یاسمین! آپ کی ایک کہانی تو لگ چکی ہے بقیہ کے بارے میں معذرت۔ ویسے آپ میں صلاحیت ہے مزید لکھیں۔

ہلق آغر نے چیچہ وطنی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

"امید کا ستارہ" بہت خوبصورت، بہت اعلیٰ۔ سدرہ جزاک اللہ اس محبت کے لیے۔ کساری کا گھر کے لیے میں بھی فقط اتنی کہوں گی رجیبہ احمد مجھے پسند آیا۔

پیاری ہلق! آپ نے خط لکھا بہت شکریہ۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ غزل کے لیے معذرت۔

رخسانہ نگار عدنان

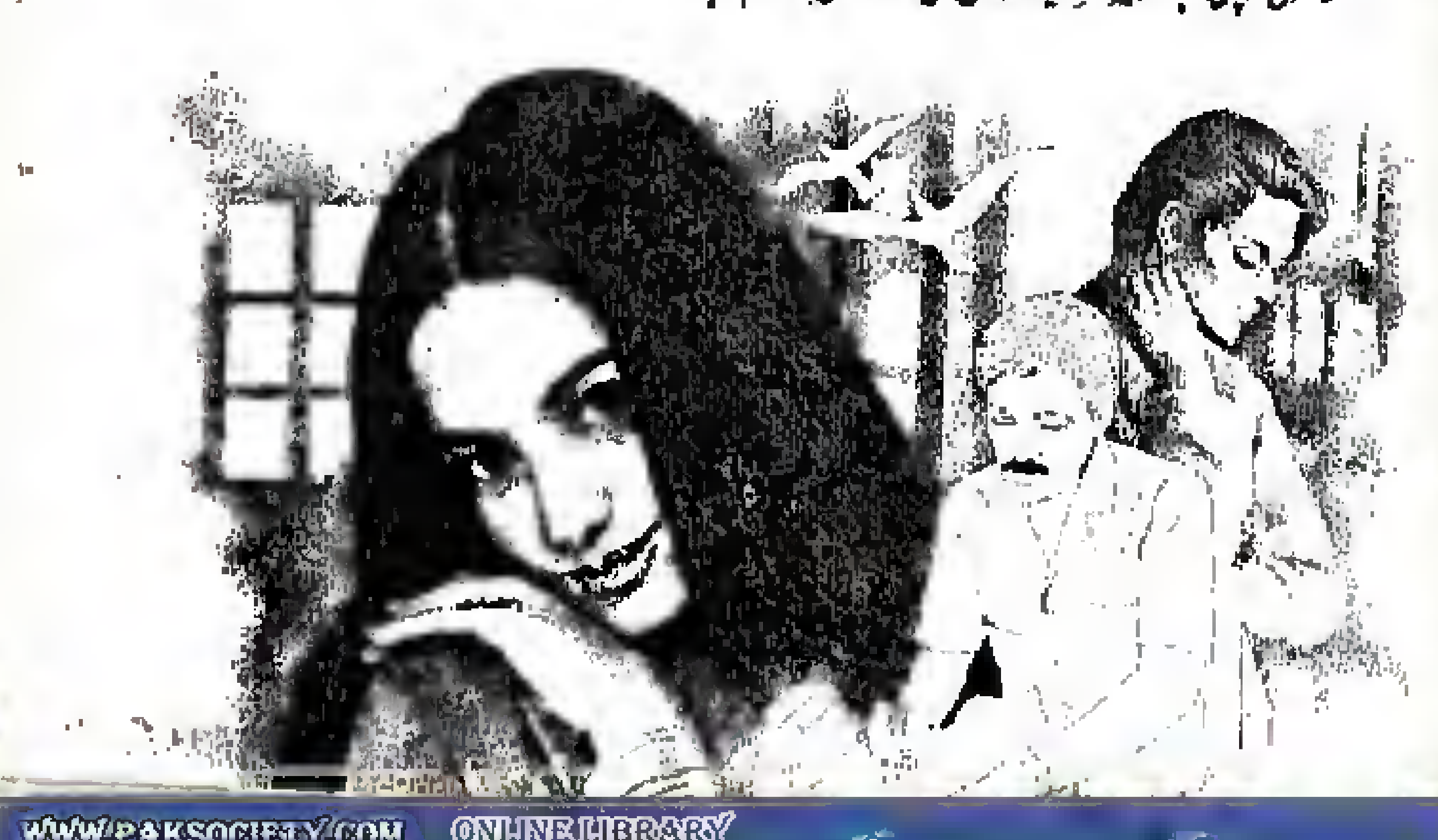
ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصطفیٰ بیٹا بہو سے نفرت کرتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا گھرانا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہیں بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کا وعدہ لے لیتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد خوشخبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والدہ کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروقی صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروقی صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ، عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروقی صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں منقولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ بانسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں بلکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سواور اس کے گھر والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ دو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے۔ بہت دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل ان کی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مشال کو چھین لیتا ہے۔ مشال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مشال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مفاہمت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مشال کو لے جائے تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچ رہی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے فوزیہ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے۔ پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی پھپھو ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بالآخر وہ احسن کمال سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے اور سادگی سے دو گھنٹے کے اندر نکاح بھی ہو جاتا ہے۔ عاصمہ اس جادوگر عورت کو نکالنے کے بعد اپنا مکان دوبارہ کرائے پر نہیں دیتی بلکہ پڑوس میں رہنے والی سعدیہ کے ساتھ کوچنگ سینٹر کھول لیتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے مشورے پر بی اے کے پرائیوٹ امتحان دینے کی تیاری شروع کر دیتی ہے۔

ستائیسویں قسط

اندھیرے میں پیچھے آنے والے کی شکل کچھ اور بھی خوف ناک لگ رہی تھی یا وہ چھوٹا سا قد والا اور ادھیڑ نشے میں سرخ آنکھیں لیے جھومتا جھامتا کوئی لڑکا تھا 'جو دیکھنے میں اتنا مرل تھا کہ ہیولے کی طرح لگتا تھا مگر اس کی سرخ آنکھوں کے ڈورے اور ان میں جھلکتی ہوس۔

مثال کو لگا۔ آج یہاں اس اندھیری اکیلی گلی میں وہ کچھ ہو جائے گا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔ صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اس نشئی نے مثال کی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

مثال کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی اور پھر وہ اس جگہ کھڑی خوفزدہ سی چیختی چلی گئی۔

اس کی ٹانگوں سے جان سی نکل گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا 'جیسے وہ اب یہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہل سکے گی۔

وہ لڑکا اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ اسے کھینچنے لگا کہ اسی وقت پیچھے موجود گھر کا سیاہ گیٹ ایک دم سے کھلا اور کوئی ان دونوں کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا۔

مثال خوف سے لڑ کھڑا کر گرنے کو تھی۔ جب ان دو مہربان ہاتھوں نے بے اختیار اسے تھام لیا تھا۔

"کون ہو تم۔۔۔ جانتے ہو یا تمہارا حشر کروں یہیں۔۔ دفع ہو جاؤ۔"

عاصمہ اس نشئی پہ پوری قوت سے چیخی تھی۔ وہ ڈر کر فوراً" ہی الٹے قدموں بھاگ گیا۔

عاصمہ مثال کو ساتھ لگائے اسے تھپکتے ہوئے کھلے گیٹ سے اندر لے گئی۔

☆ ☆ ☆

عاصمہ پلکیں جھپکائے بغیر اس معصوم 'پیاری 'بے ریا چہرے کو دیکھے جا رہی تھی 'جو خود پر قابو پاتے ہوئے گویا بہت جبر کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔

"بیٹا! اگر تمہیں رونا آ رہا ہے تو تم رو لو۔ تمہارا ذہن ہلکا ہو جائے گا مگر اتنا خود پہ جبر نہیں کرو۔۔۔ یہ لو پانی پیو۔"

وہ اس کے سامنے ٹھنڈے پانی کا گلاس رکھتے ہوئے نرمی اور پیار سے بولی۔ مثال ایک ہی سانس میں سارا گلاس چڑھا گئی اور جیسے جبر کے سارے مرحلوں سے گزر گئی۔

"نہیں میں رو نہیں رہی 'میں ڈر گئی تھی۔ وہ شخص جو میرے پیچھے آ رہا تھا وہ بہت خوفناک تھا۔ مجھے ڈر لگا تھا بہت۔"

وہ سنبھل چکی تھی اور اب قدرے اعتماد سے بول رہی تھی۔

"اس وقت اکیلی کہاں سے آ رہی تھیں۔ بلکہ کہاں جا رہی تھیں۔ شام گہری ہو چکی ہے بلکہ رات۔۔۔ تو تم اکیلی؟"

عاصمہ بات کرتے ہوئے اس کے بھاری سے بیگ کو دیکھ کر کچھ ٹھٹک کر بولی۔

"میں اپنے پاپا کے گھر آئی تھی مگر وہ لوگ گھر پہ نہیں تھے۔ اپنی دادو کے ایک رشتہ دار کے گھر جا رہی تھی کہ راستہ بھول گئی ہوں۔"

وہ رک رک کر کچھ اٹک کر بولی۔

"پاپا کے گھر۔۔۔ مطلب تمہاری ماں۔"

"ماما کے گھر سے تو آئی تھی۔ ڈرائیور مجھے باہر ہی ڈراپ کر گیا۔ اسے بھی پتا نہیں تھا کہ پاپا لوگ گھر نہیں ہیں۔" وہ ذرا وضاحت سے بولی عاصمہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔

"کچھ کھاؤ گی؟" کچھ دیر بعد عاصمہ کو خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ مجھے جانا ہے۔" وہ بے چین ہو کر بولی مگر فوری طور پر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اب کہاں

جانا چاہیے۔

"اپنی ماما کے گھر جاؤ گی؟" عاصمہ نے ذرا سوچ کر کہا۔

اس نے فوراً گھبراہٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

اب وہ اس عورت کو کیا بتاتی۔ اس کے دو گھر ہیں مگر کہیں بھی اسے بے حد محبت نہیں رکھا جاتا۔ وہ تو ایک زبردستی کی مصیبت تھی جو دونوں گھروں کو بھگتنا پڑتی تھی۔

"ماما کہاں ہیں تمہاری؟" عاصمہ پھر سے بولی۔

"وہ ملائیشیا گئی ہیں اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ۔" بہت آہستگی سے مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولی۔

عاصمہ کو معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر اس ذرا سی بچی سے مزید کریدنا بھی اسے اچھا نہیں لگا۔

"اچھا بیٹا! آپ کو جہاں جانا ہے آپ مجھے بتا دیں۔ میں آپ کو بھجوا دوں گی۔ اگر کہیں فون کر کے کسی کو بلانا ہے تو میں آپ کی بات کروا دیتی ہوں لیکن بہتر ہے پہلے آپ کچھ کھا لیں' مجھے لگ رہا ہے آپ نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا۔" وہ ماں بھی تھی اور پچھلے بیس سالوں سے بچوں کی استاد بھی۔

بچوں کو کب بھوک لگتی ہے اور کب وہ بھوک کو چھپاتے ہوئے "جی اچھا" نہیں بولتے۔ وہ جانتی تھی۔

"نہیں مجھے بھوک تو نہیں ہے۔" وہ انگلیاں مسل کر آہستگی سے بولی۔ عاصمہ تو اس لڑکی پہ جانے کیوں پیار سا آیا۔ جی چاہ رہا تھا اسے گلے سے لگا کر پیار کرے مگر وہ چلی گئی۔

"کیا کروں۔ مجھے اب کہاں جانا چاہیے؟" عاصمہ کے اٹھ کر جانے پر وہ مضطرب سی سوچنے لگی۔

عاصمہ جلدی سے اس کے لیے کباب' فرنچ فرائز اور قیمہ بھرے پراٹھے لے آئی تھی اور اشتہا انگیز خوشبو والی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"میں چائے لے کر آتی ہوں۔ تم آرام سے کھانا۔ میری بیٹیاں اپنے اسکول کے ٹرپ پر گئی ہیں۔ وہ آ جائیں گی تو تم بالکل بور نہیں ہو گی۔" عاصمہ کہہ کر جانے لگی۔

"وہ آنٹی! مجھے جانا ہے پلیز۔" جلدی سے بولی۔ عاصمہ نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے آپ یہ کھا لیں پھر آپ جہاں کہیں گی۔ میں آپ کو خود چھوڑ آؤں گی۔ اگر ہاتھ منہ دھونا ہے تو یہ ساتھ ہی واش روم ہے۔ میں آپ کے لیے چائے لے کر۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

مثال سادگی سے سجے چھوٹے سے ڈرائنگ روم کو دیکھنے لگی۔ "کتنی نائس آنٹی ہیں اور سب سے بڑھ کر انہوں نے اوروں کی طرح مجھ سے بے ہودہ سوال نہیں پوچھے۔ ماما کا گھر الگ کیوں اور پاپا کا الگ کیوں؟"

وہ تنہائی میں خود ہی بیہودہ سوال پوچھنے والوں کو منہ چڑھا کر واش روم میں ہاتھ دھونے چلی گئی۔

عاصمہ جب تک چائے لے کر آتی۔ مثال آدھی سے زیادہ پلیٹ خالی کر چکی تھی۔

"آنٹی! مجھے اپنی نانو کے گھر جانا ہے ماموں کی طرف۔" وہ کھانے کے دوران فیصلہ کر چکی تھی۔

اگرچہ حنا مامی بہت بری تھیں۔ منہ پھٹ اور سخت سنانے والی مگر اس وقت یوں آوارہ پھرنے سے تو بہتر تھا کہ وہ وہاں جا کر حنا مامی کی کڑوی کسیلی باتیں سن لیتی۔

"اچھی بات ہے۔ آپ کی نانو کا گھر کہاں ہے۔ آپ کو ایڈریس معلوم ہے ان کے گھر کا؟" عاصمہ سر ہلا کر کچھ مطمئن سے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"جی معلوم ہے مجھے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"نانو کے ساتھ اور کون ہوتا ہے ان کے گھر میں؟"

"ماموں ممانی اور ان کے بچے۔" وہ کچھ جھجک کر بتانے لگی۔

"تو آپ اپنے ماموں سے پہلے بات کرلو یا وہ تمہیں آکر لے جانا چاہیں تو زیادہ بہتر ہے۔" عاصمہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"جی' میں کرلیتی ہوں ان سے بات۔" وہ تابع داری سے بولی۔ یوں بھی اسے ڈر تھا کہ وہ نانا کے گھر کا ایڈریس بھول نہ جائے۔ وہ تو ادھر سالوں سے نہیں گئی تھی۔

"لو نمبر ملا کر بات کرو۔ اگر وہ تمہیں لینے کے لیے آتے ہیں تو میں انہیں یہاں کا ایڈریس سمجھا دیتی ہوں۔ تم مجھ سے بات کروا دینا۔" عاصمہ نے سیل فون لا کر مثال کو دیا۔

مثال فون لے کر لمحہ بھر سوچتی رہی۔ پہلے جی میں آیا پاپا کا نمبر ملا کر انہیں ذرا ستائے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ پاپا تو اپنا نمبر اسے بتائے بغیر ہی تبدیل کرچکے ہیں۔

درد کی ایک لہر اس کے سینے میں اٹھی۔ جسے دبا کر اس نے جلدی سے عمران کا نمبر ملا کر اسے مختصراً صورت حال بتائی جس کا موڈ یہ سن کر آف ہوگیا تھا کہ اب اسے مثال کو لینے کے لیے آنا پڑے گا۔

عاصمہ نے عمران کو گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔

عمران نے آدھے گھنٹے میں آنے کا کہا اور پورے گھنٹے بعد پہنچا۔

اس دوران عاصمہ اس سے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی۔ تب تک وہ اس کا سارا احوال جان چکی تھی۔

اسے اس معصوم سی لڑکی پر جی بھر کر رحم آیا۔ جس کے ماں باپ نے اسے یوں بے سہارا چھوڑ دیا تھا۔

وہ دونوں اس کے پاس تھے مگر کتنے دور تھے۔

کاش میں اسے اپنے پاس رکھ لیتی ہمیشہ کے لیے۔ ان کہی سی خواہش جو وہ جانتی تھی کسی بھی طرح پوری نہیں ہو سکتی' اس کے دل میں جاگی تھی۔

"سنو مثال بیٹی! آپ کا جب دل چاہے' آپ میری طرف آجایا کریں۔ میرا کوچنگ سینٹر بھی ہے اگر آپ کو اسٹڈیز میں کوئی پرابلم ہو' ٹیوشن کے خیال سے نہیں' ویسے ہی آکر مجھ سے یا کسی بھی ٹیچر سے ڈسکس کرلیں' اگر نوٹس چاہیے ہوں تو بھی آپ آسکتی ہیں بیٹا۔ بلا جھجک۔"

مثال کی شفاف آنکھوں میں نمی سی جھلملانے لگی۔

"یہ زندگی ایک امتحان گاہ بھی ہے بیٹا! کچھ لوگوں کو بہت شروع ہی سے اس میں سخت سوالوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے اور کسی کو آخر میں۔۔۔۔ مشکلیں تو سب کو پیش آتی ہیں مگر ان کے لیے یہ مشکلیں جلد آسان ہو جاتی ہیں جو بہت بہادری سے ان کا سامنا کرنے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟" عاصمہ اسے ساتھ لگائے ہوئے کسی مشفق مہربان ماں کی طرح سمجھا رہی تھی۔

مثال نے جھکے سے اپنے آنسو صاف کرلیے۔

"ضرور آنٹی! میں آجایا کروں گی۔ آپ کا گھر پاپا کے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ میں جب ویک اینڈز کے لیے پاپا کے پاس آیا کروں گی تو آپ کے پاس بھی آجایا کروں گی۔"

وہ لرزتی پلکوں کے ساتھ آنسو ضبط کرتے ہوئے معصوم لہجے میں کہتی سیدھی عاصمہ کے دل میں اتر گئی۔

اس نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

باہر عمران کی گاڑی کا ہارن بجا تو عاصمہ نے اسے بہت سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا جیسے وہ صبح اریبہ اور اریشہ کو اسکول ٹرپ پر جانے کے لیے رخصت کررہی تھی۔

اس کی گاڑی کی پیلی لائٹس دور جارہی تھیں اور عاصمہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ انہیں دور تک تکے جارہی تھی۔ جب واثق کی بائیک دروازے کے پاس آکر رکی۔

وہ بھی ماں کی نظروں کے تعاقب میں دور جاتی شیراز کو دیکھنے لگا۔
"کوئی آیا تھا ممّا؟" وہ ماں کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ جہاں فریج فرائز اور بچے ہوئے وہ کبابوں کے ساتھ کیچپ کی پلیٹ رکھی تھی۔
وہ علو ما "کباب اٹھا کر کھانے لگا۔
"ہاں۔۔۔ تھا کوئی۔" عاصمہ گہرا سانس لے کر کچھ سخر زدہ سے لہجے میں بولی۔
"کون۔۔۔ آپ کا گیسٹ تھا کوئی؟" وہ ذرا متجسس لہجے میں پوچھنے لگا۔ عاصمہ کے شاگردوں کے والدین آتے رہتے ہیں۔ اس نے اس خیال سے پوچھ لیا۔
"ہاں یہی سمجھ لو۔ تم نے آج دیر لگا دی آنے میں؟"
"ہاں بس یونہی۔۔۔ یہ ارشہ اور ربیعہ ابھی تک نہیں آئیں' آپ نے فون کر کے معلوم کیا؟" گھر کی خاموشی پر وہ ماں سے بولا۔
"نہیں' وہ لوگ پہنچنے والی ہوں گی جب میں نے کال کی ان کی کوچ وہاں سے نکل پڑی تھی۔"
"ممّا۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ اٹھ کر جانے لگا کہ صوفے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ محسوس ہوا۔
قرمزی نگینے کے ساتھ چھوٹا سا ٹاپس تھا۔
عاصمہ کو یاد آیا۔ یہ ابھی اس نے مثال کے کانوں میں دیکھا تھا۔
"او شاید اس کے کان سے گر گیا۔" وہ جلدی سے ہاتھ میں لے کر بولی۔
"کس کے؟" وہ کچھ حیرانی سے بولا۔
"تھی میری ایک اسٹوڈنٹ۔ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ شاید اس کے کان سے گر گیا ہو۔ اب آئے گی تو واپس کر دوں گی۔ تم منہ ہاتھ دھو لو میں تمہارے لیے کھانا لگا دوں۔"
وہ ٹاپس واثق کے ہاتھ سے لے کر اندر چلی گئی۔

٭ ٭ ٭

زکیہ بیگم کو فالج ہو چکا تھا۔
وہ بستر پر لاچار ہو کر گزشتہ تین سال سے پڑی تھیں۔ حنا کے یکے بعد دیگرے چار بچے ہوئے تھے کہ اسے سانس لینے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔
چار بچوں کے ان گنت کام پھر بستر پر پڑی مفلوج ساس کی ہر لمحہ خدمت' وہ ملازماؤں کے ساتھ بھی حنا کے کام نپٹتے نہیں تھے۔
پھر مسلسل کام اور ذمہ داریوں نے اسے بہت چڑچڑا' بدمزاج اور بدزبان بنا دیا تھا۔
بشریٰ تو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جب وہ اپنے دولت مند شوہر کی لمبی گاڑی میں سجی سجائی کبھی کبھی ماں سے ملنے آتی تو کسی مہمان کی طرح دو گھڑی بیٹھ کر چلتی بنتی۔
اسے زکیہ کے پاس بیٹھنے ان کی خدمت کرنے کا نہ تو کوئی شوق تھا نہ احسن کمال اسے چند گھنٹے سے زیادہ وہاں رکنے کی اجازت دیتا تھا۔
وہ بڑے تکلف بھرے انداز میں آتی اور چائے اسنیکس کے ساتھ ماں کا حال احوال پوچھ کر کچھ تحفے بچوں کے حوالے کر کے چلتی بنتی تو ایسے میں حنا کا جی چاہتا اسے دھکے دے کر گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔۔۔ وہ دوبارہ یہاں اس کا جی جلانے کے لیے نہیں آئے۔

مگر اس کے جلے دل کی یہ خواہش بھی پوری ہونا ناممکن تھی بہرحال عمران ذکیہ ابھی بھی بشریٰ کو چاہتے تھے اور اس کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔

حنا کو جب بشریٰ اچھی نہیں لگتی تھی تو پھر اس کی بیٹی مثال کیونکر اچھی لگ سکتی تھی۔

جب وہ ماموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی' حنا سب سے چھوٹے بیٹے کی ڈنر سیٹ کی پلیٹ توڑنے پر ٹھیک ٹھاک دھنائی کر رہی تھی۔

بچے کو مارنے پیٹنے کے دوران اس نے جی بھر کر اپنے نصیبوں کو اور بچوں کی بدتمیزی کو کوسا۔

اور اسی طرح چیختی چلاتی غصیلے مزاج کے ساتھ کچن میں چلی گئی۔

عمران بیوی کا آف موڈ دیکھ کر دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے کھسک گیا۔ مثال کسی مجرم کی طرح پہلے لاؤنج میں بیٹھی رہی پھر اندر کچن میں حنا ابھی بھی برتن پٹختے ہوئے اسی طرح کرختگی سے بول رہی تھی جانے اب کچن میں کون سے نمبر والا بچہ تھا۔

"یہ لو پکڑو۔ اپنی اس بیمار' بد مزاج نانی کو کھلا دو یہ چاول۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میری ہی ڈیوٹی نہیں کہ میں اس بیگار کیمپ میں جتی رہوں۔ تمہاری احسان فراموش ماں اور عیاش ماموں کو تو کوئی شرم ہے نہ حیا کہ اس بیمار بڑھیا کو میں اپنے جہیز میں نہیں لے کر آئی تھی' دو گھڑی کو وہ بھی اس کی خدمت کر لیں۔"

وہ پلیٹ اس کے آگے پٹخ کر جس طرح چیختی ہوئی آئی تھی اسی طرح بولتی بکتی چلی گئی۔

مثال چاولوں کی پلیٹ لے کر نانی کے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

ذکیہ بیگم بستر پر عبرت کی تصویر بنی پڑی تھیں۔

اور ان کے کمرے میں کس قدر تعفن' گندگی اور بدبو تھی کہ مثال کو لگا اسے ابھی قے آجائے گی۔

کمرے کے پردے گرے ہوئے تھے۔ کمرے میں عجیب سی گیلی گیلی بساند تھی۔ ذکیہ کی زبان پر بھی فالج گرا تھا وہ جو بھی بولتی تھیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

سو وہ بغیر بتائے بستر خراب کرتیں بغیر بتائے کھانا پینا اگل دیتیں اور حنا گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف کئی کئی گھنٹے اس کمرے میں جھانکنا ہی بھول جاتی۔

ملازمہ موجود تھی مگر جب مالکن کو کوئی دلچسپی نہیں تھی تو وہ کیوں دل سے کام کرتی۔

اوپر اوپر سے کمرہ صاف رکھتی اور بیچاری ذکیہ کے کمر کے نیچے بننے والے زخم پھیلتے ہی چلے جا رہے تھے۔

مثال کو دیکھ کر ذکیہ کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکالتی رونے لگی تھیں۔

"غوں غاں کرتی کیا بولے جا رہی تھی۔ مثال کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر وہ نانی کی بے بسی' ان کی لاچاری کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میرے اللہ! میں ہر وقت اپنی حالت کو' اپنی بے بسی' بے چارگی کو روتی رہتی مگر نانی۔ جو کسی گندے شخص کو جس کے کپڑوں سے ذرا سی بو آ رہی ہوتی تھی پاس نہیں بیٹھنے دیتی تھیں وہ اس حال میں ہیں کہ اپنے جسم سے پھوٹتی ان غلیظ بدبوؤں کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔"

وہ اتنے بدبودار ماحول اور ذکیہ کو خستہ حال میں دیکھ کر کس طرح انہیں چاول کھلا سکتی تھی۔

"[illegible]"

ذکیہ کو شاید بھوک لگی تھی۔ وہ پلیٹ کو دیکھ کر غوں غاں کرتی جا رہی تھیں۔

مشال نے اپنی سانسوں کو بمشکل روکتے ہوئے ذکیہ کو چند نوالے کھلائے کہ وہ ٹھیک سے غذا کھا بھی نہیں سکتی تھیں۔

ان کی آتی جاتی سانسیں کسی عذاب سے کم نہیں تھیں۔

عمران تو ماں کے کمرے میں کئی کئی دن جھانکتا بھی نہیں تھا مشال کو حنا کی پریشانیوں کا ان چار دنوں میں اندازہ ہوا۔ کم از کم وہ شری اور عمران سے تو اچھی تھی جیسے تیسے سہی ذکیہ کو تین ٹائم کھانا کھلاتی تھی۔ ہوا دیتی تھی ملازمہ کے سر پر چیخ چیخ کر حتی الامکان ان کا کمرہ صاف کرواتی۔ ان کے کپڑے روز بدلواتی۔ ان کے زخموں پر مرہم لگاتی اور کسی دن اس کے پاس ٹائم ہوتا تو ملازمہ کے ساتھ مل کر ذکیہ کو کرسی پہ بٹھا کر باہر بھی لے جاتی۔

مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا اگرچہ روز بھی ہو سکتا تھا اگر عمران دلچسپی لیتا تو۔۔۔

مگر اس نے تو جیسے ماں کو بالکل بھلا دیا تھا ایسے میں حنا واقعی ذکیہ کے لیے کسی فرشتے سے کم نہیں تھی۔

مشال نے ان چار دنوں میں ماسی کے ساتھ مل کر جتنی ہو سکی ذکیہ کی خدمت کی ملازمہ کے ساتھ مل کر سارا کمرہ دھلوایا۔ پردے اتروا کر بدلوائے۔ بستروں کی چادریں کرسیاں 'میزیں سب صاف کروا کے رکھوائیں۔

ذکیہ بی کے زخم چار دن میں بہتر ہونے لگے تھے کہ وہ اب دن میں دوبار کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں اور ٹی وی دیکھتی تھیں۔ پانچویں دن کی شام عدیل اسے لینے کے لیے آیا۔

عدیل کا موڈ سخت آف تھا۔ مشال باپ کا چہرہ دیکھ کر رو دی تھی۔

"کیوں آئی ہو تم ادھر رہنے کے لیے؟" وہ کچھ دیر بھی خود پہ ضبط نہ کر سکا۔ تھوڑا آگے جاتے ہی برہم موڈ میں بولا۔

"وہ پاپا۔۔۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا تو۔۔۔ میں۔۔۔" وہ پاپا کو ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکی اس شام کی سنگین صورت حال اور اس فرشتے جیسی آنٹی کے بارے میں اور اس شیطان جیسے شخص کے بارے میں جو اس کے پیچھے آیا تھا اور نہ ماں کی بے بسی کے بارے میں کہ وہ ٹیچر لانیشیا کا نزپ اس کی وجہ سے کینسل تو نہیں کر سکتی تھی۔

"جانتی ہو ماں مجھے ان ماں بیٹے سے کتنی نفرت ہے۔ ان ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ میں چاہوں بھی تو اس تلخ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔ تم جو آج چند روز چند دن کے لیے کبھی ماں کے گھر دھکے کھاتی ہو۔ کبھی باپ کے گھر اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ماں بیٹا تھے۔" مشال اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ نفرت بھرے لہجے میں پھنکار رہا تھا۔

"پاپا! جب ماما مجھے چار دن پہلے آپ لوگوں کو بتائے بغیر آپ کے گھر کے دروازے پر چھوڑ گئیں اور آپ لوگ مجھے بتائے بغیر یہاں نہیں تھے تو پھر میں کہاں جاتی اس رات اگر یہاں نہ آتی تو؟"

وہ بھی تلخی سے بولی کہ شاید باپ کو اپنی غلطی کا کچھ احساس ہو سکے۔

مشال! میری ایک بات یاد رکھنا 'یہ دونوں ماں بیٹے کبھی بھی تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتے اور تم کسی ایسے موقع پہ کسی دشمن کے پاس رک جانا مگر ان کے پاس نہیں آنا۔ اور آج تو میں تمہیں یہاں لینے آ گیا ہوں اگلی بار تم نے ایسی حرکت کی تو میں کبھی تمہیں لینے نہیں آؤں گا 'اوکے۔"

مشال ساکت سی باپ کے سرد چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔

حنا اس سے بہت متاثر ہوئی تھی جس طرح ان چار دنوں میں اس نے ذکیہ کی خدمت کی تھی۔

"ہائی امی! اب جب بھی پاپا کی طرف آؤں گی' ایک دو رات میں ضرور یہاں آکر رکا کروں گی پھر دیکھیے گا ہم مل کر چند دنوں میں کرسی پر خود بیٹھنے کے قابل کر دیں گے سب بتا۔" وہ بہت جوش سے حنا سے وعدے وعید کر کے آئی تھی۔

"مشال! تم اپنی ماں سے بہت مختلف ہو' بہت سمجھ دار' بہت سلجھی ہوئی اور بہت حساس' ورنہ تمہاری عمر کی بچیاں اس طرح کب کسی کا خیال رکھتی ہیں۔ تم بہت اچھی ہو اور مجھے تمہارا انتظار رہے گا صرف مجھے ہی نہیں تمہاری نانی کو بھی۔ وہ بھی تم سے بہت پیار کرتی ہیں اور ان چار دنوں میں تو اور بھی تم سے مانوس ہو گئی ہیں۔"

حنا بہت متاثر لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اور جو پاپا کہہ رہے تھے۔

وہ دکھ سے صرف آنسو پی کر رہ گئی۔

"پاپا اگر آپ نانو کی حالت دیکھتے ان کی بے بسی ان کی بے چارگی تو شاید آپ کو یہ سب کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ وہ نانو نہیں تھیں جو بہت کروفر سے بات کرتی تھیں جن کا مغرور انداز انہیں ساری محفل میں الگ کرتا تھا۔ یہ تو بہت بے چاری سی بہت مسکین عورت تھیں جو آپ کی میری ہم سب کی تھوڑی سی ذرا سی توجہ چاہ رہی ہیں اور بس۔" وہ دل میں سوچتی رہ گئی۔

پھر رات بھر عدیل نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ایک بار اس بات پہ رکی سی معذرت بھی نہیں کی کہ وہ لوگ بتائے بغیر چلے گئے تھے تو اسے تکلیف ہوئی ہو گی۔

عفت کا موڈ گھر میں آنگ تک تھا۔

دن بھر اسے اکیلے گھر میں کام کرنا پڑا تھا۔ عدیل آ کیسے کھانا ہوا تب۔ رات گئے واپس لے کر آ گیا تھا جب وہ رات کے کھانے کے برتن بھی نبٹا کر دھو رہی تھی۔

مشال خود بہت تھکی ہوئی تھی' وہ خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پورے گھر میں اس کے بستر کی جگہ صرف نسیم کے کمرے میں ہی بن سکی تھی۔

وہاں نسیم کی بک بک اور یہ جان کر کہ چار دن وہ رضیہ کے گھر میں گزار کر آئی ہے' وہ آدھی رات تک غصے اور نفرت سے مشال پر چلاتی رہی تھیں۔

اور مشال دونوں کان تکیے کے اندر گھسیڑ کے ساری رات یوں پڑی رہی جیسے وہ اس کمرے میں موجود ہی نہیں۔

اس کا جی ہر شخص سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

یہاں ہر کوئی مطلبی' بدخلا اور خود غرض تھا خواہ وہ اس کی ماں تھی' اس کا باپ' نانی' دادی' ماموں' سوتیلا باپ' سوتیلی ماں۔ وہ ہر رشتے سے مایوس ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کل بیس اکتوبر ہے نا ماما؟" آمنہ تیرہ سال کی ہو چکی تھی۔ اپنے ہوم ورک کی کاپی پہ ڈیٹ لکھتے ہوئے وہ رک کر شریا سے پوچھنے لگی۔

بیس اکتوبر۔۔۔ تو مشال کی برتھ ڈے ہے۔" وہ عجیب دھیان سے چونکی تھی۔

اور بیٹھے بیٹھے انگلیوں پر کچھ گننے لگی۔

"بیس سال کی ہو گئی مشال۔ الٰہی کاؤ!" اسے جیسے بیٹھے بیٹھے جھٹکا سا لگا تھا۔

یوں بھی آج کل اسے بہت کچھ بھولنے لگا تھا۔

احسن کمال کے بیٹوں کو بھرا ہر کے چکر نے اپنی جانب کھینچنا شروع کر دیا تھا۔

سیفی دو سال پہلے انگلینڈ چلا گیا تھا' ہائر اسٹڈیز کے لیے مگر آج کل وہ آیا ہوا تھا۔

احسن کمال کا کسی آسٹریلین کمپنی کے ساتھ بزنس بہت زبردست طریقے سے چل رہا تھا اور بہت سوچ بچار اور

حساب کتاب کے بعد اس نے آسٹریلیا شفٹ ہونے کا ارادہ کرلیا تھا۔

بشریٰ اس تبدیلی کے لیے رضامند نہیں تھی۔

دونوں کے درمیان روز ہی اس بات پر بحث ہوتی اور بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتی۔ وہ آج کل بہت ڈسٹرب تھی۔

مشال کہاں ہوتی ہے آج کل؟ ادھر ہے یا باپ کی طرف وہ اکثر یہ بھی بھول جاتی۔

سیفی بھی باپ کا ہم خیال تھا اور دونوں ہی چند مہینوں میں یہاں سے سب کچھ وائنڈ اپ کر کے آسٹریلیا شفٹ ہونے کے حق میں تھے۔ بشریٰ نے اپنی مرضی اور خواہش کا اختیار دوسری بار گھر بچانے کے خیال سے جو چھوڑا تھا۔ وہ آج تک اسی طرح احسن کمال کی مرضی اور خواہش پر چلتی آرہی تھی۔

"مشال کہاں ہے آمنہ؟" وہ بے چین سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آئی ڈونٹ نو میم" آمنہ ہوم ورک کرتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

"ٹھیک ہے اگر احسن کمال کو یہاں سے جانا ہی ہے تو میں مشال کی شادی کر کے ہی جاؤں گی۔ ایسا کار یجویشن تو ہونے ہی والا ہے۔" وہ سیڑھیاں اترتی چڑھتی سارے گھر میں مشال کو ڈھونڈتی خود سے باتیں کر رہی تھی۔

مشال اس کی توقع کے عین مطابق اوپر ٹیرس پر تھی اور ڈوبتے سورج کی ترچھی شعاعوں کو تکتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی حال کے بارے میں یا ماضی کے بارے میں یا پھر آنے والے کل کے بارے میں۔

بشریٰ کتنی دیر اس کے پیچھے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

مشال نے کتنا اچھا قد کاٹھ نکالا تھا اس کی رنگت بالکل میری جیسی تھی گندمی سنہری مائل جس میں عجیب سی کشش تھی۔ اس کی سنہری مائل آنکھیں اور لائٹ براؤن بال اس کے چہرے کو اور بھی پرکشش بناتے تھے۔

بشریٰ کو بے اختیار اپنی بیٹی پر پیار آگیا۔

"ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر مشال۔ میری جان!" وہ بے اختیار اس کے پیچھے سے لپٹتے ہوئے مسرور لہجے میں بولی۔

مشال کے لیے ماں کا یوں وش کرنا کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ وہ ماں کے یوں لپٹنے پر بھی ساکت سی رہ گئی فوراً کوئی رد عمل نہ دے سکی۔

بشریٰ اب اس کا ماتھا، آنکھیں، رخسار چوم رہی تھی۔ مشال اسی طرح بغیر پلکیں جھپکائے ماں کو دیکھے جارہی تھی۔

"مشال! میری جان! تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا کہ آج تمہاری برتھ ڈے ہے۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولی۔

"کیونکہ مجھے یہ بات خود بھی یاد نہیں تھی۔" وہ عجیب روکھے میکانکی انداز میں بولی۔

بشریٰ لحہ بھر کو کچھ بول ہی نہیں سکی۔

کتنے سالوں سے وہ خود بھی مشال کی برتھ ڈے نہ تو منا سکی تھی نہ یاد رکھ کر اسے وش ہی کر سکی تھی۔

"آج آپ کو کیسے یاد آگیا۔" وہ گلہ کرنا تو نہیں چاہتی تھی مگر جانے کیسے اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

"میری مشال بیس سال کی ہو گئی۔ میں صرف یہ سوچ کر حیران ہوں کہ میری بیٹی اتنی بڑی ہو گئی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔"

وہ عجیب جذباتی پن میں بیٹی کو پیار کر رہی تھی۔

"اس سے کیا ہوتا ہے ماما؟" وہ مایوس سے لہجے میں بولی۔

بشریٰ اس کے چہرے کے اطراف میں بکھرے بال سمیٹنے لگی۔
"تمہارا فائنل کب ہے گریجویشن کا؟" وہ یوں عام سے لہجے میں پوچھ رہی تھی جیسے وہ دونوں ماں بیٹی روز اسی طرح ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر۔ روزمرہ کی باتیں کرتی ہیں۔
"تین چار ماہ ہیں ابھی تو۔" وہ سرسری لہجے میں بولی۔
بشریٰ اسی طرح محبت لٹاتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔
"ایک بات پوچھوں مشال؟" وہ بہت رازدارانہ انداز میں بولی۔ مشال کچھ حیرانی سے اس کو دیکھنے لگی۔
"تم میری بات کا غلط مطلب نہیں لینا جان!" وہ جلدی سے صفائی دیتے ہوئے بولی۔
"میں سمجھی نہیں مما!" وہ آہستگی سے بولی۔ اسے بشریٰ کے رویے سے الجھن سی ہو رہی تھی۔
"تم اب بڑی ہو چکی ہو اور میں جانتی ہوں۔ بحیثیت ماں میں نے تمہاری ذمہ داریاں اس طرح نہیں نبھائیں جس طرح مجھے نبھانی چاہیے تھیں۔ تمہارے بہت سے حقوق میں نے نظر انداز کیے اور تمہیں وہ محبت بھی نہیں دی جس کی تم حق دار تھیں۔ مجھے اپنی تمام تر کوتاہیوں کا احساس ہے مشال؟" وہ نم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"لیکن میں چاہتی ہوں۔ اب آئندہ آنے والے دنوں میں میں تمہارے ساتھ جانے یا انجانے میں کچھ برا نہ کروں۔ کیا تم اپنی ماں پر بھروسا کرو گی مشال؟"
وہ جانے کس بات کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھ رہی تھی مشال کو الجھن سی ہونے لگی تھی۔
"آپ کو جو کہنا ہے" آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں مما!" وہ تحیر سے بولی بشریٰ اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔
اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نوخیز بشریٰ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔
"تم۔ تمہیں کوئی پسند ہے مشال! میرا مطلب ہے تم کسی کو پسند کرتی ہو۔"
بشریٰ کی تمہید جتنی لمبی اور اکتا دینے والی تھی۔ سوال اتنا ہی چونکا دینے والا اچانک سا تھا۔
"مما!" وہ پریشان ہو گئی۔
"میری جان! ماں پر شک نہیں کرتے۔ تمہیں غلط نہیں سمجھ رہی میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میری بیٹی کو آنے والی زندگی میں بہت سی خوشیاں بہت تسکین ملیں اور اگر تم کسی کو پسند کرتی ہو یا تمہیں کوئی چاہتا ہے تو تم مجھے بلا جھجک بتا سکتی ہو۔ میں خود ان لوگوں سے ملوں گی۔ بات کروں گی اور تمہارا رشتہ۔"
مشال ایک جھٹکے سے ماں کو خود سے الگ کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔
"جو ذمہ داری آپ نہیں نبھا سکیں۔ آپ چاہتی ہیں کوئی دوسرا اسے نبھائے تاکہ آپ خود اپنی نظروں میں سرخ رو ہو سکیں۔" وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔
بشریٰ ساکت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ مشال کی آنکھوں میں ایک دم سے اجنبیت اتر آئی تھی۔
"مشال تم میری بات نہیں سمجھیں۔"
"میں آپ کو بھی سمجھ چکی ہوں اور آپ کی ذہنیت کو بھی اور آپ کی بات کو بھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتی۔" وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
بشریٰ گم صم سی وہیں بیٹھی رہ گئی۔
یہ تو اسے اندازہ تھا کہ ایک روز جب کبھی بھی اس نے مشال کے ساتھ پچھلا حساب کتاب کھولا تو وہ یونہی تہی دامن بیٹھی رہ جائے گی۔ خالی جھولی لیے۔
جب اس نے مشال کو کبھی کچھ دیا نہیں تو اس کے دل نے یہ توقع کیسے لگائی کہ وہ جواب میں اسے محبت، چاہت

اور وہ خوشی دے گی جو وہ خود اسے کبھی دے ہی نہیں پا سکی۔

وہ اپنے سارے جذبے تو سیفی اور آئینہ پر لٹا چکی تھی۔ مثال تو اس کے ماضی کی تلخ یادوں کا حصہ تھی جو جب بھی اسے نظر آتی تو وہ اس سے نظریں چرا لیا کرتی تھی پھر اب کس بھروسے پر وہ اس کے سامنے اپنے جذبات رکھ رہی تھی۔ اعتبار یا بھروسا ایسے پل بھر کا کھیل نہیں ہوتا۔ جب وہ ماں ہونے کی حیثیت جتا کر بیٹی کے آگے رکھے گی تو آنکھیں بند کر کے اس کی انگلی تھام کر چل پڑے گی۔

"اسے اب یوں بھی میرے سہارے' میری انگلی تھامنے کی ضرورت نہیں اور مثال کسی کو پسند نہیں کرتی۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو ہی گیا ہے لیکن پتا نہیں کیوں مجھے چند دنوں سے یہ محسوس ہو رہا ہے اگرچہ میں گھر کی ذمہ داریوں اور احسن کمال کی اس نئی بحث میں بہت الجھی رہتی ہوں پھر بھی مجھے کئی بار لگا سیفی مثال کو بہت الگ سی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے وہ اسے دل ہی دل میں پسند کرنے لگا ہو۔ اسے چاہنے لگا ہو' جب سے وہ یوکے سے واپس آیا ہے۔ اس کی نظریں مثال کے لیے بدلی ہوئی ہیں۔

اگر ایسا کچھ ہو جائے تو میری مثال ہمیشہ کے لیے میرے پاس ہی رہ جائے گی اور میں ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی کی محرومیاں دور کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں آج کل ہی کسی بہانے سے سیفی کو ٹٹولتی ہوں تو پھر اس سے بات کروں گی۔" اس کے دل میں انوکھا خیال جاگا تھا' وہ بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

اور یہ ٹھیک ان ہی دنوں کی بات ہے' جب واثق انجینئرنگ کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا تھا۔

اور اکثر وہ چھت پر بیٹھی مثال کو دیکھتا اور اس کی طرف کھنچ جاتا تھا۔

پھر ایک رات جب وہ یونہی ٹہلتی ہوئی چھت کے ساتھ کسی خوشبودار جھونکے کی طرح اس سے آٹکرائی تھی۔

دونوں گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

اور ان ہی دنوں میں جب اسے ایک معمولی سی کمپنی میں ایک بہتر جاب ملی تھی اور مثال اسے اکیلی ملی اور وہ اس کو مخاطب کرنے کی جرات کر بیٹھا تو اس نے کیسی بے خوفی سے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا تھا۔

اب تو آتے جاتے ملاقاتیں بالواسطہ ہو چکی تھیں کہ واثق کو وہ بہت اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔

مثال کے حافظے سے بھی وہ محو نہیں ہو سکا تھا۔

جس رات وہ اس سے ٹکرائی تھی۔ اس رات اور بعد میں آنے والی بہت سی راتوں میں اس کی مضبوط بانہوں کا حصار اسے بہت بے چین رکھتا رہا تھا۔ اتنے سارے اپنوں کے درمیان اجنبی رویے اسے اندر ہی اندر بہت کمزور کر چکے تھے۔

بظاہر وہ لاتعلق' بے نیاز رہتی۔ بے حس' بے تاثر چہرہ لیے۔ عفت کو اور بھی غصہ آتا کہ اس لڑکی پر کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا مگر وہ اندر سے بہت ہی ڈرپوک اور سہمی ہوئی تھی۔

وہ دوبارہ کبھی عاصمہ کے گھر نہیں گئی تھی۔

اگرچہ وہ ایک بار دن کی روشنی میں وہاں سے گزری تھی مگر وہ مشفق عورت اس کے قدموں کو اور بھی تیز کر گئی۔

اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ اس کے حالات جان کر اس پر ترس کھائے' اس سے ہمدردی کرے۔ وہ اب کسی کو بھی یہ نہیں بتاتی تھی کہ پاپا کے گھر سے آ رہی ہے یا ماما کے گھر۔۔۔

وہ آج کل صرف ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ جلد سے جلد گریجویشن کرتے ہی اپنے لیے کوئی جاب تلاش کرنا ہے اور اپنے پیروں پہ خود کھڑے ہونا ہے۔

احسن کمال اور بشریٰ کے درمیان روز ہونے والی بحث بھی اسے جو کنا کر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی جلد یا بدیر احسن کمال کی جیت ہوگی اور بشریٰ کو سب کچھ سمیٹ کر اس کے ساتھ آسٹریلیا جانا ہی پڑے گا۔

اور اس سب کچھ میں مشال تو کہیں بھی نہیں ہوگی اور عفت اسے مستقل اپنے گھر میں ٹھہرانے پہ کبھی بھی راضی نہیں ہوگی۔

تو ایسے میں اسے خود کو مضبوط کرنا تھا۔ وہ ہمدردی اور بے چارگی کا نشان بن کر لوگوں کے لیے مثال نہیں بننا چاہتی تھی۔

نسیم کا پانچ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا اور وزکیہ تو وہ جب آخری باران کی خدمت کر کے آئی تھی۔ اس کے ایک ماہ بعد ہی زندگی کے آزار سے رہائی پا گئیں۔ عدیل کو دوبارہ کبھی اسے ٹوکنا نہیں پڑا تھا کہ وہ زکیہ اور عمران سے کبھی نہیں ملے گی۔

پریشے بہت خوب صورت نکلی تھی۔ قد کاٹھ میں بھی تیرہ چودہ سال کی عمر میں وہ مشال کے برابر آگئی تھی' جو دیکھتا وہی اس کے حسن کا مداح ہو جاتا' عفت کا سر فخر سے اٹھ جاتا۔

پریشے کا اصل حسن اس کی معصومیت تھی۔ وہ اس حسن پر مغرور نہیں تھی لیکن اس معصومیت میں بھی بہت بے نیازی تھی وہ جب موڈ ہو تا مشال سے ٹھیک طرح بات کر لیتی ورنہ تو مشال کے بلانے پر اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔

وائل ایک لاپرواہ سا لڑکا تھا جسے مشال میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شروع سے عفت کی یہ بات سمجھ گیا تھا کہ یہ تمہاری سوتیلی بہن ہے۔ تم اس سے جتنا بھی لگاوٹ کا مظاہرہ کرو گے یہ ٹھیک پندرہ دن بعد سال سے چلی جائے گی۔

وائل نے بھی اسے دل سے بہن نہیں سمجھا تھا۔

ان لوگوں کی ایک مکمل فیملی تھی جس میں مشال کی جگہ نہیں تھی۔ نسیم بیگم کی وفات کے بعد اس کا کمرہ پریشے کے حصے میں آگیا تھا۔ اوپر والا پورشن کرائے پہ تھا۔ صرف چھت ان کے پاس تھی جس پر مشال کبھی کبھی تنہائی کی تلاش میں جا کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

اور آج بھی وہ وہیں بیٹھی بشریٰ کی بات کو نئے سرے سے سوچ رہی تھی۔

"مشال تم کسی کو پسند کرتی ہو؟" اس نے ماں کی بات کو کس طرح سختی سے رد کیا تھا مگر اب تھم سے وہ چہرہ اس کے سامنے آگیا تھا جو اس کے اچانک بہت قریب تھا۔

"نہیں مجھے اس کے بارے میں نہیں سوچنا۔" وہ سر جھٹک کر اٹھی اور یونہی چھت پہ ٹہلنے لگی۔

اور دوسرے لمحے وہ ساکت سی رہ گئی۔

وہی لڑکا یک ٹک اس کو دیکھے جا رہا تھا' مشال کے قدم جیسے وہیں جکڑے رہ گئے۔

دونوں بہت دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے جیسے بہت قریب محسوس کر رہے تھے۔

وائق نے دور سے ہاتھ ہلا کر اسے وش کیا تھا۔

وہ جھینپ کر بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی رات تک اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر اتھل پتھل ہوتی رہی تھیں۔

"کند ذہن حیا ہے تمہارا؟ کھانے میں نمک کی جگہ چینی ڈالنے لگی تھیں مثال! تم جب بھی اپنی ماں کے گھر سے ہو کر آتی ہو مجھے زچ کر کے رکھ دیتی ہو۔ کیا پٹیاں پڑھا کر بھیجتی ہے وہ عورت تمہیں؟" عفت کو جی بھر کر اس پر غصہ آرہا تھا۔ زور زور سے بولتی چلی گئی۔

"ماما کہتی ہیں جب آپ بابا کی ساری تنخواہ ان کی ہر چیز پر قابض ہیں۔ ان کی سیلری میں سے ایک جوڑا کپڑوں کا تمہیں نہیں بنا کر دیتیں تو پھر تم بھی مثال اس گھر کا کوئی کام نہیں کیا کرو۔ تم نوکرانی نہیں ہو عفت بیگم کی۔" وہ باقاعدہ کمر پر ہاتھ رکھے نڈر لہجے میں بول رہی تھی۔ عفت کی آنکھیں تو جیسے پھٹنے کو تھیں۔

"یہ۔ یہ تمہاری ماں نے بکواس کی؟" وہ شاکڈ رہ گئی تھی۔

"بالکل سچ کہا ماما نے لیکن میں نے ان سے کہا چونکہ میں بابا سے بہت محبت کرتی ہوں تو صرف اس لیے کہ عفت ماما بابا کو میرے خلاف اکسا نہیں سکیں۔ میں ان کے گھر کا کام کر دیتی ہوں ورنہ کوئی میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔" وہ ٹونٹی سے ہاتھ دھو کر کھانا ادھورا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ پتا نہیں کیوں آج اس کا ہی ہر کام کو الٹا کرنے کو جی چاہ رہا تھا اور اب عفت کچن میں کس طرح جل بھن رہی ہوں گی۔ سوچ کر ہی مثال کو ہنسی آرہی تھی۔

"مگر وہ لڑکا!" اس نے بے اختیار آنکھیں رگڑیں وہ تو اس۔ عاصیان کی تنگ سنبھال کر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے بھولتا کیوں نہیں؟" وہ بے بسی سے سیڑھیوں میں بیٹھ کر پھر اسی کو سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ پر تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گیا تھا۔

ہاشم بھائی ان کی بیوی صائقہ اپنے دونوں بیٹوں رقد اور وقاص کے ساتھ اتنے سالوں بعد پاکستان آئے تھے۔ اور دونوں میاں بیوی نے آتے ہی اریبہ اور ریشہ کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔

"اور ہم چند روز میں نکاح اور رخصتی کروا کر اپنی بیٹیوں کو ساتھ لے کر جائیں گے۔" صائقہ بھابھی کی بات پر عاصمہ کو لگا ابھی خوشی سے اس کا دل بند ہو جائے گا۔

"بھابھی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ ابھی تو کسی سے میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں سوچا۔"

وہ کانپتی آواز میں بول رہی تھی۔

"واثق اب تم ہی کچھ بولو؟" ہر ایسے مشکل وقت میں وہ واثق کو پکارا کرتی تھی سو اب بھی یہی کیا۔

"میرے خیال میں ای اس میں کچھ ایسا حرج بھی نہیں صرف ایک بار اریشہ اور اریبہ سے پوچھ لیتے ہیں انہیں اگر کوئی اعتراض نہیں ہو تو۔ کیوں ماموں؟" واثق ہاشم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہاری ماں شروع ہی سے ایسی ہے واثق! اچانک اس کے سر پہ خدانخواستہ غم کی خبر ہو یا خوشی کی بات پڑ جائے تو یہ ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتی ہے۔ بہت تھڑدلی ہے اس کا۔ دل کہا کرتی تھیں۔ میری بہن کا دل تو چڑیا جیسا ہے۔" ہاشم بہت پرانی بات یاد کرتے ہوئے بولے تو عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"سچی بات تو یہ ہے عاصمہ باجی! کہ مجھے لگتا ہے اس مرض نے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا یوں سمجھیں جیسے تیسے زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہی ہوں۔ پہلے ہاشم کی صرف جاب تھی سعودی عرب میں تو ارادہ تھا کبھی نہ کبھی یہاں آجائیں گے مگر اب تو ان کا اور دونوں بیٹوں کا بزنس اللہ کے فضل سے جم گیا ہے وہاں تو واپسی تو مشکل ہے اور گھر چلانے کے لیے تو ہمیں صرف آپ کی بیٹیوں کا خیال آیا کہ جس طرح کی سلجھی ہوئی سمجھ دار آپ ہیں ایسی ہی اریبہ اور اریشہ ہوں گی۔ بس آپ ہمیں انہیں دے دیں۔ ہم سمجھیں گے آپ نے ہمارا مان رکھ لیا۔" صائقہ کم عمر عورت تھی پھر عمر بھر اپنی بیماری کے ہاتھوں عاجز رہی۔

اور آج وہ جس طرح عاجزی سے بات کر رہی تھی۔ عاصمہ کو لگا اللہ نے اس کی عمر بھر کی ریاضتوں کا حساب یک مشت چکا دیا ہو، وہ بھابھی کے گلے لگ کر روتے ہوئے مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ لائبریری سے باہر نکل رہی تھی۔
پیلے رنگ کے کھلے ہوئے کاٹن کے سوٹ میں دوپٹہ اچھی طرح لپیٹے پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پہ چمک رہے تھے جب بے دھیانی میں تیزی سے سیڑھیاں اترتے وہ اوپر آتے واثق سے ٹکرا گئی۔
دونوں کے ہاتھوں میں موجود کتابیں گر گئیں۔ واثق نے دونوں کتابیں اٹھالیں۔
وہ سیدھی ہو کر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"پلیز میری کتابیں واپس کریں۔" وہ اس کی نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر بولی۔
"آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ قدرت واقعی ہم دونوں کو بار بار ملانے سے یوں سر راہ ٹکرانے سے کوئی خاص بات بتانا چاہتی ہے۔" وہ شوخی سے بولا۔
"لگتا ہے آپ کو وہ تھپڑ بھول گیا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں جتا کر بولی۔
وہ بے اختیار ہنس پڑا۔
"مجھے لگتا ہے آپ بہت ہتھ چھٹ ہیں۔ یونہی ہر راہ چلتے کو تھپڑ جڑ دیتی ہیں۔" وہ بھی طنزیہ لہجے میں بولا۔
"آپ نے کیا مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھ رکھا ہے۔"
"جو سمجھ رکھا ہے وہ تو آپ مجھے سمجھنے نہیں دے رہیں ورنہ تو آپ کو کیا سمجھوں گا۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔
"پلیز میری کتاب واپس کریں۔" وہ زچ ہو کر بولی۔
"انٹرویو میں کامیاب ہونے کے سو گر۔" وہ کتاب کا ٹائٹل پڑھ کر چڑا کر اسے کہنے لگی۔

"ویسے ایک مشورہ دوں' آپ یہ کتاب واپس کر آئیں۔ اس کتاب میں بے کار قسم کے مشورے ہوں گے۔ میں آپ کو پریکٹیکلی ہزار ٹپس دے سکتا ہوں انٹرویو میں کامیاب ہونے کے لیے۔ آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے۔" وہ سینہ پھلا کر بولا۔

مشال نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کتاب جھپٹی اور جانے کے لیے مڑی۔

"تو آپ کو جاب کی تلاش ہے۔ کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں اس سلسلے میں؟" وہ پیچھے سے سنجیدگی سے بولا تو مشال ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

واثق نے آہستگی سے کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا۔

"اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو اس نمبر پر کال کر لیجیے گا' جاب خود چل کر آپ کے پاس آجائے گی۔"

وہ کارڈ کتاب کے کونے میں رکھ کر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

مشال کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر کونے سے وہ کارڈ نکال کر پڑھنے لگی اور کچھ سوچتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی۔

اتنی گہری کہ وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کس کمرے میں سو رہی ہے۔ شہر کے کس ہوٹل کے۔

اس کے چہرے پر کوئی سرسراہٹ ہو رہی تھی۔

اور پھر وہ سرسراہٹ اس کی گردن تک آگئی۔ اس کا دم جیسے گھٹنے لگا تھا۔

اس نے گہری نیند میں خود کو جیسے آزاد کرانا چاہا۔ ادھر ادھر سر مارا مگر اس کا وجود جیسے کسی شکنجے میں کستا جا رہا تھا۔

وہ بے بس سی ہو گئی مگر نیند کا غلبہ اس مزاحمت میں کچھ کم ہو گیا۔ کوئی اسے کھینچ رہا تھا۔ گھسیٹ رہا تھا۔

اس نے ایک زوردار چیخ ماری۔

کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز بند کرنے کی کوشش کی اس کا دوپٹہ اس کے کپڑے۔۔۔

دوسرے لمحے ایک تیز تھپڑ پڑنے کا احساس تھا۔ وہ چیختی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قانتہ رابعہ

لیلۃُ القدر

بالآخر فلزہ آخری پرچہ دے کر آئی اُدھر امی نے اپنی "مجلس شوریٰ" کا اجلاس بلایا۔ ایک مہینہ سے تو دونوں کے امتحانات نے فلزہ کو اپنی سدھ بدھ بھلا دی تھی۔ نہ کھانے پینے کا ہوش نہ تھا نہ نیند کا احساس۔ آج آخری پرچہ دے کر آئی تو بے سدھ ہو کر جو لیٹی تو آپا کی دو سالہ شہزادی خنساء کے شور پر آنکھ کھلی۔ خوابوں کی دنیا سے حقیقی دنیا تک آنے میں فلزہ کو کئی منٹ لگے۔ پھر اسے یاد آیا تو خوش ہو گئی۔

"شکر الحمدللہ آج پیپرز ختم ہو گئے ہیں۔"

باہر آئی تو بڑی آپا بھیا شمرین بھابھی اور منصورہ خالہ کے چہرے نظر آئے۔ اسے بہت حیرت ہوئی۔ بڑی آپا اپنے گھر میں بہت مصروف رہتی تھیں اور آج کل بعد ہی چکر لگا پاتی تھیں۔

"السلام علیکم۔۔۔ آپ سب اکٹھے ہی آئے ہیں میرا مطلب ہے حسن اتفاق ہے یا باقاعدہ بلائی گئی ہیں؟" فلزہ نے خالہ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"آپا نے بلایا تھا۔" منصورہ خالہ ذو معنی لہجے میں بولیں۔

"مجلس شوریٰ" کا اجلاس تھا۔ مجلس شوریٰ کی اصطلاح ان کے تمام گھرانوں میں عام تھی جب کوئی خاص مسئلہ ہوتا تو خاندان کے چیدہ افراد کو بلایا جاتا اور باہمی مشاورت سے مسئلہ حل کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اسے مجلس شوریٰ کے اجلاس پر نہیں ایجنڈے پر تھی۔

"ایجنڈا کیا تھا؟" فلزہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ایجنڈا بذات خود فلزہ ہو گی۔

"بی بی آپ کی منصوبہ بندی تمہاری شادی اور رخصتی کی بات طے تو ایجنڈہ تھی۔" آپ کے بھائی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"میں! میری شادی؟" حیرانی سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ پیپرز کے دوران اڑتی اڑتی سی خبر تو ملی تھی کہ جو لوگ اسے دیکھنے آئے تھے ادھر سے گرین سگنل مل گیا ہے۔

"ہائے مجھے نہیں ابھی شادی کرنی۔" فلزہ پریشانی سے بولی۔

امی قریب سے گزریں تو اسے اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ فلزہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ امی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"جی امی۔۔۔" وہ امی کے بیڈ کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو۔۔۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔ کچھ تو تمہیں پتا چل ہی گیا ہے فرمان کے جس دوست کے بھائی کا رشتہ آیا تھا انہوں نے تمہارے پیپرز کے شروع میں ہاں کر دی تھی۔ میں نے سوچا کہ تمہیں امتحانات کے دوران بتایا تو تم ذہنی طور پر پریشان ہو جاؤ گی اس لیے میں انتظار میں رہی کہ تم فارغ ہو جاؤ۔ آج منصورہ اور صائمہ وغیرہ کو اسی سلسلہ میں مشورہ کے لیے بلایا تھا۔ ہم سب نے یہی سوچا ہے کہ اگلے مہینہ کی کسی تاریخ کو تمہارے نکاح کی تاریخ رکھ دی جائے۔"

فلزہ کا سانس رک گیا۔ امی شروع سے ہی ایسی

تھیں بہت باعمل زندگی گزارنے والی۔۔۔ دو ٹوک بات کہنے والی' بات حقوق اللہ کی ہو یا حقوق العباد کی' وہ دونوں کو عبادت سمجھتی تھیں لہٰذا سسرال میکے والے سب ان کے خلوص کے قدردان تھے۔

"لیکن امی! آج ہی تو میرا آخری پیپر تھا۔۔۔ کم از کم رزلٹ کا تو انتظار کرلیتیں۔" فلزہ نے درخواست پیش کی۔ جو کہ انہوں نے فی الفور رد کردی۔

"نہیں اس کی گنجائش نہیں' تمہاری شادی کے کچھ دنوں بعد رمضان کا مہینہ آرہا ہے اور میں رمضان کا مقدس مہینہ شادی کی تیاریوں میں' بازار میں ضائع نہیں کرنا چاہتی' رمضان کے بعد ویسے بھی تمہارے بھیا کی سوڈان روانگی ہے اس لیے یہی طے پایا کہ تیاری کے لیے ہمیں بائیس دن ملے ہیں۔"

"امی۔۔۔" فلزہ نے احتجاج کیا "رمضان تو ادھر گزار لینے دیں۔ پتا نہیں وہاں کیا ماحول ہو؟ آپ کو پتا بھی ہے میں رمضان میں کہیں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی!"

"ہاں۔۔۔ یہ نکتہ صائمہ نے بھی اٹھایا تھا۔۔۔ لیکن ایک تو یہ بچکانہ بات ہے کہ تم رمضان میں کہیں نہیں رہ سکتیں۔ آخر زندگی میں کبھی نہ کبھی تو تمہیں یہاں اس گھر سے جانا ہی ہے۔ دوسری بات ماحول کا ہے۔ ماحول کیا ہونا ہے؟ جو میں اور تم کریں گے وہی ماحول ہوگا۔"

"امی آپ جانتی بھی ہیں' پھر بھی ایسے کہہ رہی ہیں! آپ کو پتا ہے رمضان میں میرا تعلق دنیا سے کٹ جاتا ہے نئے ماحول میں ایسے کہاں ہو پائے گا؟"

امی ایک لمحہ کے لیے چپ رہیں۔ پھر بولیں "ہمارا صرف رمضان میں نہیں پورا سال ہی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے تعلق کٹ جانا چاہیے۔"

"اف" آپ بات نہیں سمجھ رہیں' ان لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے کی اللہ جانے رمضان میں کیا روٹین ہو' پھر میں کیا کروں گی؟" فلزہ جھنجلا کر بولی۔

امی مسکرائیں۔

"میں تمہارا نقطہ نظر اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا' جس طرح بارش کا قطرہ اللہ کے حکم کا محتاج ہوتا ہے اس طرح ہر جوڑ ہر رشتہ بھی اللہ کے حکم سے طے پاتا ہے۔ اگر تمہیں تمہارے مزاج کے لوگ مل گئے تو پھر زندگی تو سکوت اور جمود کا شکار ہو جائے گی۔ میری بچی زندگی تو امتحان ہے۔۔۔ یہاں مختلف مزاج لوگوں میں رہ کر ان کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے کوشش کرنا ہی مقصود و مطلوب ہے۔۔۔ یہی کوشش "سعیاً مشکورا" قرار پاتی ہیں گی نیکوکاروں کو نیکوکار اور بدکاروں کو بدکار ہی ملتے رہے تو زندگی کا مقصد ہی ختم ہو جائے۔"

"پھر بھی رمضان سے آگے نہیں لے جاسکتیں آپ؟" فلزہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارا رمضان میں عمرہ کا پروگرام بن رہا ہے اور وہاں جانے سے پہلے ہم یکسو ہو کر جانا چاہتے ہیں۔"

"یعنی میں آپ کے عمرہ پروگرام میں رکاوٹ ہوں؟" فلزہ خفگی سے بولی۔

"نہیں چندا! ایسی کوئی بات نہیں۔ اللہ نے ہمیں زندگی دی اور اس محدود زندگی میں اولاد کے فرائض سے سبکدوش ہونے کی توفیق دی شکرانہ تو بنتا ہے ناں" امی نے دلیل دی۔

"رمضان کے بعد شادی کردیں اگلے رمضان میں شکرانے کا عمرہ کرلیں۔" فلزہ نے تجویز دی۔

"یہاں پل بھر کا بھروسا نہیں۔۔۔ اگلا سال اور رمضان کس نے دیکھا ہے؟" امی نے افسردگی سے کہا۔ پانچ چھ ماہ قبل ان کے بڑے بھائی اور والدہ کا انتقال ہوا تھا جس کے بعد وہ پل بھر کے لیے بھی موت کو نہیں بھولتی تھیں۔ آنے بہانے موت کا ذکر لبوں پہ ہی رکھتیں۔ کفن تک خرید رکھا تھا۔ کیا خبر جمعہ کا دن ہو' بازار بند ہو' ہڑتال ہو یا کوئی اور معاملہ پیش آجائے۔

"گویا آپ نے طے کرلیا ہے؟" فلزہ فکر سے بولی۔

"ہاں مجلس شوریٰ کا متفقہ فیصلہ ہے۔ تم گھبراؤ نہیں اٹھتے بیٹھتے اللہ سے مدد مانگو 'کبھی اس نے مانگنے والے کو مایوس کیا ہے؟" امی نے سوال کیا۔ فلزہ خاموش رہی۔ اتنے میں منصورہ خالہ نے انٹری دی۔

"گھبراؤ نہیں فلزہ! یہ وقت تو ہر کسی پر آتا ہے۔" انہوں نے فلزہ کو گلے لگایا۔

"خالہ روزوں کے بعد رخصت کر دیتے۔"

منصورہ خالہ ـــ آپ جانتی ہیں گیارہ ماہ جس افراتفری اور کاموں کی بھرمار میں گزرتے ہیں ایک رمضان کا ہی تو مہینہ ہوتا ہے جس میں زندگی کی بے قراریوں کو قرار آجاتا ہے مجھے تو سارا سال اس ماہ مقدس کا انتظار رہتا ہے۔"

"ہاں بات تو صحیح ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ عبادت صرف جائے نماز پر سجدہ اللہ کرنے کو تو نہیں کہتے اللہ کے بندوں سے تعلقات استوار کرنا بھی تو عبادت ہی ہوگی۔" بڑی بھابھی نے بھی اندر آتے لب کشائی کی۔ فلزہ نے نظریں جھکالیں۔ اب وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

پورے سال میں جو معرفت اور لذت اسے رمضان میں ملتی ہے وہ پتا نہیں نئے رشتوں میں ملتی بھی ہے یا نہیں 'لیکن امی بھی فیصلہ کر چکی تھیں ـــ اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں تھی لہٰذا ہمیشہ کی طرح اس نے بڑوں کے اس فیصلے پر بھی سر جھکا دیا۔

۞ ۞ ۞

ڈر 'خوف' گھبراہٹ اور بہت ساری خوش گمانیوں کے ساتھ فلزہ نے اپنے نئے گھر میں قدم رکھا۔ جب تک نکاح نہیں ہوا تھا تب تک ڈر اور خوف ہی پھن پھیلائے رہا جونہی نکاح کے کاغذات پر اس نے اپنے دستخط ثبت کیے ایک دم ہی دل کی کیفیت بدل گئی۔ سکون اور محبت بھرے جذبات کے ساتھ اس نے پہلی دفعہ اپنے شریک حیات کے بارے میں سوچا۔

ڈاکٹر محمد جواد رضا۔

اس کی تمام سوچوں کا مرکز و محور اب جواد کی ذات تھی ـــ رخصتی کے وقت اس کے بھی وہی جذبات تھے جو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں تاہم سسرال میں پہلا قدم رکھتے وقت وہ رب سے برکتوں اور رحمتوں کے حصول کے لیے راز و نیاز کرنا نہ بھولی عشا کی نماز کے فوراً بعد اسے اس کے کمرے میں بھجوا دیا گیا۔

پانچ منٹ 'دس منٹ 'بیس منٹ 'یہاں تک کہ انتظار کرتے کرتے اسے اونگھ سی آئی تھی جب کمرے کا دروازہ ناک ہوا اور بھاری مردانہ آواز میں السلام علیکم کی آواز سنائی دی۔

اپنے سینے میں دھڑ دھڑ کرتے دل کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" کیا کہا گویا دبستان کھل گیا ـــ صبح فجر کی نماز کے لیے جاتے ہوئے جواد اسے سحری بنانے کا مشورہ دینا نہ بھولا۔

ناشتے کے لیے تیار ہوتے ہوئے دلہن بن کر ہال میں پہنچ کر وہ کسی کو نہ بھی بتاتی تو بھی اس کے چہرے پر پھیلے رنگ ہی بتا دیتے کہ دولہا بھائی بہت اچھے ہیں۔

۞ ۞ ۞

شادی کے بعد تین ہفتے پر لگا کر کیسے گزرے اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ بھرا پرا گھرانہ مہمان نوازی کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ گھر کے افراد کو مصروف رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اوپر سے جواد کی چلبلی فطرت 'ہر وقت مصروف رہنے اور رکھنے والا بندہ ـــ اسے تاریخ تو کیا دن بھی یاد نہ تھے۔ ہاں جمعہ کے دن گھر کے افراد جمعہ کے لیے سفید لباس اہتمام سے پہنتے تو یاد آتا کہ آج جمعہ ہے۔ انہی دنوں میں امی کا فون آیا۔

"مبارک ہو بھئی ہماری سیٹ کنفرم ہوگئی ہے۔ آج سے چھ دن بعد کی 'تیسرے روزے کو جانا ہے۔ تم اگر نہ آسکو تو میں اور تمہارے ابو خود ملنے آجائیں گے۔"

فلزہ کے دماغ کی سوئی بس آج سے چھ دن بعد تیسرے روزے پر اٹکی ہوئی تھی۔ رمضان آگیا۔ مجھے پتا

ہی نہ چلا۔ خوشیوں میں ہنڈولے لیتا دل ایک دم بھر ندامت میں ڈوب گیا۔ واقعی شادی کے بعد سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اسے تو اپنی سابقہ زندگی کے تمام روزے یاد آرہے تھے جن کی تیاری وہ دو ماہ قبل کر لیتی تھی۔ رمضان کے روزے رکھنے کا اس کا اپنا ہی انداز تھا۔ ہر روز وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ گزارتی۔

رمضان میں اس کا ٹارگٹ صرف ایک ہی ہوتا تھا اور وہ تھا تربیت و تزکیہ۔۔۔ اس کے لیے وہ پہلے صفحہ سے قرآن کھولتی ہر آیت کا مطلب اور آج کے دور میں اس پر عمل کیسے ہو کے تحت وہ کئی کئی گھنٹے مغز ماری کرتی۔۔۔ کبھی سیرت کی کتب اور صحابہ کرام کے مفصل حالات زندگی کے مطالعے میں گم ہو جاتی۔ سب سے بڑی فکر اسے اسی بات کی ہوتی تھی کہ ایسا نہ ہو جب وہ دنیا سے جائے تو اس کے سینے میں حسرتیں ہی حسرتیں ہوں۔

ہائے یہ بھی کرنے کا کام تھا جو رہ گیا' رب سے تعلق تو یوں بھی مضبوط ہو سکتا تھا۔ یہ بری عادتیں کس طریقے سے چھوٹ سکتی تھیں۔ اس معاملے میں اس کا نقطہ نظر بہت واضح تھا۔ اس نے پڑھا تھا کہ جمناسٹک کے کھلاڑی کو پہلے دن "بیک ورڈ بینڈ" کے طور پر ہاتھ کی انگلیاں پیچھے کی طرف کرنے کا کہا جاتا ہے جو اس کو ناممکن لگ رہی ہوتی ہیں۔ پھر وہی جمناسٹک کا کھلاڑی ـــــ جب اس کی تربیت مکمل ہوتی ہے تو انگلیاں تو ایک طرف وہ اپنے سر کو بھی پیچھے کی طرف جھکا کر کمر سے نکال لیتا ہے۔۔۔ اگر جسم کے اعضا میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے مسلسل تربیت اور پریکٹس سے جسم کے ہر عضو کو موڑا جا سکتا ہے تو انسانی رویے کو کیوں نہیں بدلا جا سکتا؟ اس کے لیے بھی مسلسل تربیت تزکیہ اور پریکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا دس بارہ سال قبل رمضان میں اس نے اصلاح کے لیے جو عادت بد منتخب کی۔ وہ غیبت تھی۔ عورتوں کی مشہور و معروف بیماری جو شب معراج بھی لوگوں کے چہروں کو تانبے کے ناخنوں سے کھرچتے دکھائی دی تھی۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ عادت چھوڑنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس نے پورے تیس دن غیبت چھوڑنے کی پریکٹس کی۔ گھر میں یا اسکول کالج میں جہاں یہ برائی ہو رہی ہوتی۔ وہ ناک پر رومال رکھ لیتی۔۔۔ اور کہتی "گوشت کی بو آرہی ہے۔"

غیبت کرنے والے اگر عمر میں اس سے بڑے ہوتے تو بحد درجہ احترام کرتے ہوئے حکمت کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیتی۔

عام بول چال حالات میں اس نے اس برائی کے متعلق اتنا کچھ پڑھ رکھا تھا کہ گھن آتی تھی۔۔۔ بات بڑی بہت جو سننے کی تھی۔۔۔ اور پھر پورے تیس دن کی پریکٹس نے اس کے اندر سے یہ برائی دور کر دی۔

استغفار کے عشرے کو وہ گناہوں کی فہرست بنا کے اور پھر معافی تلافی کر کے مناتی۔ پورا سال کس کس کی دل آزاری کی' آنکھ سے کیا غلط دیکھا' کانوں نے غیبت چغلی کب کب سنی' پاؤں کہاں کہاں غلط چلے کے' کتنے' زبان سے کتنا شمار کرتے کرتے تو وہ رو پڑتی۔۔۔ جوں جوں خطائیں یاد کرتی جاتی' آنسو بہتے رہتے۔

کبھی وہ شکرانے کا ہفتہ مناتی۔۔۔ نعمتوں کی فہرست بناتی۔ ایک ایک نعمت یاد کرتی اور صفحات کے صفحات کالے کر دیتی۔۔۔ کہیں بارش کی رم جھم نعمت نظر آتی تو کہیں دوست احباب' کبھی جسنی روٹی اور ٹھنڈی ٹھار کسی نعمت ہوتی تو کبھی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں نعمت عظیم نظر آتیں۔ کبھی عبد اور معبود کے رشتے پر غور کرتی تو تعلق صرف دعا کا ہی نظر آتا۔ پھر کیا تھا کئی کئی دن وہ دعاؤں میں مگن رہتی۔ لمبی لمبی مسنون دعائیں تھوڑی دیر میں یاد کر لیتی۔ یہی بات مست دلاتی کہ دعاؤں کے یہی الفاظ ہوتے ہوں گے۔ جو چودہ سو سال قبل محبوب خدا

کے لبوں پر ہوتے ہوں گے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کی ہر دعا اسے یاد تھی۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ان دعاؤں کی کرامات تھیں کہ وہ ہر آفت سے محفوظ اور ہر دل کی دھڑکن تھی۔

کسی رمضان میں وہ اپنے اردگرد کے محتاجوں ملازموں کی فہرست بناتی اور دادی اماں، نانی، پھوپھو سے رقم جمع کر کے ضرورت کی اشیا ان تک پہنچاتی ہسپتالوں میں یخنی، کھچڑی، کیلے تو رمضان کے علاوہ بھی ثواب دارین سمجھ کر لے جاتی تھی۔

یہ چھوٹی موٹی کوششیں تھیں جو شاید بارگاہ الٰہی میں مقبول ٹھہریں کہ سال کی تین سو پینسٹھ راتوں میں سے رمضان کی آخری طاق راتیں۔ اور ان پانچ طاق راتوں میں سے ایک رات اور اس ایک رات میں سے پورے سال کا جو ہر اللہ نے اسے عطا کیا جسے دنیا لیلۃ القدر کی گھڑی کہتی ہے۔۔۔! انوار و تجلیات کے چند چھینٹے اس کے دل پر بھی پڑے۔ اوپر والے کے کرم سے وہ بھی اس گھڑی میں مالا مال ہوئی۔ بس پھر کیا تھا قلزہ کا اللہ سے تعلق اور مضبوط ہو گیا۔

رمضان اور قلزہ دونوں لازم و ملزوم ہو گئے۔ رب کو راضی رکھنے کے ایسے ایسے طریقے رمضان میں اس کے من میں آتے کہ دوسرا دیکھتا رہ جائے۔ بے نیاز ہو کر ان پر عمل کے لیے کمر کس لیتی۔۔۔ ہر نعمت پر شکرانے کے نوافل ادا کرتی۔

اور اب اب۔۔۔ قلزہ نے جھرجھری سی لی۔ اب یہی یاد نہیں کہ تین دن کے بعد رمضان شروع ہے۔۔۔ لیجیے خوب ہوئی۔ رونے کا شغل جاری تھا کہ قلزہ کی نند قدسیہ اندر آئی۔

"ہائیں بھابھی! آپ کو کیا ہوا؟ آپ رو رہی ہیں؟؟"

قلزہ نے آنسو پونچھے۔

"ہاں اصل میں مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ تین دن کے بعد رمضان شروع ہو رہا ہے۔ تو یہ سوچ کر مجھے رونا آ گیا کہ میں اتنی بھلکڑ ہو گئی ہوں! ہمیں تو روزوں کا بہت پہلے سے اہتمام شروع کر دیتی تھی۔۔۔"

"سچ بھابھی پھر تو بہت مزہ آئے گا۔ ہمارے ہاں بھی روزوں کا بہت اہتمام ہوتا ہے۔ جواد بھائی کو پالک کے پکوڑے پسند ہیں۔ مجھے آلو والے پکوڑے، مریم کو بینگن کے پکوڑے۔۔۔ راضیہ ورقی سموسے بہت اچھے بناتی ہے آلو میں چکن اور انار دانہ مکس کر کے۔ آپ یقین کریں اس طرح کے پکوڑے پورا رمضان روزانہ ہی بنتے ہیں۔ ابو کو نہ پالک کے پکوڑے پسند ہیں نہ بینگن کے، پتا ہے وہ کون سے پکوڑے بنواتے ہیں؟ انڈوں کے۔۔۔ ابلے انڈے پر بیسن لگا کے خاص پکوڑے بنتے ہیں۔۔۔ بہت مزے کے اور اس سے بھی مزے کی بات یہ کہ ہر طرح کے پکوڑوں کے لیے چٹنی بھی الگ الگ۔۔۔ ابو املی کی چٹنی کے ساتھ انڈوں کے پکوڑے کھاتے ہیں۔۔۔ جواد بھائی پالک کے پکوڑوں کے ساتھ انار دانے کی چٹنی بنواتے ہیں، مریم بینگن کے پکوڑوں کے ساتھ پودینے کی چٹنی لیتی ہے اماں بے چاری بارہ بجے ہی افطاری کی تیاری میں مصروف ہو جاتی ہیں۔"

قلزہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا کیسے اور کیا نہ کیے اللہ کی رحمت اور مغفرت پر، جنت کی بشارتوں پر پکوڑے کیوں غالب آ گئے؟ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا۔

"قدسی یہ تو پھر پکوڑوں کا مہینہ ہوا۔"

"ہاں تو دادا ابا شوگر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے سب سے زیادہ پکوڑے وہی بنواتے ہیں اجوائن ڈال کے۔ ابا کہتے ہیں رمضان میں دسترخوان وسیع کرنا چاہیے۔ اللہ راضی ہوتا ہے۔ ابا تو آلو، پیاز، بیسن بھوبوریاں بھر بھر کے سامان ڈلواتے ہیں۔۔۔ بکرا تو بیچارہ رمضان سے ایک دن پہلے ہی فریزر میں پہنچ جاتا ہے۔ اصل میں رمضان میں ہمارے ہاں رات کو سویا نہیں جاتا۔ تایا ابو ان کی فیملی سے اسکائپ پر بات کرتا ہوتی ہے۔ عظمیٰ آپی نیویارک ہوتی ہیں وہ بھی باقاعدہ اسکائپ پر آتی ہیں اور پکوڑوں سموسوں سے سجا دسترخوان دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔ تب ابو تو بتا

ہی ہے کہ جب انسان رات کو جاگتا رہے تو کتنی بھوک لگتی ہے "کیا آپ کے ہاں رمضان ایسے نہیں گزرتا؟" لمبی گفتگو کے بعد یا آخر سوال کر کے وہ خاموش ہو گئی۔

"نہیں بھئی ہمارے ہاں تو پہلے دودھ سوڈے کی بوتل کے ساتھ پھر فروٹ چاٹ کھجوریں تو موجود ہوتی ہی ہیں۔ تراویح کے بعد سادہ سا کھانا۔۔۔" فلزہ نے اطمینان سے کہا۔

"تو پھر بھی آپ لوگ۔۔۔؟" قدسیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

"آپ رات کو نہیں جاگتیں؟"

"جاگنے کے لیے کھانے کی شرط نہیں میں تو خود ساری رات جاگتی ہوں۔" اب فلزہ۔۔۔ سنبھل چکی تھی۔۔۔ نئے گھر نئے لوگ نئے رشتوں میں رمضان میں کچھ نیا۔ اس کے ذہن میں بھی آرہا تھا۔ اس لیے وہ بہت مطمئن تھی۔۔۔ اٹھ کے دوائی کے بار جانے کی تیاری کرنے لگی۔

رمضان کی پہلی رات بھی آگئی۔ اب فلزہ پہلے والی فلزہ تھی۔ جواد کو اس نے پلان میں شریک کرنا چاہا۔ اس نے پہلے تو کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"نہ بابا نہ۔۔۔ سب سے زیادہ چٹور الاور خوش خوراک تو میں ہی ہوں تمہیں کیا پتا سارا سال مجھے رمضان اور سحری کا شدت سے انتظار رہتا۔۔۔ میں کیسے سب کے سامنے منہ بھر کے کہہ دوں بھئی فلزہ میری تو طبیعت ٹھیک نہیں میرے لیے سادہ سا کھانا بنانا۔" پھر فلزہ کی روہانسی صورت دیکھ کر وہ بھی مان گیا۔

"اف۔۔۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔۔۔ ہم بھرپور تعاون کی یقین دہانی کراتے ہیں۔" حکمرانوں کے سے انداز میں اس نے ہامی بھری۔

"شکریہ۔۔۔ جب آپ میرے جیسے رمضان گزاریں گے پھر آپ کو پتا چلے گا کہ رمضان کو نیکیوں کا موسم بہار کیوں کہتے ہیں۔ بھلا بھرے پیٹ بھی کبھی معرفت کی باتیں سوجھی ہیں؟ بھرے شکم کے ساتھ قیام ہو سکتا ہے؟ تدبر اور تفکر تو فاقوں کا راستہ تھا! علم اور نور کا سمندر تو وہاں غور و فکر سے۔۔۔ بہہ نکلا تھا ورنہ صادق اور امین تو مکہ والوں نے بھی کہہ رکھا تھا!" فلزہ بڑے جذب سے بولی۔

جواد بس فلزہ کو دیکھتا ہی رہا۔ اس کی چمکتی رنگت کو وہ فیشل اور کلینزنگ کی برکات سمجھتا آیا تھا یہ تو اسی نور کا ایک چھینٹا تھا۔

"اور آپ نے بیچ چوراہے میرا بھانڈا نہیں پھوڑنا کہ میں نے آپ سے کہا ہے کہ میرے لیے کوئی خاص اہتمام نہ کیا جائے۔" فلزہ نے کہا۔ "قسم سے رمضان کے بعد جو کہیں گے بنا دیا کروں گی" اصل میں بروقت چولہے کے آگے رہ کر رمضان ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

"توبہ توبہ میری مجال۔۔۔" جواد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے۔ "جو کہو گی ویسے ہی کروں گا۔"

✲ ✲ ✲

پہلے روزے کے قیمتی چھ سات گھنٹے گھر کے مکینوں نے سو کر گزار دیے تھے۔ لمبی نیند کے بعد سب سے پہلے انگڑائیاں لیتے ہوئے جواد کمرے سے برآمد ہوا۔۔۔ وہ ٹھٹک کر رکا۔ اس کے قدم وہیں تھم گئے۔ سفید پرنٹ کے سوٹ میں سفید دوپٹے سے سر ڈھانپے فلزہ نے قرآن ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ قریب ہی لیپ ٹاپ پر قاری مشاری راشد کی تلاوت والی سی ڈی چل رہی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد ابا باہر آئے۔ ان کے لیے بھی یہ حیرت انگیز تھا وہ کشن لے کر وہیں لیٹ گئے۔ پھر قدسیہ امی دادا ابا بھی آگئے۔

"واہ بھئی دلہن نے تو رمضان کا سماں باندھ دیا۔" دادا ابا نے کہا۔

"ہم تو خود روزانہ ایک پارہ پڑھتے ہیں لیکن اس طرح سنا کبھی نہیں۔" ابا نے کہا۔

"لیکن اچھا لگ رہا ہے۔"

باتوں اور ہلچل کی وجہ سے فلزہ سی ڈی بند کر چکی

تھی۔ قرآن مجید کو ریک پر رکھتے ہوئے اس نے بڑے ادب اور احترام سے کہا۔

"دادا ابا! رسول اللہ سارا سال قرآن خود پڑھتے تھے لیکن رمضان میں ہر سال جبرئیل امین سے سنا کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے بعض اوقات پڑھنے سے زیادہ سننا محبوب اور مسنون عمل بن جاتا ہے۔"

"ارے واقعی۔" دادا ابا حیرانی سے بولے۔

"امی آج افطاری میں کیا بنائیں؟" قدسیہ نے موضوع بدلا۔

"بھئی میرے لیے تو کوئی خاص اہتمام نہ کرنا۔۔۔ کیوں کہ شادی اور دعوتوں کے کھانے کھا کھا کر اب میرا پیٹ یہ سب برداشت نہ کرے۔" بہت اداکاری سے جواد نے کہا۔

"سوچ تو میں بھی یہی رہی ہوں' تلی ہوئی چیز نہ ہی کھاؤں۔" امی نے چند دن پرانی معدہ کی تکلیف کی وجہ سے کہا۔

"میں بھی سوچ رہی تھی کہ تلنے تلانے والا کام رمضان میں کم ہی کرنا چاہیے معدہ پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔" فلزہ نے پرجوش ہو کر کہا۔

"لیکن رمضان میں اللہ جی نے کہا ہے دستر خوان وسیع کرو۔" ملازمہ نے بھی دخل اندازی کی۔ اس گھر کے وسیع دستر خوان کی وجہ سے بے چاری کئی نت نئی اشیا لے جاتی تھی۔

"دستر خوان وسیع کرنے کا مطلب آلو' بینگن' پالک' گوبھی اور چکن کے پکوڑے نہیں ہے شمو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ رمضان میں تم جو بھی بناؤ وہ زیادہ مقدار میں بناؤ اور ان لوگوں تک پہنچاؤ جو سارا سال ترستے ہیں۔" فلزہ نے نرمی سے کہا "جن بیچاروں کو پتا ہی نہیں کہ آلو والے سے اوپر بھی کچھ بن سکتا ہے۔"

"ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" امی نے کہا۔ "اس طرح کے پکوڑے بنا کے طبیعت ویسے ہی ادبدا جاتی ہے۔ اور رمضان تو دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا کہتا ہے۔"

فلزہ کی آنکھوں میں چمک آگئی "امی جان! فروٹ چاٹ تو کھا سکتی ہیں ناں؟"

"ہاں دیکھ لو۔۔۔ بھئی بیماری تو نہیں۔" امی نے اجازت دی۔

قدسیہ اور فلزہ افطاری کے لیے ظہر کی نماز کے بعد سے ہی کچن میں گھس گئیں۔ قدسیہ نے نوٹ کیا کہ فلزہ بس کچھ نہ کچھ پڑھ رہی ہے۔ آنسو پونچھ رہی ہے۔ خود بخود مسکرا رہی ہے۔ انہی جھمیلوں میں عصر کی نماز پڑھی گئی۔ اور افطاری کا وقت قریب آگیا۔ قدسیہ نے لپک جھپک دستر خوان لگایا۔

"واؤ۔۔۔ امی کی چٹنی شکل سے تو اچھی لگ رہی ہے۔" جواد نے کہا۔

"بس آلو۔۔۔ پکوڑے فروٹ چاٹ اور بھلے۔"

دیکھتے ہی ان کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں۔

سب لوگ ڈشوں میں موجود اشیا کے معائنہ میں مصروف تھے جب اچانک۔۔۔ بالکل غیر متوقع طور پر فلزہ نے کہا۔

"دادا ابا! روزے دار کی دعا اللہ کبھی رد نہیں کرتا۔ آپ دعا کروائیں گے۔" دادا ابا گڑبڑا گئے۔

"ہم۔۔۔ میں' بھئی میں تو مریض بندہ ہوں روزہ ہی نہیں رکھا۔ ایسا کرو تم خود ہی دعا کرواؤ۔ ہم بھی شریک ہوتے ہیں۔"

ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر فلزہ نے ہاتھ اٹھائے۔

پانچ منٹ اور چھبیس سیکنڈ میں اس نے اپنے رب سے کیا کیا نہ مانگ لیا۔ رحمت' ہدایت' مغفرت' جنت' عافیت' برکت۔۔۔ لفظ اس کے اپنے تھے تاثیر اوپر والے نے ڈال دی۔ روزہ کھلنے کے سائرن کی آواز پر جب اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا تو نہ صرف اس کے اپنے ہاتھ آنسوؤں کی نمی سے گیلے ہو رہے تھے بلکہ باقی سب بھی ٹشو سے منہ صاف کر رہے تھے۔

پھر اس کے بعد اس نے دیکھا کہ روزہ کھلنے کے بعد کم ہی بات ہوئی' بقول جواد اور قدسیہ کے ساری ساری رات لذت طعام کا تذکرہ جاری رہتا وہ صورت

مل نہ تھی۔ موذن نماز پڑھ کے آئے تو قلزہ کھانے کے لیے دسترخوان لگا چکی تھی۔ یخنی پلاؤ، راستہ، کدو گوشت اور تازہ تازہ پھلکے۔

"بہت مزے کا ہے۔" کمہ کر سب نے انصاف کیا۔

جب سب تراویح کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ دادا ابا نے جیب سے کڑکڑاتا ہوا نیلا نوٹ نکال کے اس کے حوالے کیا۔

"مرے بچی! ہمیں تو پتا ہی نہ تھا کھانوں کی لذت پر مانگنے کی لذت کیسے غالب آتی ہے۔ کل سے ہم بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کے سی ڈی پر قرآن سنا کریں گے۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور یہ نوٹ تمہارا چھوٹا سا انعام ہے۔ اچھی ماں کی بیٹی ہو جس نے رب سے مانگتے ہوئے ہمیں بھی مانگنے کا ہنر سکھا دیا۔"

قلزہ کا پورا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"دادا ابا میں نے ایک پروگرام میں سنا بھی تھا اور حدیث مبارکہ بھی پڑھی تھی کہ رمضان میں جب لیلتہ القدر کی وہ مخصوص گھڑی ہوتی ہے تو اس وقت جو شخص بھی اللہ کو یاد کر رہا ہو خواہ قیام میں ہو یا ذکر اذکار میں تو اس سے جبرئیل امین مصافحہ کرتے ہیں دادا ابا! جبرئیل امین۔ جن کی آمد کا سلسلہ وصال نبی اکرم کے بعد بند ہو گیا تھا۔ اس کی علامتیں بھی بتائی گئی تھیں کہ مانگنے والے کے خوف خدا سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' آنکھوں میں پانی آجاتا ہے' اردگرد کے ماحول پہ سکینت طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت جبرئیل امین مصافحہ کرتے ہیں۔"

دادا ابا گم صم سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

"بیٹا جو پورا سال رب کی بارگاہ میں حاضری کا شرف فجر کی نماز سے پہلے پاتا ہے۔ رب سے راز و نیاز کرتا ہے' پورا سال کوششوں میں رہتا ہے' اسے ہی یہ نعمت ملتی ہوگی ہم جیسوں کو کہاں؟"

"لیکن دادا ابا مجھے تو۔" یک دم قلزہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ کہیں اپنی کیفیت اور انعام کا ذکر ریاکاری میں تو نہ آجائے گا۔ لیکن دادا ابا سب سمجھ گئے۔ وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رو رہے تھے۔ جب اچانک ہی قلزہ کی نظر دروازے میں کھڑی قدسیہ پر پڑی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔

"قلزہ بھابی واقعی! کیا سچ مچ آپ کو لیلتہ القدر ملی تھی؟" قلزہ کی آنکھوں سے اب جیسے سوتے پھوٹ پڑے۔

"قلزہ بھابی۔ کیا مجھے لیلتہ القدر مل سکتی ہے؟" بے یقینی سے قدسیہ نے کہا۔ قلزہ بے ساختگی سے بولی۔

"کیوں نہیں۔ ؟ اگر تم بھی رمضان رب کو راضی کرنے کا مہینہ سوچ کر مناؤ۔"

"تو پھر سب۔ انشاء اللہ میں بھی آج رات کو آپ کے ساتھ تراویح پڑھنے جاؤں گی۔ قرآن ترجمے سے پڑھوں گی۔ اور۔ اور" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں بھی سموسے پکوڑوں کے بجائے رب کی معرفت کی لذت پاؤں گی۔"

دادا ابا بہت حیرانی سے اس کا مکالمہ سن رہے تھے اور قلزہ کو لگ رہا تھا آج اس کی وہی کیفیت ہے۔ جو دس سال پہلے تھی جب لیلتہ القدر کی بابرکت گھڑی ملی تھی۔ جب اس کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اس کی عبادتوں ریاضتوں کو قبولیت کا اوپر والے نے سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ انوار و تجلیات کی جھلک دکھائی تھی۔ آج "آج اس زمین پر اس کے بندوں نے اس کی کوششوں کو سراہا۔ کیا یہ لیلتہ القدر سے کم نہیں۔ پھر اس کے بعد کا منظر دھندلا سا تھا۔

صدف آصف

ڈھل گیا ہجر کا دن

"میم پلیز مجھے آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے۔" انا نے دفتر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت طلب کی' ملاحت نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"جی۔ انا۔ آئیے نا۔ سب خیریت تو ہے؟" ملاحت نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا اور سامنے کھلے لیپ ٹاپ پر فائل کو محفوظ کیا۔

"جی۔ بس وہ ایک بات کرنی تھی۔" انا نے اس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ تو ملاحت نے جلدی سے بکھرا ہوا سارا کام سمیٹنا شروع کیا۔

"ہوں۔ اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟" ملاحت نے دو منٹ بعد ہی اپنی ساری توجہ سامنے کھڑی انا کی طرف مبذول کروائی۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ساتھ گھڑی میں وقت بھی دیکھا۔

آج کا دن اس کے لیے اپنے ساتھ بڑی مصروفیت لے کر آیا۔ پہلے ہیڈز کے ساتھ طویل میٹنگ۔ پھر ایڈمن والوں کے معاملات دیکھنے پڑے۔ ادارے میں ایک نئی اسامی نکلی تھی۔ اس کے لیے قریشی صاحب سے سر کھپایا۔ اب جبکہ اسے تھوڑی ہی دیر بعد میٹنگ کے لیے نکلنا تھا تو انا اپنا مسئلہ لے کر آگئی۔ کئی سالوں بعد اس کی چھوٹی بہن شباہت آسٹریلیا سے اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ وطن لوٹ رہی تھی۔ جانا بھی ضروری تھی۔

"وہ۔ میم۔ اصل میں۔" انا کچھ بولتے بولتے

مکمل ناول



دوبارہ چپ ہو گئی' اچانک اس کی بڑی بڑی دلنشین آنکھیں کھارے پانی سے لبالب بھر گئیں' ملاحت کو اسی بات سے چڑ تھی۔ اس نے زندگی کی تلخیوں سے سبق سیکھا تھا کہ لوگوں کے سامنے آنسو بہانا فضول ہے' کسی کو روتا دیکھ کر دنیا والے اس کی کمزوری بھانپ جاتے ہیں' پھر تاعمر اس کو رلایا ہی جاتا ہے۔

"پلیز انا پہلے تو یہ آنسو پونچھو اس کے بعد مجھے آرام سے پوری بات بتاؤ۔" اس نے ٹشو پیپر کا باکس اس کے سامنے رکھ کر ہمدردی سے کہا۔

"آپ سر غفران کو جانتی ہیں نا؟" انا کے حواس درست ہوئے تو لمحے بھر بعد اس نے الٹا سوال کیا۔ ملاحت نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دیا۔

"غفران..... وہ لڑکا جو ہمارے یہاں اسٹیشن پڑھاتا ہے۔" اسے خاموش طبع اور بے ضرر سا سانولی رنگت والا لڑکا سا یاد آگیا۔

"جی.... میم.... وہی۔" انا نے معصومیت سے سر ہلایا۔

"انا کیا اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے؟" اس نے گھبرا کر فوراً پوچھا۔ اپنے کوچنگ کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ہمیشہ محتاط رہتی تھی۔

"ارے نہیں میم..... جیسا آپ سوچ رہی ہیں ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس انہوں نے مجھے شادی کے لیے پرپوز کیا ہے۔" ملاحت کی بدگمانی دور کرنے کے لیے وہ بات بھی اس کے منہ سے روانی سے نکل گئی۔ جسے بتانے میں اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"او اچھا اگر یہ تو بہت خوشی کی بات ہے' مبارک ہو بھئی' مشتاق کہاں ہے؟" ملاحت نے اطمینان بھرا سانس لیا اس کے موبائل کی تیز رنگ ٹون بجی۔

"مس کالنگ" ملاحت نے اپنا سیل فون اٹھا کر چیک کیا تو اس کے پرانے نمبر سے کال آرہی تھی۔

"اوہ تو جناب کی وطن واپسی ہو گئی ہے۔ اف... اب یہ مسلسل کال کرتا ہی رہے گا۔" وہ اس کی عادتوں سے باخبر تھی۔ انا کے سامنے بات کرنا مناسب نہ لگا۔ اسی لیے اس نے جلدی سے لائن کٹ کر سیل فون کا سوئچ آف کر دیا۔

"جی مبارک باد کا شکریہ مگر میم بات کچھ اور بھی ہے۔" انا کے چہرے سے وہ خوشی مفقود تھی جو ایسے موقع پر لڑکیوں کے چہرے سے پھوٹتی نظر آتی ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ کچھ کنفیوز ہو رہی تھی۔

"اچھا تو... تمہیں غفران پسند نہیں ہے تو پھر انکار کر دو؟" ملاحت نے اس کی ہچکچاہٹ سے اندازہ لگایا۔

"نہیں میم... ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے جیسے گھرانوں میں لڑکے کی شکل و صورت نہیں کمائی اور شرافت پر نظر جاتی ہے اور غفران اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔" انا کی سنجیدہ اور بالغ سوچ نے ملاحت کو خوشی فراہم کی۔

"تم ابھی غفران سے پہلے کی انڈر اسٹینڈنگ ہے جو تم ان کے بارے میں اتنا جانتی ہو؟" ملاحت نے پوچھا۔ یہ سوال کرتی بولا جو اس کی زبان پر آکر رک رہا تھا اسے لگا کہ شاید ایک ساتھ پڑھانے کی وجہ سے اس رشتے میں دونوں کی پسندیدگی شامل ہو گی۔ ملاحت نے برسوں پہلے چند بچوں اور ایک عمارت پر مشتمل "اسٹیپ کوچنگ سینٹر" کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کی شہر میں مزید تین شاخیں کھل چکی تھیں۔ اسی تعلیمی ادارے کی ایک بہت ہونہار ٹیچر تھی انا۔

"وہی تو..... آپ بھی یہی سمجھیں بس اسی سوال سے تو میں ڈرتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ در اصل وہ میرے دور پرے کے کزن بھی لگتے ہیں' بلاوجہ کے اسکینڈل سے بچنے کے لیے میں نے کام کے اوقات میں انہیں یہاں غیر ضروری بات چیت کے لیے منع کیا ہوا تھا۔ پتا نہیں انہیں میری کون سی بات پسند آگئی جو انہوں نے اپنی امی یعنی پھپھو رضوانہ کو کل رشتے کے سلسلے میں میرے گھر بھیج دیا۔" انا نے تفصیل سے بیان کیا۔

"اچھا تو پلیز اب مجھے مختصراً یہ بتاؤ کہ اس رشتے میں قباحت کیا ہے؟ اصل میں مجھے کسی ضروری کام

سے نکلتا ہے۔" ملاحت نے کاغذات دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میم۔۔۔ آپ تو میرے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔۔۔ میں گھر سے کتنی مجبوری کے تحت نکلی ہوں۔ جس دن میں نے پہلی بار گھر سے باہر قدم نکالے تو میرے بیمار اور کمزور بابا نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "بیٹا۔۔۔ اس خاندان کی تم پہلی لڑکی ہو جو نوکری پر جا رہی ہو۔ یاد رکھنا اب ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔" میں نے ان کا مان رکھا' بہت بچ بچا کر اور محتاط طریقے سے اپنے فرائض انجام دیے۔ تب جا کر یہ نیک نامی حاصل ہوئی ہے۔ اب میں نہیں چاہتی میری ساری ریاضت اکارت ہو جائے۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تو ملاحت بھی افسردہ ہو گئی۔

"ہاں۔۔۔ کبھی کبھی انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ خیر اس بات۔۔۔ کا تمہاری شادی سے کیا تعلق بنتا ہے؟" ملاحت نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"جیسا آپ نے سوچا۔۔۔ ویسا ہی ہونا بھی۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کام کے دوران عشق لڑایا ہو گا۔۔۔ یا کیونکہ غفران بھی کہیں پڑھاتے ہیں' اس لیے ان کے ساتھ میرا کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہو گا' میری شخصیت تو سب کی نظر میں محض کالا ہیرو بن جائے گی۔" اس نے جو باتیں کی' ان میں ملاحت کو اپنے ماضی کی بازگشت سنائی دی۔

"ہو سکتا ہے یہ سب تمہارا وہم ثابت ہو کوئی ایسا نہ سوچے۔" ملاحت نے کھوکھلے انداز میں اس کو تسلی کروائی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے' انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ لوگ ان کے بارے میں بولنے سے قطعی بالکل نہیں سوچتے۔ میں نہیں چاہتی یہ طالب علم جو آج مجھ سے نظریں جھکا کر بات کرتے ہیں' کل ان کی آنکھوں میں میرے لیے تمسخر ہو۔" ملاحت نے ہونٹ بھینچے۔ اس کے دل میں درد سا اٹھا۔ ماضی کے دریچے سے جھانکتی ہوئی ملالی الطرقی' زخم ہرے ہو گئے۔

"بس یا اور کچھ؟" اس نے دھیرے سے پوچھا' انا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں کچھ ایسا ویسا نہیں سوچا' دل میں ایک بات آئی تو تم سے پوچھا۔ برا جب ہوتا کہ بغیر کسی تصدیق کے میں تمہارے کردار پر انگلی اٹھاتی۔۔۔ جیسے کہ ہمارے معاشرے میں عموماً ہوتا ہے۔۔۔ خیر ایک بات مجھ پر اعتبار ہے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"جی۔۔۔ میں نے جب ابی سے غفران کے لیے انکار کیا تو انہوں نے اور میری چھوٹی بہن ثنا نے زور دیا کہ مجھے ایک دفعہ آپ سے اس معاملے میں مشورہ کرنا چاہیے۔ ابی آپ پر بہت اعتماد کرتی ہیں اور ظاہر ہے۔۔۔ میں بھی۔۔۔ تب ہی تو یہ مسئلہ آپ کے پاس لے کر آئی ہوں۔ اس لیے بے اعتباری کیسی؟" انا نے افسردگی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ ڈرائیور کہہ رہا ہے کہ دیر ہو جائے گی۔" چپراسی نے آفس کے دروازے پر آ کر اطلاع دی تو ملاحت نے مزید انتظار کرنے کا کہلوایا۔ وہ اس بات کو اب یوں ادھوری چھوڑ کر نہیں اٹھ سکتی تھی' جانا ضروری ہی سہی۔ پر انا کی زندگی سے زیادہ نہیں' وہ پاگل لڑکی خوشیوں بھری دستک کو نظر انداز کرنے جا رہی تھی' اسے سمجھانا ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ ایک اور ملالی تنہائی کا زہر چکھنے کے لیے تیار ہو جاتی۔

"انا میری بات غور سے سنو اگر تم بابا' دنیا والوں کے ڈر سے انکار کر رہی ہو تو یہ بے وقوفی بالکل مت کرنا۔" ملاحت نے کچھ سوچتے ہوئے اسے پیار سے مخاطب کیا۔

"تمہیں کوئی اور اعتراض تو نہیں میرا مطلب اس کی شکل و صورت وغیرہ سے۔۔۔" ملاحت نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اپنی ٹیچر کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

"ارے نہیں' میم ابی ہی جو میرے لیے جس کا بھی انتخاب کریں گے۔ وہی میری ہونے والی پسند بن جائے

گا۔ ویسے بھی جب سے غفران کی امی نے ہمارے حالات دیکھتے ہوئے جہیز لینے سے صاف منع کیا ہے یقین جانیں ان لوگوں کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھ گئی ہے۔ ہاں جو بات مجھے پریشان کررہی ہے وہ یہ ہے کہ میرے جانے کے بعد گھر کا خرچا کیسے چلے گا؟ میری تنخواہ سے گھر کے کافی مسائل حل ہو جاتے ہیں' ابو کی قلیل پنشن میں تو ان لوگوں کا گزارا مشکل ہو جائے گا۔" انا کا خدشہ لوٹ آیا۔

"گڈ۔۔۔ اچھا ہوا تم نے مجھ سے ہر بات شیئر کی۔ اب میں چاہوں گی کہ تمہیں مس گائیڈ نہ ہونے دوں امید کرتی ہوں تم بھی میرا مان رکھو گی۔ سب سے پہلے تو تم "دنیا کیا کہے گی" والی بات کو اپنے دماغ سے نکال کر شادی کے لیے ہاں کردو کیونکہ اگر دنیا کی پروا کرنے بیٹھ جاؤ گی تو جی بھی نہ سکو گی۔" ملاحت کا شیریں انداز انا کے دل پر اثر انداز ہونے لگا۔ مگر وہ پھر بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"تھینکس میم۔۔۔" انا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"یہ اگر مگر لیکن پر۔۔۔ ایسے لفظ ہیں جو بلاوجہ جواز کھڑے کردیتے ہیں۔ بنتے بنائے کاموں کو بگاڑنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

مجھ سے وعدہ کرو تم اللہ پر بھروسا رکھو گی۔ قدرت نے اگر تم پر اتنا کرم کیا ہے تو اس کو نظر انداز کرنے کی غلطی بالکل مت کرو۔ ایک پر مسرت زندگی تمہارا انتظار کررہی ہے۔" ملاحت نے اسے سمجھایا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔" انا بے ساختہ بولی۔

"اچھا میم آپ جائیں کہیں آپ کو دیر نہ ہو جائے۔" اس نے مسکرا کر یاد دلایا۔

"ہاں۔۔۔ دیر تو ہو ہی گئی ہے۔" ملاحت کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ اس نے اپنا براؤن قیمتی لیدر بیگ کاندھے پر لٹکایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ انا نے اس کی تقلید کی' چپڑاسی نے ملاحت کا لیپ ٹاپ اٹھایا اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ "کیا کمی ہے میم میں۔۔۔ عمر بھی زیادہ نہیں ہوگی۔ پتا نہیں ان کے کیا مسائل ہیں۔ جو تنہا زندگی گزار رہی ہیں؟" انا کی نظریں ملاحت کا پیچھا کرنے لگیں' اسکن کرتا' براؤن جینز پر بہت جچ رہا تھا۔ اس نے بڑی نفیس شال اوڑھی ہوئی تھی۔ کوریڈور میں سر جھکائے چلتے ہوئے وہ حسن کی اداس مورت لگی۔

"تم۔۔۔ میری بات کا مان رکھنا غفران اچھا لڑکا ہے' کسی کی وجہ سے اپنی زندگی میں قدم نہ رکھو کہ تمہارے پاس سوائے تنہائی کے کچھ نہ بچے۔ کسی بھائی' بہن یا والدین کے ڈر سے انکار مت کرنا' اس بات پر یقین رکھنا کہ رزق دینے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔ اگر ان کی قسمت میں نہ ہو۔۔۔ ہمارے تمہارے اختیار سے باہر کی بات ہے کہ ہم کسی کو ایک وقت کا کھانا بھی کھلا سکیں۔ اگر قسمت ہوگی تو وہ لوگ بھوکے نہیں مریں گے۔ مسبب الاسباب خود ہی سبب بنادے گا' کیونکہ رزق دینے کا وعدہ تو اس کا ہے۔" ملاحت نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اسے ایک بار پھر سمجھایا۔

"جی۔۔۔ میم یہ تو حقیقت ہے۔" انا نے دھیرے سے کہا۔ وہ ذرا ڈرائیور کی وجہ سے بات کرتے جھجک رہی تھی۔ "اللہ حافظ" کرتی وہاں سے فوراً ہٹ کر دور جا کھڑی ہوئی۔

"اپنے بھائی کو میرے پاس بھیج دینا۔ اس کی تعلیم کا خرچا اٹھانے کے ساتھ میں۔۔۔ اسے یہاں کی نوکری بھی رکھ لوں گی۔" کچھ سوچ کر گاڑی سے اتر کر اس کے قریب پہنچ کر خوش خبری دی' وہ کھل اٹھی۔

"میم شکریہ۔۔۔ آپ کے پرخلوص انداز اور محبت بھرے عمل نے مجھے صحیح فیصلہ کرنے کے لیے نئی توانائی بخش دی۔" تشکر سے انا کی آنکھیں بھر آئیں۔

ملاحت نے گاڑی میں بیٹھتے ہی گلابی ہوتی آنکھوں کو براؤن گلاسز کی اوٹ میں چھپایا' چہرے پر سرد مہری کا دبیز غلاف چڑھایا اور بے تاثر نگاہ باہر کے نظاروں میں کھو گئی۔

اس کا سایا ایک [illegible] سے بچنے لگا تھا

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی آن کیا تھا۔ "انس کالنگ" اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔ ملاحت۔ کیسی ہو؟" انس کی گمبھیر نرم توانا نے اس کے بے چین دل کو قرار بخشا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟" وہ زیرِ لب مسکرا کر بولی۔ ملاحت کی آواز سن کر انس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

"ہاں۔ ہاں۔ جی رہے آپ کی یادوں کے سہارے۔" وہ حسبِ عادت شروع ہوا۔

"اچھا۔ کام کی بات کریں۔" ملاحت نے کن انکھیوں سے ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے ٹریک پر واپس لانا چاہا۔

"کام کی بات سے مطلب؟ تم سے ملنا ہے۔" انس نے جو لیس جمائی۔ وہ ویسے کا ریسا ہی تھا۔

"اچھا۔ آج تو۔ شاہت امریکہ سے واپس آ رہی ہے' فری ہو جاؤں تو کال کر کے بتاتی ہوں۔" ملاحت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید اصرار کرتا فوری طور پر رابطہ منقطع کر دیا۔ انس کو گئے کئی سال گزر چکے تھے۔ اس کے پاس جو اعتبار ہے بھولا نہیں تھا۔ اس کے گریز کے بعد وہ ایسے ہی فون پر اس سے رابطہ قائم رکھا۔ اور ہر سال ملاحت کی برتھ ڈے پر وِشنگ کارڈ کے ساتھ پھول بھیجتا رہا یہاں تک کہ ملاحت نے بھی اعتبار سے بھی رابطہ قائم رکھا۔ اس کے خلوص میں کوئی شک نہ تھا پر ملاحت کو اپنی ذمہ داریوں کا خیال تھا۔

"پلیز۔ انس میرے پیچھے آکر کیوں اپنا رستہ کھوٹا کرتے ہو۔ ماں کی نافرمانی کر کے گناہ گار بن رہے ہو۔ وہیں کوئی اچھی لڑکی ڈھونڈ کر شادی کر لو۔" ایک دن انس کا فون آیا تو وہ سمجھانے لگی۔

"جس۔ دن تمہاری شادی ہو گئی' یقین جانو اس کے دوسرے دن میں بھی شادی رچالوں گا' چاہے میری اماں کسی بھی لڑکی کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیں۔ پر جب تک سانس ہے' تب تک آس ہے' تمہاری ہاں کا انتظار کروں گا۔" انس کی گمبھیر آواز' سچا لہجہ آج بھی ملاحت کے کانوں میں گونجتا تھا۔

"منہ دھو رکھو۔ وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔" وہ شرارت سے بولی پر اس کی روح تک سیراب ہو گئی تھی۔ انس کی یہی باتیں تو ملاحت کو معتبر کرتی تھیں۔

"اف۔ چلو۔ اب میری باتوں پر سیریس نہ ہو جانا۔ یاد رکھنا شادی تو تمہاری ہو گی' پر میرے ساتھ۔" اس کا استحقاق اور جان دار لہجہ۔ وہ مسکرا

دی۔ پرانی باتیں یاد کر کے اس کی آنکھ بھر آئی۔ اس نے گلاس ڈاؤن کر کے گلابی ٹشو سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

آدم خان چونک۔ آج پرسکون ندی جیسی بی بی جیسے دریا کی موجوں کی طرح بے چین اور بپھری ہوئی لگ رہی تھیں۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" اس نے سر جھٹک کر ساری توجہ گاڑی چلانے پر مرکوز کر دی۔

☼ ☼ ☼

"ہرے غضب۔ یہ بال ہیں کہ جنجال بھلا بتاؤ زنجیر ایسی پھنسی ہے کہ نکل کر نہیں دے رہی۔" آمنہ خالہ نے زچ ہو کر لالی کو پکارا۔ ملائی سر جھکائے جھکائے مسکائی۔ اس کے بال تو پورے خاندان میں مشہور تھے' لمبے' گھنے' کالے' خوب صورت بال جنہیں وہ ہمیشہ باندھ کر رکھتی کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔

"اے لو۔ بی بی یہ کیا کیا؟ دیکھو تو ذرا کیسی بدشگونی ہو گئی' پہلی دفعہ میں ہی گرہیں پڑ گئی۔" ملاحت کی ہونے والی ساس نے دل پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی تو ارد گرد بیٹھی ہوئی جاننی ہے انہیں' مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے فرشی نشست کا انتظام کیا تھا۔ گاؤ تکیوں اور فلور کشن پر میرون رنگ کے کور چڑھا کر ملائی نے ہر کونے پر رکھ دیے تھے' اکرام کیا تھا۔

"میری بچی کی خوشیوں کا معاملہ ہے' اے اللہ۔ اپنا کرم فرما۔" اربع بیگم گھبرا کر ان کے پاس پہنچیں اور جلدی جلدی کھینچ کھانچ کر الجھ جانے والی نفیس سی سونے کی چین بالوں سے نکالی' جو آمنہ بڑے ارمانوں

سے اپنی ہونے والی بہو کو پہنانا چاہ رہی تھیں۔

آمنہ نے اچھے طریقے سے ملاحت کی سلیقہ مندی اور بھولے بھالے مزاج کو جانچا' پھر یہ فیصلہ کیا۔ گو کہ حسن کے مقابلے میں ملائی کی رنگت کچھ دبی دبی سے تھی' پر انہوں نے اس کی سیرت کو ترجیح دی۔ اسی لیے دوست کو زبانی طور پر پہلے ہی عندیہ دے دیا تھا۔

آج وہ مٹھائی کے ٹوکرے اور تینوں بیٹیوں کے ساتھ ملاحت کا باقاعدہ رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ ارفع کے پیر تو زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ البتہ عرفان صدیقی ایسی جلد بازی سے پریشان ہو گئے۔

"اتنی جلد بازی مناسب نہیں۔" دبے لفظوں میں ارفع کو سمجھانا چاہا' پر وہ تو سہیلی کو "فوراً" ہی اقرار کر بیٹھیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں بھلا اس سے بہتر رشتہ کیا آتا۔ آمنہ کا گھر بار وہ دیکھ چکی تھیں۔ حسن خوش شکل ہونے کے ساتھ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ سب سے بڑھ کر آسٹریلیا میں اس کی جاب تھی۔ بیوی کو بھی اس کے ساتھ چلے جانا تھا۔ اب مزید کیا چاہتا؟ ارفع کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

"منع مت کریے ان کا کہا بھی ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ دوست نے ان کا کہہ مان رکھا ورنہ اس رشتے میں بھلا کوئی کمی تھی۔ گھر سے وہ ماحول نے ایسا جا لگا۔ بازی لی جانی' زندگی میں پہلی بار گویا' جیات کو اتنا خوش دیکھ کر عرفان صدیقی نے بھی "فی الحال" خاموشی اختیار کرلی۔

"ایسا رشتہ تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ دیکھا میری بچی کی قسمت کتنی شان دار نکلی؟" ارفع بیٹی کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"یہ شب ابھی تک کیوں نہیں آئی اسے تو اپنے میک اپ فیشن سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بہن کی فکر خاک کرے گی۔" انہوں نے دانت کچکچا کر گھڑی دیکھی۔

"تو بھائی صاحب! بس طے ہو گیا اب کی بار جب حسن وطن لوٹے گا تو ان دونوں کا نکاح کر دیں گے' تاکہ وہ ملاحت کے باہر جانے کا کیس اپلائی کر دے۔ اسی دوران ملاحت کا گریجویشن بھی مکمل ہو جائے گا۔ رخصتی اس کے بعد ہی کریں گے۔" آمنہ نے امیگریشن کے معاملات کو اپنے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"جی ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔" عرفان صدیقی نے مسکرا کر نیم رضامندی دی۔ انہیں یہ سوچ کر تسلی ہوئی' باقی معاملات اس وقت ہی مکمل ہوں گے' جب خیر سے ان کا بیٹا وطن لوٹے گا۔ اس دوران حسن کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

"جی۔ ابھی تو ہم اپنی سونے کی زنجیر پہنا کر بس یہ رشتہ پکا کر رہے ہیں' باقی دھوم دھام بعد میں ہوتی رہے گی۔" آمنہ خوش دلی کے ساتھ بولیں۔ ان کی بیٹیاں ایک [illegible] جلد بازی پر جیسی ناگواری سے ماں کی جلد بازی کا نظارہ دیکھنے میں مصروف تھیں۔

"جی۔ وہ تو ٹھیک ہے' پر ہم نے ابھی حسن میاں کے لیے کچھ خریدا بھی نہیں۔ سب کچھ اتنا اچانک طے پایا۔" عرفان صدیقی کی خوددار طبیعت تھوڑا گھبرائی۔

"ارے بھائی صاحب۔ ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں جو آپ تکلفات میں پڑ رہے ہیں۔ اللہ رکھے تو بہت موقع آئیں گے۔ پر یہ یاد رکھیے گا ہمیں اپنی بیٹی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ ہماری تو بس ایک ہی شرط ہے۔" انہوں نے ڈرامائی انداز اختیار کیا اور سب لوگوں کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لے لیا۔ ارفع نے پہلے گھبرا کر سہیلی کو دیکھا' پھر برابر میں بیٹھے شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ انہوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں بیوی کو تسلی دی۔ ملاحت الگ شرم و حیا بھول کر آمنہ خالہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جی بہن بولیے اچھا ہے آج ہی۔ ہر بات صاف ہو جائے۔" عرفان صدیقی نے اطمینان سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ارفع کی جان جیسے حلق میں اٹک گئی

کہ ان کی طرف سے کیا فرمائش آئی ہے؟

"بس ہماری بہو شادی کے بعد سال میں ایک مہینہ ہمارے ساتھ یہاں آکر گزارے۔" آمنہ کی آواز گلوگیر ہوگئی' لہجہ چیخ چیخ کر اپنی تنہائی کی داستان سنانے لگا۔ ملاحت سمیت باقی لوگ ان کی محبت بھری فرمائش پر مسکرا دیے۔ آمنہ کی بڑی بیٹی نرمین کو اپنی ماں کے محبت بھرے سخن زہر سے بھی بدتر لگ رہے تھے۔ اس نے باقی بہنوں کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ اعزاز ان کی ساری حرکات مسکرا مسکرا کر نوٹ کر رہا تھا اسے بعد میں ہر چیز کا ریکارڈ جو رکھنا تھا۔

"اے شازمین بھائی کا وہ کارڈ تو دینا جس میں اس کے آفس کا پتا اور نمبر وغیرہ ہے' بھائی صاحب آپ لڑکی والے ہیں ہم سمجھتے ہیں آپ کی تسلی بھی ضروری ہے۔" انہوں نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لیجیے ممانے" شازمین نے ماں کو ایک کارڈ پکڑا دیا۔

"یہ کارڈ لے لیں اور جس سے چاہیں حسن کے بارے میں معلومات کروالیں۔ ان شاء اللہ مایوسی نہیں ہوگی۔" انہوں نے شازمین کے ہاتھ سے سفید چکنا چمک دار کارڈ لے کر عون صدیقی کو تھمایا۔ وہ چشمہ لگا کر اسے پڑھنے لگے۔

"ایک منٹ جانِ من۔ بھیا کی ایک ہی بہن ہے۔ اس کے بغیر یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔" شباہت نے اندر داخل ہوتے ہوئے فلمی انداز میں بڑھک ماری۔ دھانی شرٹ پر فیروزی ٹراؤزر اور تین گز کا لہو... ہر تکموں کے امتزاج سے رنگا شیفون کا دوپٹا' جدید انداز میں سنورے ہوئے بال۔ وہ جھل مل کرتی کمرے میں کیا داخل ہوئی ایک منٹ کے لیے سکوت سا چھا گیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے آمنہ اور ان کی تینوں بیٹیاں بھی اسی کو دیکھنے لگیں' شباہت کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ چمک سی گئی۔ لمبا قد' گوری رنگت' نشیلی آنکھیں' اس پر بلا کی تیاری' آمنہ کی تک چڑھی بیٹیاں بھی مبہوت سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ نرمین نے

مسکرا کر شباہت کو خوش آمدید کہا اور ہاتھ بڑھا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ لمحوں میں اطلاقی پس منظر میں چلی گئی۔ اریج ہمیشہ کی طرح چھوٹی بیٹی کی پذیرائی پر خوش نہیں ہوئیں۔ ان کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔

"واہ آنٹی آپ نے یہ چاند کہاں چھپا رکھا تھا؟" شازمین نے طربیہ انداز اختیار کیا۔

"اے میرا بچہ۔ چھپایا تھوڑی' اس کے کالج کی چھٹیاں ہوئیں' تو یہ حیدر آباد اپنی پھوپھی کے گھر رہنے چلی گئی۔" اریج نے تکلوث کا اظہار کرتے ہوئے بچی بات بتائی۔

"حیرت ہے' ویسے آپ کی دونوں بیٹیاں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔" نرمین نے بھی جملہ کسا۔ ملاحت کا سر مزید جھک گیا۔

"بس بیٹے پانچوں انگلیاں بھی تو الگ الگ ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک ہی ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔" انہوں نے تھوڑا ناگواری کا اظہار کیا تو آمنہ نے بھی بیٹیوں کو آنکھ دکھائی وہ اب شباہت کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ جو ان مکالموں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ویسے تو بہن کے مقابلے میں ہمیشہ سے تعریف اس کا ہی مقدر بنی' پر جب اسے ماں سے بہن کا رشتہ اتنے کھاتے پیتے گھرانے میں طے ہونے کا پتا چلا اور اس نے حسن کی تصویر دیکھی تو جانے کیوں خوشی کی جگہ بے چینیوں نے اس کے دل پر ڈیرہ جمالیا۔ گھر میں آنے والی ہر چیز پر قبضہ جمانے والی شب کو بالکل امید نہ تھی کہ اس کی قسمت کا ستارہ چھلانگ مار کر اتنا اوپر چلا جائے گا۔

"چلو نا ستو' کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کچھ تصاویر کھنچوا لیتے ہیں۔" انہوں نے آمنہ کی توجہ دولہا ملاکی کی طرف کروائی تو وہ بھی چونک کر شباہت کے سحر سے باہر نکل آئیں اور مسکرا کر اس طرف بڑھیں۔ یہ آمنہ کی ہی خواہش تھی کہ ملاحت کی ایک دو تصویریں بنالی جائیں' تاکہ حسن کو میل کی جاسکیں۔ البتہ ان کی بیٹیوں نے ملاحت کو لفٹ نہ کروائی' شب بھی بہن کو

فراموش کیے۔ حسن کی بہنوں سے خوش اخلاقی برت رہی تھی۔ ارفع نے چھوٹی بچی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے بھی کیے۔ پر وہ نرمین سے باتوں میں لگی رہی۔ شب کے اندر خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پہلے ماں کے منع کرنے کے باوجود۔ اپنی پوزیشن لاست سے تیار ہونے چل دی' اب بھی سنی ان سنی کیے بیٹھی تھی۔ نرمین اور شازمین نے ملاحت کے معاملے میں جتنی سرد مہری دکھائی' اتنی ہی گرمجوشی سے انہوں نے شباہت کو لفٹ کروائی۔ عازمین البتہ ماں کے ساتھ ہونے والی بھابھی کی ڈیجیٹل کیمرے سے فوٹو اتارنے میں مصروف ہوگئی اسے بھولی بھالی سی پرکشش سی ملائی بہت پسند آئی تھی۔

"شب بیٹا! ذرا کچن میں کھانے کا انتظام تو دیکھنا۔" ارفع سے بچی کے دھنک سنر زیادہ دیر برداشت نہ ہوسکے تو دانت کچکچا کر بچی کو پکار لے اعراض کو بھی شباہت کے اسٹائل ایک آنکھ نہیں بھارہے تھے۔ مہمانوں کے لحاظ میں چپ تھا ورنہ کرایلی بہت کا میدان بنا ہوتا۔ ماں کے بگڑے تیور دیکھ کر شب منہ بناتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ عرفان صدیقی پہلے ہی عشاء کی نماز پڑھنے مسجد جا چکے تھے۔ ارفع کی نوشگوارے زنجیر کی گرہ تو کھل گئی تھی پر کرے کو شب کی تندے جس طرح بدلا۔ یہ بات ان کے لیے پریشان کن تھی۔ ایسا لگا جیسے زنجیر کی گانٹھ تو کھل گئی پر ان لوگوں کے دلوں میں ایک نئی گرہ لگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو ہنڈی محاسبت کی سیدھی ہیں۔ بچپن کی سہیلی کو دیکھا اور پھسل گئیں' نیچے بھالے بغیر اور پہلی ملاقات میں رشتہ دے بیٹھیں۔" نرمین گاڑی میں بیٹھتے ہی شروع ہوگئی' جب سے اس کی شادی ہوئی' خود کو بڑا معتبر سمجھ کر' ہر معاملے میں وہ ٹوک دے ہے وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو بجیا۔ ارفع آنٹی کو دیکھ لو۔ کتنی چالاک ہیں۔ کالی والی اٹھا کر ہمارے سامنے دی اور وہ جو سفید ریشم جیسی ہے۔ اس کو چھپائے رکھا' حالانکہ ہمارے اسمارٹ سے بھائی کا صحیح جوڑ تو چھوٹی والی سے بنتا ہے۔" شازمین نے بہن کا ساتھ دیتے ہوئے کلی پھندے لگائے۔

"نہیں۔ بیٹا! ارفع ایسی نہیں۔ اس نے تو کئی بار ہمارے سامنے چھوٹی بچی شباہت کا تذکرہ کیا تھا' یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اپنی پھوپھو کے یہاں رہنے گئی ہوئی ہے۔ مگر ہم نے اس کے بارے میں زیادہ کرید انہیں زیبے بھی۔ جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس کیا گننا۔ ہمیں ملائی کی عادت اطوار بھائے تو اسی کے لیے بات کرلی۔ ویسے بھی بچی کی شکل و صورت کی اتنی بری نہیں' تم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا۔ وہ کتنی پرکشش ہے۔" آمنہ نے بھرپور طریقے سے سہیلی اور ہونے والی بہو کا دفاع کیا۔

"واہ۔ واہ کیلی اور خوبی ہونہ ہو۔ ان لوگوں کی حس مزاح بڑی شاندار ہے۔ جسے ملائی کہنا چاہیے' اسے شب کہتے ہیں' جو رات سی ہے' اسے ملائی پکارا جاتا ہے بھائی کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" نرمین نے مذاق اڑایا تو آمنہ کو بہت برا لگا۔

"بری بات ہے بیٹا۔ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں میں نقص نکالنا اچھے نہیں کہتے۔" آمنہ نے بیٹیوں کو سمجھانے کی لاحاصل کوشش کی۔

"مما! آپ تو بھی کہیں' مجھے اپنے ہینڈسم بھائی کے لیے ملاحت کہیں سے بھی مناسب نہیں لگی' ہمارا کا گھرانہ دیکھا' کتنا دقیانوسی' میرے سسرال والوں کا پتا ہے نا آپ کو۔ کتنے مین میخی ہیں۔ سوال کر کر کے میرا جینا محال کردیں گے چلو شباہت ہوتی تو اور بات ہوتی۔ اس کا حسن ہر سوال کا جواب بن جاتا۔" نرمین کا وہی متکبرانہ انداز' عازمین چپ رہی۔

آمنہ سر جھکائے بیٹیوں کے تبصرے سن کر افسردہ سی ہوگئیں' جمال صاحب کو اپنی تینوں بیٹیوں سے جنونی محبت تھی۔ کیوں کہ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔

آمنہ کو اجازت نہ تھی کہ وہ بیٹیوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کرسکیں۔ حسن اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے بیٹیوں پر ترجیح نہ دیتے تھے اسی لیے وہ شروع سے ماں کے قریب رہا۔ بیٹیوں کو پر اعتماد بنانے کے چکر میں کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ آمنہ خاموشی سے پورے راستے منہ سے باہر کے نظاروں میں گم رہیں۔

"یہ ساری باتیں حسن کے کانوں تک دبی دبی ہو کر پہنچیں گی۔" انہیں ایک دم سے فکر ہوئی، ماں تھیں، نرمین اور شانزمین کی عادتوں کو اچھے طریقے سے پہچانتی تھیں۔ باپ کے گزر جانے کے بعد دونوں بڑی بیٹیوں نے جیسے اپنا کرلیا تھا اپنی مرضی چلاتیں، اکثر بھائی کو بھی مس گائیڈ کرتیں۔ حسن الجھ جاتا تو پریشان ہو کر ماں کو فون گھماتا۔ آمنہ بیٹے سے بھی دل کا درد چھپا جاتیں۔

"اگر حسن نے بھی بہنوں کے دباؤ میں آکر ہمارے فیصلے پر اعتراض کیا تو ہم ارفع کو کیا منہ دکھائیں گے؟" وہ ایک دم گھبرا گئیں۔

"امی آپ پریشان نہ ہوں اس سے پہلے کہ آپا وہ بیجا بھائی سے بات کریں، آپ خود بھائی کو سب بتا دیجئے، اگر ان میں ذرا بھی عقل ہوگی تو سیرت پر صورت کو کبھی ترجیح نہیں دے پائیں گے۔" عاشمین ان کی اتری صورت دیکھ کر جیسے سمجھ گئی۔

"ہوں۔ کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ اب وہاں تو صبح ہو چکی ہوگی ہمارے کمرے میں چلو اور ذرا حسن کا نمبر تو ملا کر بات کراؤ۔" چھوٹی بیٹی کی بات نے ان کے اندر توانائی سی بھر دی۔ وہ جلدی سے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆ ☆ ☆

آمنہ اور ارفع کا تعلق ایک ہی گاؤں سے تھا۔ وہ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ بیاہ کر ایک ہی شہر میں آئیں، شروع شروع میں تو خوب آنا جانا ہوا، پھر دونوں بڑے سسرال اور بڑھتے ہوئے خاندان کے جھمیلوں میں الجھ گئیں، ملنا ملانا کم ہو گیا مگر محبتیں کم نہ ہوئیں، ارفع اپنے گھر میں منو کا اتنا ذکر کرتیں کہ ان کے بچوں کو آمنہ خالہ کی ہر بات ازبر ہو گئی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ارفع کو زندگی میں تھوڑی فراغت محسوس ہوئی تو آمنہ کی یاد دوبارہ جاگ اٹھی۔

ایک دن چھوٹے بیٹے کو ساتھ لیا اور پتا ڈھونڈتی ہوئی پرانی سہیلی کے یہاں جا پہنچیں، پتا وہی تھا مگر پرانا سا پرانے انداز میں بنا ہوا گھر چمکتے دمکتے جدید انداز کے بنگلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

آمنہ بہت محبت سے ملیں، ارفع جو ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھیں پرانی یادوں میں ایسے گم ہوئیں کہ باقی سب بھول گئیں۔ اعزاز منہ بنا رہ گیا۔

اب ارفع گھر جانے کو بے چین ہوئیں تو آمنہ نے اعزاز سے کہہ کر کھانا لگوا دیا۔ بیٹیوں کو بھی کھانے کے لیے بلایا گیا۔ ان کی دونوں بیٹیاں شانزمین اور نازمین آئیں، رسمی طور پر سلام دعا کر کے جلدی سے پلیٹوں میں کھانا نکالا اور یہ جا وہ جا۔۔۔ ارفع کو بہت برا لگا۔ پر بولیں کچھ نہیں۔

"ارے وہ پڑھ رہی ہیں، ورنہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاتیں امتحان قریب ہے نا۔" آمنہ نے لڑکھڑاتی زبان سے صفائی دینا چاہی۔

"کوئی بات نہیں۔ خیر ہے۔" ارفع نے سہلا دیا۔ ہر گھر کا الگ الگ ماحول ہوتا ہے۔ وہ شیریں صلح جو۔ کھانے کے بعد بصد اصرار آمنہ نے انہیں اپنے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیجا تاکہ وہ گھر بھی دیکھ لے۔ برسوں بعد ہم جولی سے ملنا بہت اچھا لگا سوچا اس کے یہاں جاتے آتے رہنے سے دل بہلا رہے گا ورنہ بچوں کی اپنی دنیا تھی۔

☆ ☆ ☆

"آمنہ خالہ امی کی دوست نہیں۔ چھوٹی بہن لگ رہی تھیں۔" اعزاز نے اگلے دن گھر والوں کے درمیان بیٹھ کر اچانک شوشہ چھوڑا۔

"واقعی۔ ایسی ہیں منو خالہ؟" ملاحت نے چائے کی ٹرے بیچ میں دھری ٹیبل پر رکھتے ہوئے معصومیت سے سوال کیا۔ اس گھر کا معمول تھا کہ سب شام کی چائے صحن میں بیٹھ کر ایک ساتھ پیتے تھے۔

"تو اور کیا۔ بھلا میں کیا جھوٹ بولوں گا؟۔ امی سچ بتائیں نا۔ وہ آپ سے کتنی چھوٹی ہیں کیسے کالے بال تھے' بلکے آسمانی جوڑے میں خوب تیار بیٹھی تھیں۔" اعزاز نے ماں کو چھیڑا۔ اس کا ماں سے اس طرح سوال کرنا ملائی کو اچھا نہیں لگا اسے تو اپنی امی ابو سے زیادہ دنیا میں کوئی حسین ہی نہیں لگتا تھا۔

"جھوٹی۔ رہنے دو۔ امی سے زیادہ دنیا میں کوئی اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔" ملاحت نے ماں کا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھا تو چائے چھوڑ کر ان کے پاس آگئی۔ کام کی زیادتی سے کھردرے ہو جانے والے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگالیا۔ ارفع بیٹی کی محبت پر کھل اٹھیں۔ اعزاز نے شرارت سے ان دونوں کی محبت کا سین دیکھا۔

"بیٹا جی یہ پیسہ بھی نا۔ بڑی عجیب چیز ہے صرف بینک میں رکھا ہو تب بھی انسان کو اتنا پر اعتماد بنا دیتا ہے کہ اس کے چہرے پر تو کبھی چمک پھوٹ رہی ہے۔" عرفان صدیقی نے اخبار سائیڈ میں رکھ کر چشمہ اتار کر بیٹے کو دیتے ہوئے فلسفہ جھاڑا۔ شریک حیات کو آزردگی سے دیکھا۔ جو ان کی تمام زندگی میں ساری عمر رو رو جوڑنے میں لگی رہیں۔

"آپ کی محبت ہی میری زندگی کا سرمایہ ہے' مجھے پیسے کا کیا غم۔" ارفع نے سر اٹھا کر شریک حیات کو دیکھا ان کی اداسی بھری کیفیت صرف' وہی محسوس کر سکتی تھیں' اسی لیے بند ہونٹوں سے اپنا پیغام ان تک پہنچایا۔ اتنے سالوں کے ساتھ نے دونوں کو یہ

توانائی بخشی تھی کہ بعض اوقات زبان سے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ بہت سی باتیں بن کہے ہی سمجھ لی جاتیں۔ محسوس کرلی جاتیں۔

"ابو جی کہتے تو آپ ٹھیک ہیں' آمنہ خالہ واقعی چمک رہی تھیں۔" اعزاز نے باپ کا چشمہ اپنے کرتے کے دامن سے صاف کر کے اس کے کور میں رکھتے ہوئے تائید کی۔ ارفع نے ہمیشہ سے بچوں کو باپ کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کی عادت ڈالی تھی تاکہ باپ سے ان کی قربت میں کمی نہ ہونے پائے۔

"بات یہ ہے میرے بچے کہ آمنہ بہن کا تعلق امیر گھرانے سے ہے۔ بیٹے کا باہر جانا سونے پہ سہاگا ہو گیا ان کی زندگی آسودگی میں گزری۔ جبکہ ہم سفید پوش لوگ ہیں۔ تم اس گھر کے اکلوتے سپوت ہو' ابھی تعلیمی مراحل سے گزر رہے ہو' یہ تو تمہاری امی کا ہی کمال ہے کہ گھر کا انتظام خوش اسلوبی سے چلا رہی ہیں۔ ورنہ گھر کے سو خرچے اور میری ایک سوکھی تنخواہ اور چند ٹیوشن۔ مہنگائی میں اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ تمہاری امی نے ہمیشہ کم وسائل میں کفایت کرتے ہوئے گھر کے بجٹ میں توازن رکھا' اسی لیے تو ہم ان کے مداح ہیں۔" عرفان صدیقی نے پیار سے ارفع کو دیکھا اور لفظوں سے خراج تحسین پیش کیا۔ ملاحت اور اعزاز کھلکھلا کر ہنس پڑے' شباہت تو حیدر آباد اپنی چھوٹی پھوپھو کے یہاں چھٹیاں گزارنے گئی ہوئی تھی' ورنہ وہ بھی اس وقت ان کے ساتھ بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی۔

"کاش میں کچھ کر سکوں۔ جلدی سے گریجویشن مکمل ہو جائے تو کوئی نوکری ہی ڈھونڈ لوں۔ آمنہ خالہ کے بیٹے کی طرح اپنے ابو کا سہارا بن جاؤں' تاکہ میری امی بھی فکروں سے آزاد ہو جائیں۔" ملائی نے معصوم سے دل کی خواہش اعزاز سے شیئر کی تو وہ پیٹ پکڑ کر دیر تک ہنستا رہا۔

"پیا۔ اکیلے باہر نکلتے تو تمہاری جان جاتی ہے اتنی ڈرپوک ہو کہ کالج تک تو مجھے ساتھ چھوڑنے جانا پڑتا ہے۔ باہر نکل کر نوکری کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔" اعزاز کے انداز پر اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ بہت ہی حساس تھی' باپ کو اتنی محنت کرتا دیکھتی تو اس کے

دل پر گھونسا پڑتا' باپ کے کمزور سے چہرے پر نگاہیں جیسے تھم سی گئیں۔ وہ لب اعزاز سے مسکراتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے' عرفان احمد ایک کالج میں انگلش پڑھاتے تھے مگر مہنگائی کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے شام کو بچوں کو گھر پر ٹیوشن بھی دیتے تھے۔

"کل سے ابو کو روزانہ رات میں دودھ کا گلاس میں دوں گی۔" اسے ابو کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت پر تشویش ہوئی' خاص طور پر جب سے عرفان احمد کو دل کا مرض ہوا تو وہ ان کا بہت زیادہ خیال کرنے لگی۔ باپ پر زور دے کر کچھ ٹیوشن کم کروائیں۔ محلے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو خود پڑھا کر اپنی کالج کی فیس نکالنے لگی۔

شباہت اسی گھرانے کی فرد ہونے کے باوجود سب سے مختلف تھی۔ اس کو اگر فکر تھی تو بس اپنی ذات کی۔ اس میں اور ملاحت میں سال بھر کا فرق ہو گا۔ وہ ہر وقت بچی بنی رہتی۔ اعزاز جو سب سے چھوٹا تھا' اکثر شب کی ناانصافیاں دیکھ کر اس سے لڑنے بیٹھ جاتا۔ کبھی کان بند کیے بس اس بات پر عمل کیے بیٹی رہتی "اپنا من پرچنا' کٹوری میں گنگا۔"

❋ ❋ ❋

"ہیلو۔ ارفع۔ ہم آمنہ بول رہے ہیں۔" ملاحت نے ماں کو اپنا موبائل لا کر تھمایا' جس پر آمنہ کا فون آیا تھا۔

"آپا۔ پلیز۔ میں آپ کی ہونے کی یہ چین کل کالج پہن کر چلی جاؤں؟ اف کتنی خوبصورت اور نفیس ہے۔" شب نے بڑے پیار سے ملاحت کے گلے میں پڑی زنجیر پر ہاتھ پھیرا اور حسرت سے بولی۔ اس کے چہرے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔

"ہاں پہن لو۔ مگر احتیاط سے رکھنا" ملاحت نے نہ چاہتے ہوئے بھی بہن کی خوشی کے لیے سسرال سے آئی ہوئی زنجیر اتار کر اسے تھما دی۔ اسے انکار کرنا مشکل لگا۔

"اف۔ یہ تو مجھ پر ہی سجے گی۔" شب خوشی خوشی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ زنجیر کو گلے لگا کر دیکھتے ہوئے تفاخر سے سوچا۔ ابھی اس نے پہننے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ کمرے میں داخل ہوتی ارفع نے اسے گھورا اور زنجیر ہاتھوں سے جھپٹ لی' انہیں ہمیشہ سے چھوٹی کی یہ عادت بہت ناگوار گزرتی تھی کہ وہ گھر میں آنے والی ہر اچھی چیز پر قبضہ جما لیتی' چیزوں کی تو خیر تھی مگر یہاں بات ملاحت کے سسرال سے آئے ہوئے زیور کی تھی' اس بار وہ اس کا بچپنا نظرانداز نہ کر سکیں۔

"شکر ہے میرے اللہ۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ گئی' ورنہ اس لڑکی نے تو ستیاناس کر دیا تھا' کچھ عقل وقل ہے کہ نہیں۔ بہن کے سسرال سے آئی ہوئی چیز ہے۔ اگر کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو۔ میں کیا منہ دکھاؤں گی؟" وہ بیٹیوں کو سمجھانے کی تاکید کرتے ان کے کمرے میں



آئیں تو نیا تماشا دیکھ کر وہ لوگ ہی برس پڑیں۔

"تم ملائی تمہیں کچھ سمجھ بھی ہے کہ نہیں۔ خیر سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ کل کو سسرال چلی جاؤ گی۔ ایسی لاپروائی دکھاؤ گی۔ تو ماں کا نام روشن ہو گا خوب۔"

ہمیشہ کی طرح تو پوں کا رخ بڑی کی طرف موڑا۔ وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

"امی کیا ہے؟ میں نے ایسا سے پوچھ کر لی ہے۔ ویسے بھی ذرا سا پہننے سے تھوڑی جائے گی۔ سونے کی بنی ہوئی ہے۔ سونے کی۔" ماں کے غصے سے شب کے دل پر چوٹ لگی۔ ویسے بھی وہ بچپن سے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اب ملاحت کی اتنی اہمیت۔ وہ چڑ گئی اس پر اتنے اونچے خاندان میں رشتہ طے پانا اسے لگا جیسے اس کی حق تلفی کی گئی ہو۔ نگاہیں جیسے زنجیر پر جم گئیں۔ رشک و حسد کی تپش ارفع تک بھی جا پہنچی۔ انہوں نے چونک کر چھوٹی کو دیکھا۔ رسم کے بعد سے شب کے بدلے بدلے تیور انہیں سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس نے بہنوں والے کوئی ارمان دکھائے نہ ہی بہن کے برابر میں بیٹھ کر فوٹو کھنچوائی۔ ان لوگوں کے جاتے ہی وہ سارے کام کاج چھوڑ کر کمرے میں بند ہو گئی۔ انہوں نے مصروفیت میں ان باتوں کو اہمیت نہ دی۔ پر ابھی ابھی جو لہر اس پر ہوا تھا وہ چونکا گیا تھا۔

"تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ بہن کی چیزیں کوئی یوں ہی اٹھا کر دے دیتا ہے۔ حالات ویسے ہی خراب ہیں۔ کسی نے چھین چھان لی تو مصیبت ہو جائے گی۔" ارفع بظاہر ملائی کو جھاڑ پلاتے ہوئے شباہت کو سمجھاتی تھیں۔ ان کا یوں ٹوکنا اس کے دل میں آگ لگا گیا۔ ارفع نے مڑ کر زنجیر ایک کیس میں رکھ کر الماری میں ملاحت کے خانے میں اندر کی طرف چھپانا چاہی تو شباہت تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

"پلیز۔ امی۔ ایک دن پہننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں چھینتا۔" شباہت نے قریب پہنچ کر التجا کی۔ وہ بھی۔ جیسے اڑ گئیں۔

"ایک دفعہ منع کر دیا۔ بس اب کوئی اور بات نہیں ہو گی۔ ویسے بھی اس کے سسرال سے آئی ہے۔"

انہوں نے چھوٹی کو جتلایا۔ وہ بری طرح سے جل گئی۔

"آپ تو بس اپنا کا ہی سوچتی ہیں۔ میری خوشیوں کی ذرا بھی پروا نہیں۔" شب نے آگے بڑھ کر ماں کے ہاتھ سے وہ کیس چھیننے کی کوشش کی۔ اس کے عمل سے زیادہ لہجے اور لفظوں نے ملاحت کو دکھوں کے سمندر میں دھکیلا۔ ارفع کی بستی بھی بیٹی کی بات پر اندر تک ہل کر رہ گئی۔

"شب تو کیا کہہ رہی ہے بیٹا؟" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ اس نے بے رخی سے ہاتھ چھڑایا۔ ملائی نے ماں بہن کی بات کے بیچ میں آنے کی کوشش نہ کی۔ ورنہ شب کے انداز سے غصہ ولا رہے تھے۔ جو ایک چھوٹی سی بات کو ربڑ کی طرح کھینچتی جا رہی تھی۔

"یا اللہ۔ میں نے تو کبھی اپنے بچوں میں فرق نہیں برتا؟ کیا میری قربانیوں کا مجھے یہی صلہ ملنا تھا؟ ارے تم لوگ تو میری جان ہو۔ یہ خناس تمہارے دماغ میں کیسے آیا؟" ارفع نے بیٹی کو جھنجوڑ ڈالا۔

"امی بس۔ رہنے دیں۔ یہ فرق نہیں تو کیا ہے؟ سب پتا ہے۔ آپ لوگوں نے اسی لیے چھٹیوں کا بہانہ بنا کر مجھے حیدر آباد بھجوایا۔ تاکہ اپنی امیر دوست کے بیٹے سے اپنا کا رشتہ طے کر سکیں۔" اس کے اندر پلنے والی بدگمانیاں لاوے کی شکل میں زبان سے نکلنے لگیں۔ یہ جانے بغیر کے تباہی دور دور تک پھیلے گی۔ ملاحت جھلنے لگی اس کی محبتوں کے صلے میں چھوٹی اور عزیز بہن کا یہ رویہ ناقابل برداشت تھا۔ آنسو قطار در قطار بہتے چلے گئے۔

"اگر خبر ہوتی کہ یہ رشتہ ہمارے گھر میں ایسی دراڑیں ڈال دے گا۔ تو میں خود سے انکار کر دیتی۔" ملاحت نے روتے ہوئے بہن کو صفائی دی۔ جس کے تنے ہوئے اجنبی نقوش نے اسے بہت اذیت پہنچائی۔

"بس۔ بس۔ اپیا۔ پلیز میں نے آپ کی محبت بھری باتیں سن لیں۔ ویسے دل میں تو لڈو ہی پھوٹ رہے ہوں گے نا شہزادہ گلفام جو مل رہا ہے۔" اس نے بہن کا بڑھا ہاتھ زور سے جھٹکا۔ وہ بہن جسے ملائی

نے ہمیشہ اپنی ساری پسندیدہ چیزیں بھی ہنستے ہنستے پیش کیں' زندگی کے اس اہم معاملے میں بھی ایسی ہی خواہش کر بیٹھیں مگر یہاں اس سے مات ہو گئی۔ یہ بے جان چیزوں اور کپڑوں کا معاملہ نہ تھا۔ یہ زندگی کی حقیقتیں تھیں۔ ملاحت اور ارفع کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مسئلے پر شباہت کے دل میں پیدا شدہ بدگمانیوں کو کیسے جھٹلائیں۔

"پلیز شب ایسے نہ کہو۔ میری بات تو سنو" وہ بہن کو منانے لگی۔ ماں کے آنسوؤں نے بڑی تکلیف پہنچائی۔ ایک نیا رشتہ جڑنے سے' پرانے رشتے مشکوک ٹھہرے۔ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا سر جھک گیا۔ سخت اور ضدی لہجہ۔ چہرے پر پھیلی اجنبیت۔ ارفع چھوٹی کو تاویلیں نہیں کر پا رہی تھیں۔

"اگر آنٹی نے تمہیں موتی کی طرح چھپا کر نہیں رکھا ہوتا تو اس وقت تم اپنی بہن کی جگہ بیٹھی ہوتیں کیوں آپی؟" شباہت نے مذاق ہی مذاق میں سرگوشی کی اور بڑی بہن کو پکارا۔ شباہت کے کانوں میں تو حسن کی سنتوں کی تعریفوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

"ہونہہ۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ویسے یہ استینا نا۔ ملاحت ہے تو تمہاری سگی بہن۔ میں سنا ہے کہتی ہوں۔ اسی لیے کسی رنجش کے بغیر حسن کے ساتھ تمہارا جوڑ بنتا ہے۔" ناپسندیدگی، حریفوں کا نشہ ایسا چھایا کہ اسے کچھ اور یاد ہی نہ رہا سوائے ان لوگوں کی مصنوعی باتوں کے۔

ماں کے بلبلانے پر سوچوں کی مالا بکھر گئی۔

"ہائے ہائے۔ چھوٹی کیا ہو گیا ہے؟ کچھ تو شرم کرو۔ کیوں بے بات کی بات بنا رہی ہو' ایسی کوئی بات نہیں۔ آمنہ نے کچھ دن پہلے ہی تو ملائی کو پسند کیا' پھر اتنی جلدی چلائی' تب ہی تمہیں فوراً بلوا بھیجا۔ اب تم اپنی ماں پر ایسے بیہودہ الزام لگا رہی ہو' میرے مولا۔ میں کیا کروں' تو ہی اس لڑکی کو عقل دے۔" ارفع کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کا دل کیسے صاف کریں؟

"رہنے دیں امی آپ کو بس ان کا ہی خیال تھا۔ جانتی تھیں نا ملائی نام رکھنے سے یہ گوری نہیں ہو جائیں۔ ان کی سانولی رنگت کی وجہ سے اچھے رشتے آنا مشکل ہیں۔ جب ہی تو اتنے بڑے گھر کا رشتہ آتے ہی ہاں کرنے میں دیر نہ لگائی۔ مجھے بتانے کی زحمت بھی نہ کی۔ میرے پیچھے ہی سب طے کیا۔ ڈر رہی ہوں گی تاکہ مجھے دیکھ کر کہیں وہ لوگ آپی کے لیے انکار نہ کر دیں۔" اس کا لہجہ خود غرضی کے عجیب رنگوں سے لپٹا ہوا تھا۔ ملاحت نے ماں کی حالت پر بہن کو شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"تم کیا اس گھر کی سب سے بڑی ہو جو تمہارا انتظار کیا جاتا۔ ہم والدین ہیں۔ ہم نے جو بہتر سمجھا فیصلہ کر دیا۔" ارفع نے وقت کچا کر کہا۔ ان کا ضبط جواب دے رہا تھا۔

"آپ کو پتا بھی ہے ایسے رشتے بار بار نہیں آتے پھر میرے لیے کیوں نہیں سوچا؟ دونوں بیٹیوں کو نکھارتیں' پھر ہماری قسمت۔ جو فیصلہ ہوتا میں اسے مان جاتی۔" اس نے سارے لحاظ ایک طرف رکھ دیے' زبان کے گھاؤ تلوار سے بھی تیز ہوتے ہیں' ملاحت نے دل پر ہاتھ رکھا۔ ارفع کا بس چلتا تو چپل اٹھا کر چھٹی کو مارنا شروع کر دیتیں مگر رات کے اس پہر شور شرابا ہوتا تو پاس پڑوس میں آوازیں جاتیں۔ عرفان صدیقی کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔ اس وجہ سے بھی وہ معاملہ دبا دینے کی خواہش مند تھیں۔

"شباہت۔ بس چپ ہو جاؤ" ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو ہاتھ لگاؤں گی۔ ماں بہن پر ایسے بے بنیاد الزام لگاتے تمہیں شرم نہیں آئی' شہر چلو تمہارے ابو کو جگاتی ہوں وہ ہی تمہارا دماغ درست کریں گے۔" وہ چھوٹی کی باتوں سے ڈھے گئیں۔ وجود نے مزید جسم ناتواں کا بوجھ نہیں سہارا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔ ان کے سر میں شدید دھمک ہونے لگی تھی' ملاحت نے ماں کی طبیعت خراب دیکھی تو دوڑ کر انہیں اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

ماں طبیعت اس سے بڑھ کر باپ کی دھمکی کام آگئی شب بھی گھبرا گئی جا کر ان سے لپٹ گئی' ملاحت جو ماں کو چپ کرا رہی تھی' چھوٹی بہن کو بھی گلے لگائے

کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس نے سب بے اعتنائی دکھائی۔

یہ کیا ہوا؟ تھوڑی دیر قبل دل میں جو خوشیوں بھری گدگدی ہوئی تھی شباہت کی بدگمانی کے دھویں میں سب کافور ہو گئی۔ ملاحت کا دل دکھوں سے لبریز ہوا تو دکھ آنکھوں سے بہہ نکلے۔

عرفان صدیقی چائے کی شدید طلب پر بیوی کو ڈھونڈتے ہوئے اس طرف نکل آئے تو چھوٹی بیٹی کی باتیں کانوں میں پڑیں۔ دل چھلنی ہو گیا۔ دنیا کے بچوں کو اخلاقیات کا درس دینے والے کی اپنی اولاد ایسی سطحی سوچ رکھ سکتی ہے۔ انہوں نے ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ دل جو پہلے ہی کمزور ہو چکا تھا۔ اس میں درد کی لہر جاگی۔ دیوار کا سہارا لینا چاہا پر تیورا کر گر پڑے۔ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

دھڑام۔ "گرنے کی آواز پر تینوں باہر دوڑیں۔ دروازے کے باہر عرفان صدیقی آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔

"یا اللہ۔ انہیں۔ کیا ہو گیا؟۔ ابو جی۔ ابو جی۔ بولیں نا آپ۔ ارے باپ کو اٹھاؤ۔" ان سب پر افتاد آن پڑی۔ اعزاز کے ساتھ ساتھ آس پڑوس والے بھی بھاگ آئے پڑوسی کی گاڑی میں ڈال کر عرفان صدیقی کو قریبی اسپتال پہنچایا گیا۔

"سوری۔ انہیں ختم ہے۔ ڈیتھ ہو چکی ہے۔" ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں ہمدردی دکھاتے ہوئے اعزاز کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ بری خبر سنائی۔

"ابو جی۔ آپ ہمیں ایسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" نوعمر اعزاز پر غموں کا اتنا بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ اسپتال کے فرش پر بیٹھ کر رونے لگا۔

عرفان صدیقی کے بیمار دل نے اب لوریو جھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ مزید چلنے سے انکار کر دیا۔ بند ہو گیا۔ اپنے پیاروں کو روتا دھوتا چھوڑ کر وہ پرسکون نیند سو گئے۔

✿ ✿ ✿

"ملائی۔ چدا۔ شادی کی تقریب میں پہننے کے لیے

کوئی بھاری جوڑا خرید لیتی نا۔ یہ کیا اتنا سادہ سا سوٹ نکالا ہے۔" ارفع نے ملاحت کو سادہ شیفون کا سرمئی جوڑا استری کرتے دیکھا تو ٹوک سے بولیں۔

"بس۔ امی اپنی شاپنگ کا وقت ہی نہیں ملا۔ ایک طرف شادی کی تیاریاں۔ پھر امتحانات کے نزدیک ہونے کی وجہ سے شدید مصروفیت۔ جلدی میں یہی ملا۔" اس نے دل کا درد چھپا کر بہانہ بنایا۔ ارفع بیٹی کا دکھ سمجھتی تھیں۔ عرفان صاحب کے گزر جانے کے بعد اس نے جیسے گھر کو سنبھالا وہ قابل تحسین تھا۔ گھر سے ایک قدم بھی باہر نہ نکالنے والی ملائی مس ملاحت بن گئی۔ گھر کوچنگ سینٹر میں جا کر کلاسز لیتی اور رات کو ہر پہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی۔ اعزاز اپنے پیچھے پڑا سے بچپا چھوڑ گئے۔ بہن کے شانہ بشانہ مشقت میں لگا رہا۔

لیکن ملاحت کا یوں بیلیہ میں ختم ہو جانا۔ ارفع تو اس کو بیاہ پچتی ہوئے تھک گئیں۔ شباہت کی تو شکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ پر ملاحت کا ہی دم تھا۔ جو اس نے پورے گھر کو جوڑے رکھا۔ باپ کی موت کے بعد بہن کو بڑھ کر خود گلے لگایا۔ شباہت نے بھی ماں بہن سے رو رو کر معافیاں مانگیں۔ پر ارفع اس کے معاملے میں پتھر ہو گئیں۔ اس سرد جنگ کا خاتمہ بھی آخر ملائی کی سرتوڑ کوششوں سے انجام پایا۔

"امی کچھ کہنا تھا؟" استری کر کے وہ مڑی تو ماں کو سوچ میں گم پایا۔ کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے پوچھا۔ ارفع ماضی کے دو برسوں کا سفر لمحوں میں کر کے واپس حال میں لوٹیں۔

"ہاں۔ آ۔ نہیں۔ کچھ بھی۔ نہیں۔" ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ بچا ہی کہاں تھا؟ یہاں تو سگی بیٹی سے نظریں ملانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ زندگی میں ایک اور جانگسل لمحہ سامنے آ گیا۔ مگر بہ حالت مجبوری انہیں اپنا فرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ ارفع کے گلے میں جھولتی سونے کی زنجیر پر ان کی نگاہیں جم سی گئیں۔ واپس لیتی تھی۔

"کیا بات ہے امی! کہیں پھر شب سے کسی بات پر

تکرار تو نہیں ہو گئی۔" اس نے ماں کو گومگو میں دیکھا تو پریشانی سے پوچھا۔ زندگی میں جو کچھ سہا۔ دل توڑنے والا ہی تھا۔ اب اس میں کچھ نیا سہنے کی سکت نہ تھی۔ اسی لیے گھبرا گئی۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یہ ہی کہنے آئی ہوں کہ ہم لڑکی والے ہیں۔ بارات آنے سے قبل تیار ہو جائیں تو اچھا ہے۔ تم بھی جلدی سے کپڑے بدل لو۔" رافع نے سر جھٹکا۔ جو سوچا۔ وہ کہنے کا ارادہ ملتوی کر کے بات بناتی ہوئی وہاں سے چل دیں۔

ملاحت سے سونے کی چین کی واپسی کا تقاضا کوئی ضروری تو نہیں۔ میری بچی کا دل پہلے ہی اتنا دکھا ہوا ہے۔ اب اس وقت دنیا داری نبھانے کے لیے کیا جانے والا یہ عمل "مرے پر سو درے ہوں گے۔" جب آمنہ ہی کو کوئی فکر نہیں تو میں کیوں ہلکان ہو رہی ہوں' ویسے بھی شباہت اتنی ضدی ہے کہ تن پر مٹی کے زیور سجالے گی پر اب اس زنجیر کو نہیں پہنے گی۔ رافع بے تکے خیالات سے پیچھا چھڑاتے ہوئے خود کو ہی جھاڑ [illegible] آسمانی [illegible] ساڑھی میں وہ بہت [illegible] تھیں' جو ملاحت کل ہی خرید کر لائی تھی اور بصد اصرار انہیں پہننے پر مجبور کیا۔ انہوں نے بیٹی کی گردن موڑ کر دیکھا۔ ملاحت [illegible] سوچوں میں گم بہت تنہا پھولی سی لگی۔

"امی۔ ایک منٹ۔" ماں سے نظریں ٹکرائیں تو اس نے انہیں روکا۔

"کیا ہوا ملالی؟" وہ وہیں رک گئیں۔

"یہ۔ لیجیے آج۔ آمنہ خالہ کو واپس کر دیجیے گا۔ اب اس پر میرا کوئی حق نہیں۔" ملاحت نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکتے ہوئے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کر ماں کی مٹھی میں دبا دی۔ رافع بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں۔ جو خالی گلے پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ ان کا دل [illegible]۔ شباہت کی بھی ماں تھیں۔ چپ ہو گئیں۔ کوئی اور یہ ظلم ڈھاتا تو اسے جھولی بھر بھر کر بددعا دیتیں۔

"میری صابر بچی۔ اللہ تو ہمیشہ اس کی حفاظت فرمائے۔

شباہت تو نے بڑا ظلم کمایا۔ اتنے دلوں کو توڑنے کے بعد تیرا دل خوش رہے گا' میرا دل اس کی گواہی نہیں دیتا۔" وہ اداس سی بڑے کمرے کی طرف بڑھیں' جہاں قریبی خاندان کے افراد کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خالہ جی۔ میں تو چھوٹی کی شادی کا کارڈ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سنا تو تھا کہ حسن میاں کی بات بچپن سے ٹھہری ہے۔ پر شادی شباہت سے ہو رہی ہے؟ ان باتوں میں کتنی سچائی ہے؟" ملاحت کی پھوپھی زاد بہن رضوانہ کو کرید لگی ہوئی تھی۔

"اے لو۔ تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے اس خاندان میں بیاہی آئی ہو۔ کیا تم رافع بھابی کو جانتی نہیں ہو؟ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد سے تو جیسے ہمیں غیر کر دیا۔ کوئی صلاح نہ کوئی مشورہ غیروں کی طرح کارڈ بھجوا دیا۔ ارے انہوں نے اپنے گھر کی باتیں ہمیشہ ڈھکی چھپی کر رکھیں۔ ہمیں تمہیں کیسے خبر ہونے دیتیں؟" انوری ہاتھ نچاتے ہوئے جوش میں آگئیں۔ "رافع ان خاندان والوں سے کیا مشورہ کرتیں' جنہوں نے عرفان صدیقی کے بعد پلٹ کر پوچھا نہیں کہ یہ لوگ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔"

"یہ بات تو آپ نے سولہ آنے ٹھیک کہی۔ پر آپ تو حیدرآباد میں تھیں۔ ہماری امی تو تھیں نہیں۔ کون سا ان کو پہلے سے صلاح مشورے کے لیے بلا لیا۔" رضوانہ نے سر ہلا کر تائید کی۔ ملاحت کی بڑی پھوپھو اکبری کو بھی بھاوج سے ایسے ہی گلے شکوے تھے۔

"میں۔ تو جانوں کہ ملاحت جو اتنے بڑے سینٹر میں نوکری کرنے لگی ہے نا تو اس نے خود ہی شادی سے انکار کر دیا ہوگا۔ خوب کما رہی ہے۔ دیکھنا کوئی دوسرا پھانس لیا ہوگا' جب ہی تو بہن کو اپنا منگیتر دان کر دیا۔" سروری نے پان دان کا ڈھکن کھٹ سے بند کیا اور بولیں۔

ملاحت جو دل کڑا کر کے دنیا کا سامنا کرنے کے لیے بڑے ہال میں داخل ہوئی۔ [illegible] سے ان لوگوں

کے پیچھے ہی آکھڑی ہوئی تھی۔ سال کو خبر نہ ہوئی۔ اس بات سے بے خبر کہ ذرا سی دیر کو زبان کے چٹخارے کے لیے کی جانے والی بڑی بڑی باتوں کا خمیازہ کس قدر سخت ادا کرنا پڑتا ہے۔

پہلے قدم پر ہی ایسی زہریلی باتیں سننے کے بعد وہ دکھ سے لمحے بھر کو منجمد ہوئی۔ مزید سننے کا یارا نہ تھا۔ فوراً" پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

"ابو۔ آپ مجھے کیوں چھوڑ گئے۔ میں تنہا رہ گئی ہوں۔ مجھ سے دنیا کا تنہا مقابلہ نہیں ہو گا۔ میں ٹوٹ رہی ہوں۔" وہ بے قراری سے روتے ہوئے باپ کو پکارنے لگی۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو اس کو یہ دن کیوں دیکھنے پڑتے" ان کی جگہ وہ گھر کی بڑی بنی تو اسے دل بھی بڑا کرنا پڑا مگر آنکھیں چھوٹی پڑ گئیں' بہنے لگیں۔ باپ کے ساتھ ساتھ اس نے بہن کی سنگ دلی کا بھی ماتم کرلیا۔

☼ ☼ ☼

ابھی عرفان احمد کے جانے کا دل بھر کر غم بھی نہیں منا پائے تھے کہ وہ لوگ زندگی کی بنیادی ضرورتوں نے ایک ایک کرکے سر اٹھانا شروع کردیا۔

ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے ملاحت نے ہاتھ پیر مارنے شروع کردیے۔ کالج والوں نے عرفان صدیقی کی شرافت اور لیاقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اعزاز کو کالج میں اسسٹنٹ لائبریرین کی نوکری دے دی۔ کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ نوکری بھی غنیمت تھی' اس نے ملاحت سے مشورہ کرکے فوراً" ہی شام کے کالج میں اپنا ٹرانسفر کروالیا۔ تاکہ پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ مگر اس کی قلیل تنخواہ میں گزارا بہت مشکل تھا۔ وہ قریبی رشتے دار جو باپ کی زندگی میں ان کے یہاں دعوتیں اڑانے آتے تھے' اب یوں بھاگتے جیسے وہ ادھار مانگنے والے ہوں' حالانکہ اس وقت انہیں صرف اخلاقی مدد کی ضرورت تھی۔

مگر مزاج نہیں بدلا تو آمنہ کا۔ ان کے خلوص میں

ذرا کمی واقع نہ آئی۔ ایسی غم زدہ فضاؤں میں ان کی آمد بہار بن جاتی۔ اچھے وقت میں ساتھ نبھانے والے تو ہزار۔ پر دکھ میں اگر ایک ہاتھ بھی آنسو پونچھنے کو بڑھے تو وہ تا عمر یاد رہتا ہے۔ بھلائے نہیں بھولتا۔

وہ ارفع کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اکثر ڈرائیور کے ساتھ کھانے پینے کی چیزوں سے لدی پھندی ان کے یہاں پہنچ جاتیں۔ ہنسی مذاق کرکے سب کا دل بہلاتیں۔ بچپن کی یادیں تازہ کرتیں' ماں کو بہلتا دیکھ کر ملاحت سکون کا سانس لیتی۔ اس کے دل سے ہونے والی ساس کے لیے دعائیں نکلتیں۔ اعزاز صبح کالج اور رات کو کھپتا۔ شباہت کے اپنے غم ارفع اس سے پہلی طرح خفا تھی۔ دونوں میں کافی عرصہ سے بلند ...... ہونے کے برابر تھی۔ تنگ آکر شباہت نے قریبی پرائیویٹ اسکول میں جاب کرلی' اس طرح اس کا وقت اچھا گزرنے لگا اور وہ اپنا چھوٹا موٹا خرچہ خود اٹھانے کے قابل بھی ہو گئی۔

"امی۔ یہ رکھ لیجیے۔" شباہت نے اپنی پہلی تنخواہ ڈرتے ڈرتے ماں کی طرف بڑھائی۔

"ملاحت اس سے کہہ دے مجھے اس کی کمائی سے ایک کوڑی بھی نہیں چاہیے۔ نہ آج نہ ہی کل۔" انھوں نے اس کی مٹھی میں دبا تنخواہ کا لفافہ دیکھا اور غصے سے ملاحت کو مخاطب کیا جو کمرے میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ ملاحت نے ماں کو سمجھانا چاہا۔ الٹا وہ رونے بیٹھ گئیں۔

یوں شباہت مزید بدگمان ہوتی چلی گئی۔ اسکول سے واپس آکر سب سے کٹی کونے کھدرے میں چھپی جانے کون سے کاموں میں الجھی رہتی۔

"یہ وہی آنگن ہے نا۔ جہاں ہم سب کے قہقہے گونجا کرتے تھے ہائے۔ اب کہاں سے میں ان پیارے لمحوں کو واپس لاؤں جو میرے دل میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے ہیں۔" ملاحت صحن میں بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ پرانی یادوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کر ڈالا۔ سارے آنسو کپ میں ٹپ ٹپ بہنے لگیں۔ وہ خود پریشان تھی۔ گھر کا ماحول عجیب ہو کر رہ گیا'

پیسے کی لگن کی، حالانکہ وہ کمر کس کر میدان عمل میں اتر آئی تھی۔ اس کی انگلش بہت اچھی تھی۔ آخر عرفان صدیقی کی شاگرد رہ چکی تھی۔ مگر انگریزی پڑھانے کا انداز اتنا سادہ اور سہل تھا کہ شہر بھر میں اس کے پڑھانے کے انداز کی شہرت پھیل گئی۔ کئی مشہور اداروں نے اسے اپنے یہاں پڑھانے کی آفر کردی۔ ملاحت نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ پر جان توڑ مشقت کے بعد بھی محنت کا وہ معاوضہ ہاتھ نہیں آتا جس کی وہ حق دار تھی۔ گھر پر پڑھنے والے اسٹوڈنٹس کی تعداد بھی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ ان سب کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جن کو منع کرتی۔ ان کے والدین کا دباؤ ہوتا کہ ہمارے بچے کو تو آپ سے ہی پڑھنا ہے۔ یہیں سے اس کے دماغ میں انگلش کوچنگ سینٹر کھولنے کا سودا سمایا۔ وہ ابھی اس بارے میں پلاننگ ہی کررہی تھی کہ حسن کی اچانک آمد نے اس کی زندگی میں ہلچل سی مچا دی۔ آمنہ نے یہ خبر سناتے ہوئے ملاحت کو گلے لگالیا۔ شباہت جو کسی کام سے اس طرف آئی تھی، گہری سوچ میں پڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ملاحت کیا بات ہے۔ میری آمد سے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟" حسن کی نگاہیں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ کلاس لے کر تھکی ہاری شام ڈھلے گھر میں داخل ہوئی تو حسن سے سامنا ہوا۔

"نہیں ایسا تو نہیں۔ آپ نے یہ بات کیوں پوچھی؟" وہ جلدی سے بیگ ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں جب بھی یہاں آتا ہوں۔۔۔ آپ غائب ہوجاتی ہیں۔" اس کا انداز شرارتی سا تھا۔ وہ مسکرادی اور معذرت کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"اف۔۔۔ اتنی سنجیدہ مزاج کی ہے۔ باقی زندگی کیسے گزرے گی حسن میاں؟" وہ وہیں کھڑا اس کو جاتا دیکھ رہا تھا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ پر شباہت نے اسے زیادہ سوچ بچار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ چائے کے بہانے اندر لے گئی۔

جلدی جلدی پانی کے چھپاکے مار کر منہ پونچھتی، بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ شباہت نے مزید اشیا سے میز بھردی تھی۔ خود بھی نئی نئی خوشبوؤں میں بسی بہت تازہ دم اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ملاحت اس وقت سوکھا پھول بنی کھڑی تھی۔ حسن نے دونوں کا موازنہ کیا۔ "آپ۔۔۔ کبھی مسکرائی بھی ہیں؟ یا ہر وقت ایسے ہی منہ بسورے رکھتی ہیں۔" ملاحت کو متوحش سا دیکھ کر حسن اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ منگیتر تو وہی تھی نا۔ انداز چھیڑنے والا تھا۔ ارفع نے ملاحت کو آنکھ دکھائی تو شکر ادا کرکے نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "نہیں۔۔۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔ بس وہ امتحانات کا سیزن ہے۔ اس وجہ سے مصروفیت عام دنوں سے کچھ زیادہ ہے۔ تو۔۔۔" اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ حسن بلیک جینز اور کھلے کلر کی ٹی شرٹ میں بہت شاندار لگ رہا تھا۔ وہ اپنی تصویر سے بھی زیادہ اسمارٹ اور فریش تھا۔ پاس سے اٹھنے والی مسحور کن مردانہ خوشبو۔ ملاحت نے زوردار سانس بھرلیا۔

ایک اس کا حلیہ تھا۔ اپنا جائزہ لیتی ہوئی وہ شرمندہ ہوگئی پر آج کل تو اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ ماں نے فون پر حسن کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے اسے جلدی گھر لوٹنے کی تاکید کی تو وہ کلاس ختم کر کے جلدی آگئی۔ شباہت کی شوخیاں حسن کی آمد پر ناگواری میں بدل گئیں۔ حسن کو آسٹریلیا سے لوٹے چند دن ہی ہوئے تھے۔ پہلی دفعہ میں وہ عرفان صدیقی کی موت کا پُرسہ دینے آمنہ کے ساتھ اطلاع دے کر آیا۔ ارفع نے زبردستی ملاحت کی چھٹی کرائی۔ اس کو ڈھنگ کے کپڑے پہنائے۔ نک سک سے درست کروایا۔ حسن نے ملاحت کو دیکھنے کے بعد جب کوئی اعتراض نہیں اٹھایا تھا تو۔۔۔ آمنہ کی جان میں جان آئی۔۔۔ نرمین اور شازمین نے البتہ بھائی سے خوب بحث مباحثہ کیا۔۔۔ پر وہ صرف ماں کے چہرے پر اترے سکون کو دیکھ رہی

خوش ہو گیا۔

"ملائکہ۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے۔ جلد کتنی بے رونق ہو رہی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں' موٹا سا چشمہ بھی پرانا ہو گیا ہے۔ حسن میاں آئے ہوئے ہیں کچھ نہیں تو شباہت کی طرح چار کا چکر ہی لگا آؤ' چہرے پر کچھ تو تازگی آئے گی۔" انہوں نے اسے کچھ سمجھانا چاہا' مگر وہ انجان بنی کتابوں میں منہ دیے رہی۔ ارفع سے اور کچھ نہ ہوا تو زبردستی پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا' سر دباتے ہوئے بالوں میں تیل بھی لگایا' ان کی نرم پوروں سے جیسے سکون کی لہریں نکل کر اس میں جذب ہو گئیں' وہ کب بے خبر سوئی اسے پتا نہیں چلا' سو کر اٹھی تو بال دھونے کا ٹائم نہیں ملا' کیسے ہی جلدی جلدی چٹیا بنائی اور پڑھانے چل دی' واپس لوٹی تو حسن موجود تھا' مجبوراً" اسی برے حلیے میں منگیتر کے سامنے پیش ہو گئی۔ حسن کو پہلی ملاقات کے مقابلے میں آج وہ بڑی خستہ حال لگی' تیل زدہ بال' چہرے پر بھی چکناہٹ' مسلے ہوئے کالے لباس میں وہ کچھ زیادہ ہی بکھری سی لگی' حسن نے گھبرا کر نگاہ اس پر سے ہٹا لی۔ "دونوں بہنوں" نے ملاحت کا نقشہ ایسا غلط تو نہیں کھینچا تھا۔" حسن نے جھرجھری لے کر سوچا۔ نمکین اور شادی کی باتیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ جو وقتاً" فوقتاً" ملاحت کے خلاف۔ اس کے کانوں میں انڈیلتی رہتی تھیں۔ مگر اسے بھی اپنی ماں' بہنوں کی زبان کا بہت پاس تھا' اس لیے بہنوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

"یہ شباہت۔ ملاحت سے کتنی الگ ہے۔"

اس نے سامنے سے ٹرے میں چائے کا کپ لیے شباہت کو آتے دیکھا' وہ سبز لباس میں سراپا سارنگی' بالوں کو اونچا کر کے چھوٹی سی پونی بنائے' سحر انگیز آنکھوں کی خوب صورتی کاجل سے اور تو سے بڑھائے' ہونٹوں کا گداز سا گلابی پن' سفید۔ شفاف رنگت۔ حسن نے دونوں بہنوں کا موازنہ کیا۔ شباہت کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا کہ ملائکہ نے اچانک جماہی لی' اس کے بندھے ہاتھ خیالوں میں چلے آئے' جو ملاحت سے رشتہ قائم رکھنے کے لیے انہوں نے اس کے آگے جوڑے تھے۔ حسن نے سر جھٹکا' ملاحت سے بات چیت شروع کی تو اسے خوش گوار حیرانی ہوئی۔ اس کا لاجواب انداز گفتگو اور ہر موضوع پر قابل رشک معلومات اور انگلش پر گرفت حسن کا دل خوش کرنے لگا' قابل لوگ اسے ہمیشہ سے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ ملاحت کی لیاقت نے اسے چاروں شانے چت کر دیا۔

اب وہ دونوں بڑے عالم انداز میں عالمی سیاست پر بحث کرنے لگے۔ شباہت تھوڑی دیر وہاں بیٹھی ان دونوں کی باتیں سنتی رہی' پھر بور ہو کر برے برے منہ بنانے لگی۔ اس کے باوجود حسن نے اس کا نوٹس نہ لیا تو پیر پٹختی وہاں سے چل دی۔ ارفع نے ان دونوں کو محو گفتگو دیکھا تو مسکرایا۔ ورنہ شباہت کے رنگ ڈھنگ سے تو انہیں بات بن جانے کے خوف میں مبتلا کیے جا رہے تھے۔

"وہ کب سے ٹی وی پر کوئی گیم شو دیکھنے کا کہا تھا۔" شباہت نے اپنے شلوار کے دوپٹے کا لٹکتا پلو اٹھاتے ہوئے اسے پکارا' تھوڑی دیر میں ہی ڈرائنگ روم میں اس کی واپسی ہوئی تھی۔ ارفع اور اعزاز بھی وہاں بیٹھے چائے پیتے ہوئے حسن کو کمپنی دے رہے تھے' انہوں نے شب کے یوں حسن کو مخاطب کرنے پر تنبیہی اور اعزاز نے ملامتی نظروں سے دیکھا' تاہم اس نے چہرے پر "پروا نہیں" کا بورڈ لگایا۔

"نہیں پھر کبھی دیکھیں گے۔ آج بہت دیر ہو گئی ہے۔ بس اب مجھے گھر جانا ہے۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" حسن نے نرمی سے جواب دیا اور اجازت چاہی۔

شباہت نے حسن اور ملاحت کو کسی بات پر مسکراتے دیکھا تو عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ارفع جوان دونوں کے ساتھ ہی کھڑی تھیں۔ حسن کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دینے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"یا اللہ۔ میں کیا کروں؟ کیا اتنی خود غرض ہو جاؤں کہ صرف اپنے بارے میں سوچوں؟ میرے جانے کے بعد گھر والوں کا کیا ہو گا؟" ملاحت رات کو کتابیں کھول

کر پڑھنے بیٹھی تو کئی سوالات اس کے اردگرد منڈلانے لگے۔ ارفع نے بتایا تھا کہ آمنہ نکاح کا کہہ رہی ہیں۔

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ابھی حسن سے کچھ وقت مانگ لوں گی' پہلے شباہت کی شادی کروں گی' اس کے بعد اپنی خوشیوں کے بارے میں سوچوں گی۔" اس نے عزم سے سوچا' ذہن دوڑایا تو اسے اپنے ساتھ پڑھانے والے ایک کولیگ انس کا خیال آیا۔ گو کہ وہ اپنے ساتھ پڑھانے والے مرد ٹیچرز کے ساتھ بالکل بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک فاصلے پر رہتی تھی۔ لیکن انس کا بے ریا ب دلچسپ' پرخلوص انداز۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اس کی طرف بڑھا۔ اب تو دونوں میں اچھی خاصی بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ کئی بار انس نے مذاق ہی مذاق میں اس سے اپنے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا بھی کہا۔

"انس۔ اچھے خاندان کا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ خوش شکل بھی ہے۔ یقیناً" شباہت کے ساتھ بہت سوٹ کرے گا۔" ملاحت نے خود ہی کڑیاں سے کڑیاں ملا کر زنجیر تیار کرلی۔

"اعزی۔ ذرا بیٹھنا۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے اعزاز کو بلا کر سامنے بٹھایا۔ ہاں۔ چھوٹا ہی سہی' پر اب وہ اس گھر کا اکلوتا مرد تھا' جو ہر اہم معاملے میں اس کی رائے جاننا ضروری سمجھتی تھی۔ تاہم اس نے یہ احتیاط ضرور برتی کہ اسے۔ ابھی شباہت اور ماں کو اس رشتے کے بارے میں بتانے سے منع کر دیا۔

"ہاں۔ یہ تو اچھی بات ہو جائے گی۔" اعزاز نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"اگر انس نے انکار کر دیا تو شب کی بدگمانیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔" اس نے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "انس کو ایک' دو دن میں گھر لے کر آتی ہوں۔ اگر اسے شب پسند آئی۔ تب ہی یہ بات منہ سے نکالوں گی۔" ملاحت نے منصوبہ بندی کی اور پھر بھائی سے اس بارے میں مشورہ مانگا۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ آپ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شب آپا کا مزاج تھوڑا مختلف ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ خود انکار کر بیٹھیں۔ انس بھائی کے سامنے آپ کی بات خراب ہو۔" اعزاز نے بہن کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔

"شب کیوں انکار کرے گی۔ اتنا اچھا تو ہے' پڑھا لکھا قابل۔ وہ اپنے ماموں کے پاس جلد ہی دبئی چلا جائے گا۔ جہاں انہوں نے اس کی بینک میں بہت اچھی جاب کا انتظام کیا ہوا ہے۔ یہاں تو وہ عارضی طور پر پڑھاتا ہے۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ بھری دنیا میں اس کی ایک ماں ہی تو ہیں۔ جیسا ہماری بہن کا مزاج ہے اسے ایسا ہی گھرانہ سوٹ کرے گا۔" ملاحت نے اعزاز کو تفصیلات بتائیں۔

"ٹھیک ہے۔ آپ نے انس بھائی میں کچھ اچھا ہی دیکھا ہوگا۔ حسن بھائی بھی آئے ہوئے ہیں۔ آپ یہ نیک کام جلد ہی نمٹا دیں تاکہ دونوں تقریب ایک دن ہی ہو جائیں۔ میرے لیے اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔" اعزاز نے نرمی سے بڑی بہن کا ہاتھ تھاما اور محبت سے بولا۔ ملاحت' حسن کے نام پر سرخ ہو گئی' بھائی کی کمر پر ایک دھپ لگائی۔

"واہ میرا اعزی تو بہت بڑا اور ذمہ دار ہو گیا ہے۔" ملاحت کو اس پر بہت پیار آیا۔

"ابو کے بعد۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پر میں اپنی دونوں بہنوں کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔" اعزاز افسردگی سے بولا تو ملاحت کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ دونوں بھائی' بہنوں کی بھلا جو بھی پلاننگ رہی ہو' پر اوپر والے کی پلاننگ۔ انسانوں سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہی اصل پلانر ہے' وہ کرتا ہے۔ جو ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

"ارے بیٹا۔ کیا بات ہے؟ بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔ منو بھی کافی دنوں سے نہیں آئی۔" ماں کی پرشفقت آواز نے کانوں میں رس گھولا۔ وہ حسن کا ٹیسٹ استقبال کرنے میں مصروف تھیں۔ ملاحت کے کان کھڑے ہوئے۔ امتحانات کیا ختم ہوئے اس کی

مصروف زندگی میں ایک دم ٹھہراؤ سا آگیا۔ وہ صحن میں موجود نیم کے درخت کے نیچے بیٹھی پسندیدہ کتاب ہاتھ میں تھامے فارغ لمحوں کا لطف اٹھا رہی تھی۔ حسن کی آمد پہ معصوم سی مسکراہٹ ملاحت کے لبوں کو چھوگئی۔

"بس۔ خالہ جی کچھ خاص نہیں بس مصروف رہا۔" اس کا لہجہ اور انداز ارفع کو کچھ اکھڑا سا لگا۔ وہ پہلے ہی وسوسوں کا شکار ہو رہی تھیں۔ ہر دوسرے روز فون کرنے والی آمنہ کا ایک ہفتے سے فون نہیں آیا تھا۔ نہ حسن نے چکر لگایا۔ ارفع نے فون بھی کیا تو عائشہ نے سلمان کی طبیعت خرابی کا بتایا اور معذرت کرلی۔ ارفع نے آج اعزاز کے ساتھ جاکر ملنے کا پروگرام بنایا تھا کہ حسن آگیا۔ پر وہ بھی کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دیا۔

"اچھا۔ تم بیٹھو میں ملاحت کو چائے کا کہتی ہوں۔" انہوں نے جان بوجھ کر بیٹی کا نام لیا' تاکہ اس کی موجودگی کی خبر ہو جائے۔

"ارے نہیں خالہ۔ ملاحت کے پاس میرے لیے کہاں وقت ہوگا؟ وہ بہت مصروف ہستی ہیں' آپ ایسا کریں شباہت کو چائے کا کہہ دیں' مجھے اس کے ہاتھ کی چائے اچھی لگنے لگی ہے۔" حسن نے کہا ارفع نے ایک نئی کہانی سنائی۔ ارفع کا ماتھا ٹھنکا پر بیٹے کے لاڈ کو ٹوکنا مناسب نہ لگا۔ اس کی آمد پہ پیدا ہونے والی ان کی گرمجوشی ایک دم سرد مہری میں ڈھل گئی۔ ملاحت کے کانوں تک بھی ساری باتیں پہنچ رہی تھیں۔ عجیب سی گھبراہٹ شروع ہوگئی۔ دل بجھ کر رہ گیا۔ ارفع نے حسن کو اندر بٹھایا اور پھر اسے آواز دے کر حسن کی آمد سے مطلع کیا۔

"لگتا ہے بہت ناراض ہیں۔ پچھلے دنوں کی مصروفیت میں اگنور بھی بہت ہوئے ہیں۔" اس نے دل کی اداسی دور کرنے کے بہانے تراشے۔ ہوا بھی کچھ یوں ہی تھا۔ حسن نے اسے دو دفعہ فون بھی کیا' مگر وہ زیادہ بات نہ کرپائی۔ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ منہ ہاتھ دھوکر بال بنائے۔ کپڑوں پر نظر ڈالی۔ پنک اور وائٹ کاٹن کا سوٹ کافی بہتر حالت میں تھا۔ مسکرا کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی تو شباہت کی چہکتی آواز باہر تک آرہی تھی۔

"شاید حسن کو کمپنی دینے میں مصروف ہے۔ بس انس ہاں کردے تو اس کی بھی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔" ملاحت کا وہی مثبت انداز۔ مگر شباہت بھی ایسا سوچتی تب بات بنتی نہ' وہ تو کچھ اور ٹھانے ہوئے تھی۔

ملاحت پچھلے ہفتے انس کو اپنے ساتھ گھر لے کر آئی تھی۔ کولیگ کہہ کر ملوایا۔ اعزاز کو اس ملاقات کے بارے میں پہلے سے خبر تھی۔ اسی لیے وہ مسکراتا رہا۔ انس سے مل کر فوراً ہی دوستی ہوگئی۔ چھکے چھوڑتا' وہ یہاں بھی چھا گیا۔

"بڑا ہی نیک بچہ تھا۔ کسی اچھے خاندان کا لگتا ہے۔" ارفع کو انس بہت پسند آیا۔ انہوں نے دوسرے روز شباہت کو دیکھتے ہوئے ملاحت سے کہا' پلٹ کر سرہلا کر مسکرادی۔

اتفاق سے دوسرے دن سے ہی وہ چھٹیوں پر چلا گیا۔ باہر جانے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ جو کر رہا تھا۔ اسی لیے ملاحت کی اس سے بات نہ ہو سکی۔ وہ بے خبر۔ بہن کی زندگی میں خوشیوں بھرا اجالا بکھیرنے کے لیے تانے بانے بننے میں مصروف تھی۔ یہاں تو اس کی اپنی دنیا۔ اندھیر ہونے لگی تھی۔

"آج میں حسن کی ساری شکایات دور کردوں گی۔" خیالات کی رو کو اپنی طرف موڑتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے لگی تھی کہ اچانک اپنی جگہ پر ٹھٹک گئی۔ وہ دونوں اس کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔

"سچ پوچھو تو مجھے ملاحت اس لحاظ سے کبھی اچھی نہیں لگی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میری بہنوں نے ہمیشہ تم دونوں کا ذکر اس انداز میں کیا کہ میرا جھکاؤ تمہاری طرف ہوگیا۔ مگر میں اپنی ماں سے اس قدر پیار کرتا ہوں کہ آنکھ بند کرکے ان کی پسند کو اپنالیتا' اگر مجھے وہ بات پتا نہیں چلتی۔" حسن کے لفظوں نے اس کے دل کو جیسے چھید کے رکھ دیا۔

اس کی آنکھوں نے دل کو ڈھونڈا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارتفع کے کانوں میں بھی یہ دکھ بھری باتیں پہنچیں۔

"کون سی بات؟ پلیز بتائیے نا۔" شباہت نے بالوں کو بڑی ادا سے کانوں کے پیچھے اڑسا' کانوں میں پڑا سنہری جھمکا بھی اٹھلایا۔

"کچھ نہیں چھوڑو۔" حسن جھجکا۔ ملاحت پر یہ لمحے بہت بھاری گزرے۔

"پلیز۔ بتا بھی دیں نا۔" شباہت کا انداز موم کردینے والا ہوا۔

"اصل میں۔ ملاحت کا کسی۔ انس نامی لڑکے سے افیئر چل رہا ہے۔ وہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا ہے جہاں محترمہ شام کی کلاسز لیتی ہیں۔" حسن کی آواز گویا تیزاب۔ ملاحت جھلستی چلی گئی۔

"اللہ ایسا تماشا کر جائیں گی۔ جب ہی تو ایک ہفتے پہلے اسے ہم سب سے ملوانے لائی تھیں۔ ویسے اچھا خاصا ہینڈسم بندہ ہے۔" شباہت کے الفاظ نے جلے پہ نمک چھڑکا۔

"یا اللہ۔" ملاحت نے دیوار کا سہارا لے کر آسمان کی طرف شکوہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ ملاحت کو لگا کہ اس کا دل بس اب بند ہی ہوجائے گا۔

"اصل میں۔ میرے دوست ارحم کا بھائی اسی کوچنگ میں پڑھتا ہے۔ جہاں یہ دونوں پڑھاتے ہیں۔ دو دن قبل جب میں اس سے ملنے گیا تو اتفاق سے باتوں کے درمیان ملاحت کا ذکر نکلا۔ تب اس نے جھجکتے ہوئے ان دونوں کے حوالے سے وہاں پھیلی ساری کہانی سنائی۔ بقول اس کے آج کل مس ملاحت اور سر انس ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سارے اسٹوڈنٹس میں اسی قسم کی باتیں گردش کررہی ہیں۔" حسن کا لہجہ افسردگی سے معمور ہوا۔

"میں خود اتنے دن سے پریشان ہوں۔ اسی لیے میں باتوں پر یقین کرنے کے بجائے اسے جھٹلا دیا۔ پر وہ مجھے اپنے ساتھ۔ اسی کوچنگ سینٹر میں لے گیا۔ وہاں جاکر دوسرے لڑکوں کی زبانی بھی ان دونوں کی داستان سنی۔ میرا سر تو دوست اور اس کے بھائی کے سامنے شرم سے جھک گیا۔ اگر ملاحت مجھے پسند نہیں کرتی تو انکار کردیتی۔ میری بھولی بھالی ماں کو بھی بے وقوف بنایا۔" حسن کا لہجہ تیز ہوا۔ بجائے اس کے کہ شباہت بہن کی طرف داری کرتی اس کی دلی خوشی میں لگ گئی شاید اس کے دل کی مراد پوری ہوگئی تھی۔

"چھوڑیں۔ منع کریں۔ آپ کے لیے لڑکیوں کی کمی کی ہے۔" اس نے ٹھنڈی ہوتی چائے کا کپ جلدی سے حسن کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں مگر کردار کی کمزوری ناممکن۔ اتنے آزاد ملک میں رہتے ہوئے بھی میں نے ایک شفاف زندگی گزاری ہے۔ ملاحت بہت خوب صورت نہ سہی' تاہم کردار کی پکی ہوتی تو بھی میں اسی کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی بہنوں کے سامنے اس کے لیے اسٹینڈ لے لیتا۔ مگر اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔ اب چاہے وہ سونے کی بھی بن جائے۔ میرا دل اسے قبول نہیں کرے گا۔" ملاحت جو حسن کو سچائی بتانے جارہی تھی۔ یہ سب سننے کے بعد اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ حسن کو اعتبار نہیں۔ اس سے تعلق رکھنے کا کیا فائدہ۔ اب وہاں مزید کھڑے رہنا بے کار لگا۔ جاتے جاتے حسن کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ اتنا نازک معاملہ تھا اس لیے میں نے خود جاکر تحقیقات کی۔ اس لیے اب ملاحت سے شادی کرنا مشکل ہے۔ ایک ہفتے سے ہمارے گھر میں یہی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ دونوں بہنیں میرے ساتھ ہیں' پر امی اپنی دوستی خراب نہیں کرنا چاہتیں۔ بھلے بیٹے کی زندگی خراب ہوجائے۔ ابھی بھی ان سے لڑکر آیا ہوں کیونکہ ان کو میری باتوں پر یقین نہیں۔ وہ مجھے ہی غلط ٹھہرا رہی ہیں۔" ملاحت کو آمنہ خالہ کے خلوص پر شبہ نہیں تھا۔ وقت نے ان کی اچھائی کا ایک اور ثبوت

پیش کر دیا۔

"اچھا۔۔۔ تو آپ نے جواب میں ان سے کیا کہا؟" ایک سوبڑی بی بی رلہ کا کالانا بنی ہوئی ہیں۔ شباہت نے بظاہر فکر مندی سے پوچھا۔ مگر دل ہی دل میں دانت کچکچا کر سوچا۔

"میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر بات ارفع خالہ کی بیٹی سے شادی کرنے کی ہی ٹھہری۔۔۔ تو شب بھی تو ان کی بیٹی ہے ٹھیک ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ لوگ نکاح کی تاریخ طے کر آئیں۔" حسن نے بتایا تو شباہت کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پر حسن کے فیصلے سے ان کے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

"جب بڑی نہیں۔۔۔ تو چھوٹی بھی کیوں؟" ارفع نے آمنہ کو بری جھنڈی دکھا دی۔۔۔ جو بیٹے کے مجبور کرنے پر ایک بار پھر ان کے آگے دامن پھیلائے کھڑی تھیں۔ پر اس بار وہ شباہت کی طلب گار نہیں۔۔۔ ملاحت نے ملی اور اعزاز کو بڑی دقتوں سے منا کر۔۔۔ پھر کہ بھی سر کیا۔

"صرف نکاح نہیں ہوگا بلکہ شب کی رخصتی بھی ساتھ ہی کر دی جائے گی۔ اس کے بعد ان کا ہم سب سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔" ارفع نے منت کے مجبور کرنے پر ایک فیصلہ سنا دیا۔ دونوں خاندانوں کے درمیان بات اتنی خراب ہو چکی تھی کہ حسن نے اسی میں عافیت جانی۔

"فی الحال۔۔۔ شادی تو ہو جائے پھر ان کو بعد میں منا ہی لوں گی۔" شباہت نے خوشیوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے سوچا۔ آمنہ نے چند قریبی رشتے داروں کو مدعو کیا۔ نکاح مسجد میں سادگی سے ہو گیا۔ شادی کی تقریب ایک ہفتے بعد کی رکھی گئی۔

جس دن شباہت کا حسن سے نکاح ہوا۔ ملاحت نے بڑا حوصلہ دکھایا۔ پر وہ رات اس پر بہت بھاری گزری۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کس کی بے وفائی کا ماتم کرے۔ اپنے پرائے کس کس کو۔ اپنی آرزوؤں کا قاتل کہے۔

☆ ☆ ☆

دروازہ پر اچانک ہونے والی دھڑ دھڑ پر وہ چونک اٹھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے اعزاز ایک شاپر لیے کھڑا تھا۔ "آپا۔۔۔ یہ میں آپ کے لیے شباہت باجی کی شادی میں پہننے کے لیے ریڈی میڈ سوٹ لایا ہوں۔" اعزاز نے بڑے اشتیاق سے شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاپر کھولا میرون رنگ کا قیمتی شیفون کا کامدار سوٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"ارے۔۔۔ تمہیں کب سے۔۔۔ خواتین کی شاپنگ کا تجربہ ہو گیا؟" اس نے چھوٹے بھائی کا ہاتھ چومتے ہوئے پوچھا۔ دل جو دکھوں سے چور ہو رہا تھا۔ بھائی کی محبت کے چھوٹے سے اظہار نے وحشتوں میں کمی کر دی تھی۔

"مجھے پتا تھا۔ ساری دنیا کا خیال رکھنے والی۔۔۔ میری پیاری آپا اپنے معاملے میں لاپروا ثابت ہوں گی۔ اسی لیے پھپھو خالہ کو لے کر بازار نکل گیا۔ ان کی پسند اچھی ہے۔" اعزاز نے بہن کا ہاتھ تھام کر پیار سے کہا۔ ملاحت نے غور سے جوان بھائی کو دیکھا۔ اچانک اس کا قد ان دونوں بہنوں سے اونچا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک وہ پیار میں لے ڈالیں۔

حسن نے ولیمہ کی تقریب بڑے ہوٹل میں منعقد کی۔ دلہن بنی شباہت کا حسن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ مشہور ڈیزائنر کے تیار کردہ گلابی سنہری بھاری عروسی لباس میں حسن کے پہلو میں بیٹھی وہ مغرور لگ رہی تھی۔ ثمین اور شائستہ دونوں حسین بھاوج کے ساتھ تصاویر بنواتے ہوئے خوب اترا رہی تھیں۔ عائشہ الگ تھلگ سی رہی اس کی ہمدردیاں ملاحت اور ارفع خالہ کے ساتھ تھیں۔

☆ ☆ ☆

"آج کل کہاں چھپتی پھر رہی ہو ملاحت؟" انس نے موقع ملتے ہی ملاحت کو جا پکڑا۔ جو ایک ہفتے سے

اسے دیکھ کر کئی کترا جاتی۔ آج وہ جیسے ہی کلاس سے لے کر نکلی انس اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب... میں سمجھی نہیں... تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیوں چھپاؤں گی؟" ملاحت کے خشک لہجے اور استفسار پہ انس کچھ گڑبڑایا۔

"بات یہ ہے کہ میرا دبئی جانے کا معاملہ سیٹ ہو گیا ہے۔ اگلے مہینے میں جا رہا ہوں۔ اس لیے امی کو تمہارے گھر رشتے کے سلسلے میں بھیجنا چاہ رہا تھا۔" انس نے اس کو اکٹھا کہا تو جلدی سے مدعا بیان کر دیا۔

"اب کیا فائدہ۔ شباہت کی تو شادی ہو گئی۔" ملاحت کو لگا کہ وہ اس کی بہن کے سلسلے میں بات کر رہا ہے۔

"ارے... میڈم کہاں کھو گئیں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں امی کافی دنوں سے تمہارے گھر آنا چاہ رہی ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں انہیں آج شام لے کر آ جاؤں؟" انس نے اسے تفصیل سے سمجھایا۔

"تمہیں شاید خبر نہیں ہے۔ ایک ہفتے قبل ہی تم نے شب کی شادی کی ہے اور یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ میں کسی کو انوائیٹ بھی نہ کر سکی۔" وہ ہڑبڑا کر انس ہوش میں آیا۔ ملاحت کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی۔ اس نے جلدی جلدی بات بنائی اور اپنی جان چھڑانی چاہی۔ اسے خود پر بہت بھروسا تھا۔ مگر دنیا کی کمی زبان سے بہت خوف آنے لگا تھا۔ انس کے ساتھ بلاوجہ بننے والے اسکینڈل نے... اس کا اپنی ذات پر سے یقین کم کر دیا۔ اسی لیے وہ بات کو جلد ختم کرنے کے موڈ میں تھی۔

"بات طویل ہو رہی ہے۔ یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں۔ قریب ہی کافی شاپ واقع ہے وہاں تک چلتے ہیں۔" انس نے اس کے گھبرائے ہوئے انداز کو دیکھ کر آفر کی۔

"شاید یہی مناسب رہے گا۔" ملاحت نے سنجیدگی سے کہا اور قدم بڑھا دیے۔ اتنی باتیں بننے کے بعد اسے انس کے ساتھ کافی شاپ تک جانا بھی بہت کھل رہا تھا۔ پر آخری بار ساری باتیں کلیئر کرنے کے لیے اس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا۔

"یہاں بیٹھ کر آرام سے بات چیت ہو سکے گی۔ سر راہ یوں کھڑے ہو کر گفتگو کرنا کافی نامناسب لگ رہا تھا۔" وہ شاپ کے پرسکون ماحول میں داخل ہوئے تو انس نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھالی اور مدور سے بولا۔ اس نے گردن ہلا کر تائید کی۔

"ملاحت! ایک بات یاد رکھنا۔ تمہارے متعلق کوئی بات میرے لیے بریکنگ نیوز نہیں ہوتی کیونکہ شاید تم خود اپنے بارے میں اتنا نہیں جانتیں۔ جتنا کہ میں تمہاری خبر رکھتا ہوں۔ تو یقین رکھو مجھے تمہاری بہن کی شادی کی اطلاع بھی پہلے سے تھی اور چونکہ مجھے شرکت سے باہر کیا ہوا تھا اس لیے مبارک باد دینے نہیں آ سکا۔" انس کے انداز گفتگو نے ملاحت کی جان جلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ بدلا انداز... اس کی نگاہوں میں چھپی حیرانی نے انس کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"چلو بھئی خدا خدا کر کے تو میری مشکل آسان ہوئی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جب تک تم شب کی شادی نہیں کرو گی۔ اپنی طرف توجہ بھی نہیں دو گی خیر اب تو معاملہ بھی حل ہو گیا نا اب تو تمہیں شادی کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے؟" انس مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا جانے کیوں وہ... ان باتوں پر انس کو ایک ٹکا سا جواب بھی نہیں دے پائی۔ شاید اس کی آنکھوں سے بہتی محبت کی دھار نے ملاحت کو سختی اختیار کرنے سے روک دیا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ پلیز مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" ملاحت نے اس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ شفاف شیشے کے پار جھانکتے ہوئے سرسبز نظاروں نے... آنکھوں کو تراوٹ بخشی۔

"دیکھو... اللہ نے انسان کو بے شک انسان کے لیے ہی پیدا کیا اور جو کچھ تم نے اپنی فیملی کے لیے کیا۔ وہ تمہاری نیکی اور ذمہ داری بھی تھی۔ لیکن اب وہ

وقت آگیا ہے کہ تم بھی اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت تمہارے دماغ میں چل رہا ہوگا کہ یا اللہ ویٹر جلدی سے کافی لے آئے اور میں گرم گرم کافی پیوؤں اور یہاں سے نکلوں۔" انس نے اس طرح منہ بنا کر کہا کہ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جسے چھپانے کے لیے اس نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی جانب آتا ہے اور انسان کی موت آتی ہے تو اسے تمہارے جیسی کسی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔" انس نے اسے مسکراتے دیکھ کر جل کر کہا۔ ملاحت لفظ "محبت" پر ایک دم شاک رہ گئی۔ اتنا کھلم کھلا اظہار۔

"دیکھو ملاحت! جانے تمہیں اس بات کی خبر ہے یا نہیں۔ پر میں جانے کب سے تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے کافی میں چمچ چلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ملاحت نے نگاہیں اٹھائیں۔ بلاشبہ اس کی شاندار شخصیت کسی کو بھی اپنا دیوانہ بنا سکتی تھی۔

"پلیز۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔ ویسے بھی میرے نزدیک یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔" وہ کہہ گئی۔ اس کا بے لچک لہجہ۔ انس کو [illegible] کر گیا۔ وہ ایک دم اپنی محبت کے لیے جذباتی ہو اٹھا۔

"پلیز! میں نے تمہیں اپنے تنہائی خالص لمحوں میں چاہا ہے۔ میری محبت بس اظہار کا نام نہیں' بلکہ اس کے پیچھے اخلاص چھپا ہوا ہے۔ اتنا یقین دلاتا ہوں کہ جس پل تمہیں اپنا بنا کر لے جاؤں گا۔ تمہیں خوش رکھنے کی تاعمر کوشش کروں گا۔" انس کی جذبے لٹاتی آنکھیں' جذبات لٹاتا لہجہ اور دل کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی آواز ملاحت کو کسی اور ہی دنیا میں لے گئی' لیکن وہ بہت محتاط لڑکی تھی۔ فوراً ہی حقیقی دنیا میں واپس ہوئی۔

"کیا مطلب... میں کچھ سمجھی نہیں۔" وہ سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنا چاہتی تھی۔ انس کے بدلے بدلے انداز نے محتاط کر دیا تھا اور اب انس کی نگاہ سے ملی تو وہ چور سی ہو گئی۔

"کیا ہے یار... اب بھی مطلب پوچھا جا رہا ہے۔ میں اپنے سر پر کافی کی پیالی الٹ لوں گا۔ پچھلی کتنی دفعہ تو دبی زبان میں اپنے دل کا عندیہ دینے کی کوشش کی اور اب منہ کھول کر شادی کا کہہ رہا ہوں تو بھی سمجھ نہیں آرہی۔ کیا تم کسی اور کے دل کی کبھی بھی سن سکتی ہو۔ پہلے بھی تمہیں شادی کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا کہہ کر اشارے کنایوں میں اپنے دل کی بات سمجھانا چاہا۔ پر اس وقت بھی... تم پر اپنی چھوٹی بہن سوار تھی۔ جب دیکھو اس کے ذکر خیر میں مصروف ہو جاتیں۔ میں اس وقت ہی سمجھ گیا کہ تم اپنی چھوٹی بہن سے پہلے شادی کے لیے راضی نہیں ہو گی۔ اسی لیے اتنا وقت چپ سادھے رکھی۔ اب اللہ نے کرم کیا۔ یہ فریضہ بھی حسن و خوبی ادا ہو گیا تو اب صرف یہ بتاؤ کہ میں اپنی امی کو لے کر تمہارے گھر آؤں؟ میں نے ان سے تمہارا ذکر کیا ہوا ہے۔ ذرا امپریشن جمانے کے لیے کچھ تعریفیں بھی کر دی ہیں۔ باقی تم سنبھال لینا۔ آخر وہ اپنے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے لیے بے تاب ہیں۔" اس نے بڑے مان سے اس پر اپنا حق سمجھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ مگر ملاحت کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس کے تو جیسے پیروں تلے زمین ہی نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ ایسا تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

ملاحت کا ایسا اترا چہرہ دیکھ کر انس کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ کتنے عرصے سے ملاحت سے متاثر تھا۔ اس کے کردار کی پختگی۔ ہمدردانہ طبیعت اور نرم مزاجی۔ اسے اپنی ماں کے ساتھ گزارہ کرنے کے لیے ایسی ہی کسی سمجھ دار لڑکی کے ساتھ کی خواہش تھی۔ ویسے بھی وہ ظاہری شخصیت کی جگہ باطنی خوبیوں کا شیدائی تھا اور ملاحت میں یہ دو خوبیاں تھیں۔

"سوری انس... شاید تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابا کے بعد میں نے ہی اپنے گھر کی ذمہ داری اٹھائی' مجھے قسمت نے بیٹا بنایا سو۔

واقعی بڑی بن گئی۔ بہن کی شادی ہونے کے باوجود میری ذمہ داریاں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ میری بیوہ ماں ہے۔ مجھے چھوٹے بھائی کو اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیجنا ہے۔ ان حالات میں تم خود ہی سوچو اپنے بارے میں سوچنے کا وقت کہاں ہے؟" ملاحت نے سلیقے سے تمہید باندھی۔ اسے آج احساس ہوا کہ انکار کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ خاص طور پر جب کوئی آپ سے شدید محبت کرتا ہو۔

"کوئی بات نہیں۔ تم کہو تو۔ میں زندگی کے آخری موڑ تک تمہارا انتظار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔" انس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ملاحت کو پیش کش کی۔ وہ ایک دم وحشی لگنے لگا۔ "ایک بات اور ہے۔ اگر میں شادی کا سوچوں بھی تو وہ شخص تم ہرگز نہیں ہو سکتے کیونکہ تم میرے کولیگ ہو۔ یہ بات سب جانتے ہیں اور تم سے کسی طرح کے تعلق کا مطلب لوگوں کو موقع دینا کہ وہ اس بات کو غلط رنگ دیں۔ تم سے شادی کا مطلب دنیا کی جھوٹی باتوں کو سچ ثابت کرنا ہوگا۔ ویسے تم نے میری بے تکلفی کو بہت ہی غلط رنگ دیا۔" اس سے پہلے کہ وہ بکھر جاتی، جلدی سے یوں۔ اس نے خود کو پھر اسی خول میں بند کر لیا۔ انس کو کچھ دیر پہلے انس کی باتوں نے توڑ دیا تھا۔ وہ انس کو افسردہ چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

انس کو انکار کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو بہت زیادہ مصروف کر لیا۔ اس کی محنت اور لیاقت کے بل پر قائم اس کے کوچنگ سینٹرز۔ طالب علموں کا مرکز بن گئے۔ اس کا نام معتبر ٹھہرا، روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے دل کا خانہ خالی ہی رہا۔ دنیا کا تنہا مقابلہ کرتے کرتے وہ کئی بار ہمت ہاری۔ کتنی بار سے تو اسے کسی ہمدرد کو پکارا مگر پھر سنبھل گئی۔ اچانک زندگی نے ایک اور بڑا دکھ اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ امی۔ اس کی شادی کی حسرت لیے دنیا سے ہی چلی گئیں۔ اعزاز پہلے ہی تعلیم کے حصول کے لیے آسٹریلیا جا چکا تھا۔ شباہت سے رسمی رابطہ۔ وہ خود کو دنیا میں ایک دم تنہا محسوس کرنے لگی۔

بڑے وقت میں اسے فون کرتا پھر اسے احساس ہوا زندگی تنہا نہیں گزرتی۔ کوئی ہمدم غمگسار ہو تو کٹھن لمحے بھی گلاب بدن جاتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

"میڈم جی۔ ایئرپورٹ آگیا ہے۔" ڈرائیور نے بہت دیر تک ملاحت میں جنبش نہیں دیکھی تو مجبوراً اسے پکارا۔ وہ چونک کر ماضی کے سفر سے حال میں واپس چلی آئی۔ بیگ کاندھے پر لٹکایا، چشمہ بالوں پر ٹکایا اور ایئرپورٹ کے لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ آدم خان نے دور جاتی بی بی کو دیکھا۔

"بی بی۔ بھی بالکل اخروٹ جیسا ہے۔ اوپر سے سخت، پر اندر سے کتنا نرم۔" آدم خان کی نگاہوں میں احترام ابھر آیا۔ ملاحت نے ہمیشہ بغیر تقاضا کیے اس کی مالی امداد کی۔ وہ اپنی محسن کو دعائیں دیتے نہیں تھکتا۔

کتنے سالوں بعد دونوں بہنیں آمنے سامنے کھڑی ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ شباہت اس کی شاندار شخصیت دیکھ کر جھجک سی گئی۔ ملاحت بہن کی زرد صورت اور چہرے پر چھلکتی بے رونقی سے حیران۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ ویسے بھی اب اس کے اندر بہت ٹھہراؤ آچکا تھا۔ وقت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ شباہت سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ دوڑ کر بہن سے لپٹ کر رو دی۔ ملاحت بھی ملائی بن گئی۔ بہن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلاسا دیا۔ ماں کا رونا دیکھ کر اس کے دونوں بھانجے حیران ہوئے، پھر خود بھی رو پڑے۔ ملاحت کو ان دو ننھے گیلوں سے بچوں پر بہت پیار آیا۔ بڑھ کر انہیں اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ ان کے گالوں کو چومتے ہوئے وہ سرشار ہو گئی۔ حسن سلمان کی ٹرالی کھسکاتا بہت ہی بے زار لگ رہا تو ملاحت کو احساس ہوا کہ یہ لوگ بہت لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔ اس نے فوراً سامان گاڑی میں رکھوانا شروع کر دیا۔

٭ ٭ ٭

"رات ہو چکی تھی۔ دو آیا کا بات جوار

تھا۔" شباہت نے بڑے دنوں بعد سیر ہو کر کھایا تو پروین خالہ کی تعریف کی۔ وہ سب کو قہوہ پیش کرتے ہوئے متانت سے مسکرا دیں۔ ماں کے گزر جانے کے بعد تنہا رہ جانے کے خیال سے پھر ملاحت ان کو ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے گئی۔ یوں دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی۔

"بیٹا۔ اب آئی ہو تو۔ ملائی کی شادی کر کے ہی جانا۔ بچی نے اس گھر کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ اب کچھ تم لوگوں کا فرض ہے۔ ایزی میاں سے بھی بات کرو۔ اس معاملے میں مزید دیر مناسب نہیں۔" شباہت کچن میں جھوٹے مگ رکھنے آئی تو۔ کچن صاف کرتی پروین خالہ نے شباہت کو چپکے چپکے سمجھایا۔ اس کو لگا کہ زخموں کے منہ کھل گئے۔ پہلی بار اپنے اوپر غصہ اور بہن پر پیار آیا۔

"میں ہی تو ہوں۔ سارے حالات کی ذمہ دار۔ یہ جس محبت کو جنون بنا کر خود پر سوار کیا۔ اس کے حصول کے بعد بھی دل خالی ہی رہا۔" شباہت کو پچھتاووں نے آگھیرا۔ اس نے بڑی بہن سے بات کرنے کی ٹھانی۔ سب رات کے کھانے کے بعد بڑے کمرے میں جمع ہو کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ حسن کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھا۔

"آپا۔ میں آج آپ کے ساتھ سونا چاہ رہی ہوں۔ آپ ڈسٹرب تو نہیں ہوں گی؟" شباہت نے فوراً ہی بہن کے گلے میں بانہیں ڈال کر فرمائش کی۔ اس کے رویے کی اتنی تبدیلی۔ ملاحت کو ناقابل یقین سی لگی۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب ملاحت شب سے بات کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔ ایک یہ وقت آیا کہ شباہت کو ڈر ہوا کہ بہن نے انکار کر دیا تو شوہر کے سامنے سبکی ہو گی۔ اسی لیے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ شاید یہ وقت ہی ہے جو اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا ہے۔

"شب۔ ڈسٹربنس کا کیا سوال؟ چلو اسی بہانے دل کی باتیں کر لیں گی، یادوں کو تازہ کریں گے۔ جانے پھر کب تمہارا پاکستان آنا ہو۔" ملاحت کے چہرے پر دکھ کے بادل چھائے تو شباہت کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

حسن نے گھوم پھر کر پورے گھر کا جائزہ لیا۔ اسے ملاحت کا یہ نیا۔ شاندار سا گھر بہت پسند آیا۔ حسن تو ملاحت کی ترقی اور شخصیت دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ "یہ پہلے بھی اتنی پیاری تھی کیا۔ اب اتنی خوب صورت لگنے لگی ہے۔" اس نے شیشے کے پار سے فیضان کو گدگدی کرتی ملائی کو بغور دیکھا۔ جس کے چہرے پر پیسے اور تعلیم نے اس میں جاذبیت اور نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وہ مبہوت سا دیکھے گیا۔ وہ جس سے اب رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی۔

"اف اس لڑکی نے خود کو کتنا محروم کیا ہے۔" حسن کا تجزیہ خاصی حد تک درست تھا۔ صاف و شفاف چمکدار چہرہ۔ آنکھوں کی خوب صورتی جو چشمے میں کم ہو گئی تھی۔ اب لینس لگانے کی وجہ سے ابھر آئی۔ نئے انداز میں ترشے ہوئے بال اس پر غضب کی سج رہی۔ قابلیت کا تو وہ پہلے ہی مداح تھا۔ یہ وہی ملائی ہے جسے اس نے بلاوجہ کی باتوں میں آ کر ٹھکرا دیا۔ پچھتاوے کے بادل دل پر چھانے لگے۔

"اونہہ۔ مجھے کیا ملا؟ شباہت جیسی بدزبان اور ست الوجود عورت۔" حسن نے عام مردوں کی طرح بیوی کا موازنہ کیا۔

"اللہ کی پناہ۔ میں کس طرح سے سوچ رہا ہوں۔" اس نے اپنی بھٹکی نگاہوں پر اخلاقیات کا جال پھینک کر توبہ کیا۔ فوراً اپنی غلط سوچ پر خود کو جھڑکا اور چھوٹے بچے کو گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگا۔ جو اسے ڈھونڈتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ وقت نے ملاحت پر اچھے اثرات مرتب کیے تو شباہت کے ساتھ اس کا الٹ ہوا۔ اس کی وہ خوب صورتی جس پر وہ ناز کرتی تھی جیسے کسی نے نچوڑ لی ہو۔ زردی مائل پتلا سا چہرہ جس کی شادابی کہیں کھو گئی تھی۔ گھنے بال وقت سے پہلے سفید ہو گئے۔ جسے وہ باقاعدگی سے ڈائی کرنے لگی تھی۔ باہر کی تیز رفتار زندگی نے شاید اسے وقت سے

پہلے ٹھکرا دیا۔ ویسے بھی اسے تو شروع سے ہی خدمت کروانے کی عادت تھی۔ اب یہاں جو سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرنے پڑے تو مہینوں میں ہی عشق ہوا ہو گیا۔ سرد ملک، مشینی لوگ اور مشینی سی زندگی، وہ پہلے تو بہت ہی گھبرائی۔ کس سے شکوہ کرتی، اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ خود ہی بھگتنا پڑے گا۔ اس کے سارے خواب ادھورے رہ گئے۔

"دور کے ڈھول سہانے۔" اس بات پر شجاعت کو آسٹریلیا پہنچ کر یقین آیا۔ اس کی آنکھوں میں حسن کے ساتھ زندگی گزارنے کے جو سپنے تھے، وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ لوگ جو اپنے ملک میں غربت کے باوجود عیاشی سے رہتے تھے۔ بیرون ملک جا کر انہیں ڈالرز دانتوں سے پکڑنا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا۔ جس سے وہ نا آشنا تھی۔ حسن ایک اچھی جاب پر ہونے کے باوجود پریشان رہتا۔ اسے ماں کو گھر خرچے کے پیسے بھیجنے پڑتے تھے۔ آئے دن بہنوں کے فرمائشی پروگرام [illegible] سے بھی انہیں اپنی بہت سی ضرورتوں کا گلا گھونٹنا پڑتا۔ ان حالات میں سپنوں کے تعمیر شدہ سارے محلات دھڑ دھڑ کر کے زمین بوس ہو گئے۔

شکوہ کرتی بھی تو کس سے۔ [illegible] پہلی بار تو آپ کلہاڑی مار بیٹھی تھی۔ اب اسے اپنا پیارا وطن، گلی محلہ، گھر سبھی اپنے یہاں تک کہ ابا کی پیار بھی شدت سے آنے لگی تھی۔ دل بھر آتا تو رونے بیٹھ جاتی۔ حسن مقدور بھر کبھی دینے کی کوشش کرتا، پر اس کی جاب بہت ٹف تھی۔ سو لوگ گھومنے پھرنے کے لیے بھی ویک اینڈ کا انتظار کرتے۔ کبھی کبھی تو تنہائی سے بیزار ہو جاتی۔

یہ وہ حسن تھا جسے پانے کے لیے اس نے کتنے دل توڑے۔ پر خوشی کہاں تھی؟ وہ اکثر خود سے سوال کر بیٹھتی۔ اسے لگتا کہ وہ پیاسی روح بن کر ریگستانوں میں بھٹک رہی ہو۔ کام کاج میں بھی دل نہیں لگتا۔ حسن بھی اکثر چڑنے لگتا۔ کب تک اس کی ناز برداریاں اٹھاتا۔ چھ مہینے میں ہی ایک دوسرے سے بیزار نظر آنے لگے۔ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔

ہر وقت کی چخ چخ اور فرسٹریشن کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی کہ اچانک ماں بننے کی نوید سنائی دی۔ دونوں بہت خوش ہوئے، پر ایک اور مشکل دور شروع۔

ایقان کے ایک سال بعد ہی ذیشان بھی آ گیا۔ تو وہ ان کے کاموں میں الجھ کر رہ گئی۔

بڑھتے ہوئے اخراجات اور مہنگائی نے سب کو متاثر کیا۔ حسن بھی پریشان رہنے لگا۔ اچانک ہی پاکستان سے آمنہ خالہ کی وفات کی خبر آئی۔ حالات ایسے نہ تھے کہ وہ سب جاتے۔ حسن خود ہی ایک مہینہ وہاں رہ کر پاکستان میں اپنی جائیداد بیچ کر بہنوں کو ان کا حق دے دلا کر واپس آیا۔ اپنے حصے کے پیسوں سے اس نے میلبورن میں الیکٹرونکس سامان کی شاپ کھول لی۔ سارا سرمایہ شاپ پر لگانے کے بعد وہ دونوں خالی ہاتھ رہ گئے۔ ایک اور کٹھن دور شروع ہوا۔ نیا نیا بزنس شروع کیا تھا۔ بڑی جان ماری کرنی پڑتی تھی۔ دکان کے لیے سیلزمین افورڈ کرنا مشکل تھا۔ حسن کو ڈیوٹی دینے آؤٹ ڈور جانا پڑتا۔ مجبوراً اسٹور کی دیکھ بھال کے لیے اسے ہی شوہر کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا پڑا۔

اب زندگی کی مشقتیں بڑھ گئیں۔ سارا دن شاپ کا کام سنبھالتا۔ گھر آ کر بچوں کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ تھک کر چور ہو جاتی۔ شوگر کا مرض ہو گیا۔ وزن کم ہونے لگا تو سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ پیلی رنگت، اب تو حسن بھی اس کی روتی صورت سے چڑنے لگا۔

"یہاں کی خواتین تو عورتیں کام کرتی ہیں اور خوش خرم بھی رہتی ہیں۔ ایک تم ہی انوکھی ہو جو ہر وقت منہ بسورے پڑی رہتی ہو۔"

"کبھی اپنا حلیہ دیکھا ہے۔ عجیب اجڑی صورت بنی رہتی ہو۔" حسن اکثر اسے سخت سست سناتا۔ پر وہ

خاموش رہتی۔ جب دل ہی مردہ ہو گیا ہو تو پھر کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ وہ شباہت تو کہیں گم ہو گئی۔ جو ہر وقت نک سک سے درست رہتی۔ وہ جسے اپنے حسن پر ناز تھا۔ جو سمجھتی تھی کہ ساری دنیا اس کے پیروں تلے ہے۔ پر جب آنکھ کھلی تو۔ حقیقت پتا چلی' وہ تو خسارے میں رہی۔ قسمت سے لڑ کر اپنے لیے وہ سب چھیننا چاہا جو اس کا مقدر نہ تھا۔ کاروبار کچھ ٹھپ ہوا اور انہوں نے ایک چلتے والا سیلز مین رکھ لیا تو وہ لوگ بچوں کی چھٹیوں پر یہاں آ گئے۔

"آج ہم دونوں بہنوں کا ساتھ سونے کا پروگرام ہے۔ پلیز حسن! آپ ذیشان اور ریشان کو اپنے ساتھ سلا لیں۔ ہماری باتوں سے یہ ڈسٹرب ہو جائیں گے۔" شباہت نے شوہر کا بازو تھام کر کہا۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بچوں کی انگلی تھامے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"آپا پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی تھی کہ انس کو آپ نے میرے لیے پسند کیا تھا۔ مگر میری خود غرضی مجھے لے ڈوبی۔ میں جو اس وقت انس کی محبت میں مبتلا تھی۔ حسن سے یہ بات چھپا گئی۔ اگر ان کو حقیقت بتا دیتی تو پھر وہ کبھی بھی مجھ سے شادی نہ کرتے۔" شباہت بہن کا ہاتھ پکڑ کر رو دی۔ ملاحت ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔ بہن کو پانی پلایا۔

یہ حقیقت جان کر اسے دکھ تو ہوا۔ پر اتنے سال گزرنے کے بعد ان باتوں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حسن اس کا بہنوئی تھا۔ اس کی چھوٹی بہن کا شوہر' ملاحت کی زندگی میں اس کی بس اتنی ہی حیثیت تھی۔

"تمہیں انس والی بات کیسے پتا چلی؟ یہ بات تو صرف میرے اور امی کے بیچ میں تھی۔" اسے ایک دم خیال آیا تو سوال کیا۔

"جب آپ انس کو گھر لائی تھیں۔ اس کے دوسرے دن ہی امی نے مجھے چھیڑتے ہوئے یہ بات بتائی اور پوچھ لیا کہ میں کسی سے اس بات کا ذکر نہ کروں' میں تو خوش ہو گئی مگر امی کو اس بات کی ہوا بھی لگ جاتی تو وہ میرا ہاتھ فوراً" ہی اسے تھما دیتیں۔ یوں حسن کے سامنے بھی میں انجان بنی رہی۔ میں نے اپنی بہن کے ساتھ دغا بازی کی' جس کا صلہ مجھے یہ ملا کہ امی اور تم سب سے دور وہاں اکیلے تڑپتی رہی۔ تم خوش قسمت تھیں جو امی کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کی خدمت کر کے تم نے جنت کمالی۔ میں بد قسمت اولاد ٹھہری۔ جو ماں کے آخری دیدار سے بھی محروم ہو گئی۔ کسی کے لیے اس سے بڑی سزا بھلا کیا ہو سکتی ہے؟" شباہت نے اپنے دل کے زخم بہن کے سامنے ادھیڑ کے رکھ دیے۔ ملاحت کو بھی بہن کی حالت پر ترس آیا۔ دونوں بہنیں ماں باپ کو یاد کر کے دل کھول کر خوب روئیں۔ شاید دونوں کو یوں ساتھ دیکھ کر ان کی روح بھی پر سکون ہو گئی ہو گی۔

☆ ☆ ☆

"ارے یہ کیک... کس لیے بھئی؟" انا نے مسکراتے ہوئے ٹیبل پر بلیک فارسٹ کیک کا ڈبہ رکھا۔ ملاحت نے قلم چھوڑ کر حیرانی سے پوچھا۔ شباہت کی دعوتوں اور تھکن کی وجہ سے وہ پورے دس دن بعد اسکول گئی تو ٹیسٹوں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ جسے چیک کرنے کی بھی فرصت نہ ملی۔ اب مزیدار کیک دیکھ کر اس کی بھوک جیسے کھل گئی۔

"ہمم... آپی کی بات طے ہونے کی خوشی میں امی نے خاص طور پر یہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔" انا کی چھوٹی بہن ثنا بھی ساتھ آئی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ انا کے چہرے پر بھی شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ بھئی... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ شادی کب ہے؟" ملاحت نے کیک کا وہ سلائس کھاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا' جو ثنا نے بڑے سلیقے سے کاٹ کر اسے پیش کیا تھا۔

"دو مہینے بعد' اسی لیے میں ریزائن کرنا چاہ رہی تھی۔" انا نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

"ہوں... کوئی بات نہیں۔ تم ریزائن [illegible] ریزائن میں قریشی صاحب سے بات کر لوں گی' ہاں کل

اپنے بھائی کو بھی بھیج دینا۔ میں نے اس کی جاب کے سلسلے میں قریشی صاحب کو بتا دیا تھا۔ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" ملاحت نے کیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے تاکید کی۔ رسمی بات چیت کے بعد دونوں بہنوں نے شکریہ ادا کر کے جانے کی اجازت مانگی۔ تو اس نے سر ہلا دیا۔ ابھی اسے کلفی سارے کام کرنے تھے۔ ملاحت نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا۔

"ثنا ایزی کے ساتھ چلتی' کتنی اچھی لگے گی۔" ہلکی تلی سرو قد ثنا بہن کی کسی بات پر مسکراتی ہوئی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک دم سے جھماکا ہوا۔ چند دنوں بعد امر از کی بھی وطن واپسی تھی۔ اس کے دونوں بھائی' بہن پاکستان میں موجود ہیں۔ ان یادگار لمحوں کو کیوں نہ خوشیوں بھری گھڑی میں بدل دیا جائے۔

"شباہت کی موجودگی میں ہی ایزی کی شادی کا پلان۔۔ مزا آجائے گا۔" اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا اور خوش ہو کر سیل فون پر شباہت کا نمبر ملانے لگی۔ تاکہ شام کو ان کے گھر جا کر اسے ثنا کا بتا دے۔ ملاحت کو یقین تھا کہ ان کی امی اس کے نیک اور ہینڈسم بھائی کو انکار نہیں کریں گی۔

☆ ☆ ☆

گاڑی سے اتر کر وہ پارک کی روش پہ چلنے لگی۔ ہرے بھرے پارک میں داخل ہوتے ہی تازگی کے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ موسم بہار نے ماحول کو قدرتی رنگوں سے سجا دیا تھا۔ فطرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ ہر گوشے نے جیسے ہریالی کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ملاحت کو شرارت سوجھی۔ اس نے اپنے بلیک شوز اتارے اور نشیبی مخملیں سبزے کی چادر پر ننگے پاؤں چلنے لگی۔ گیلی گھاس نے تلووں پر گدگدی کی۔ ایک تسکین آمیز راحت نے اس کی روح تک کو مسرور کر دیا۔ چہرے پر الوہی سی خوشی دوڑ گئی۔ جب دل خوش ہو تو سارے منظر آنکھوں کو بھاتے ہیں۔ وہ بھی آج کل بہت خوش تھی۔

انس بھی اچانک کہیں سے نکل کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ملاحت نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی جینز کا پائنچہ موڑے۔ ننگے پاؤں ہری ہری گھاس پر چل رہا تھا۔ خوشبودار پھولوں' پودوں اور لہلہاتے درختوں کو دیکھتے ہوئے دونوں مسکرا دیے۔ دونوں شوق سے سبزے پر قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ ملاحت نے اس کے ہاتھ میں جوتے دیکھے تو ہنس دی۔

گزرے ماہ و سالوں میں۔۔ انس کی وجاہت میں اضافہ ہوا تھا' جسم پہلے سے بھر گیا تھا۔ اسکائی بلیو شرٹ اور بلیک جینز پہنے' آنکھوں پر سن گلاسز لگائے۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھوں کا اضافہ۔۔ شخصیت پروقار لگ رہی تھی۔ انس کے نزدیک آنے پر اس کی مخصوص خوشبو ملاحت کی ناک سے کیا ٹکرائی۔ وہ ملاحت سے نو عمر لڑکی میں ڈھل گئی۔ دل ایک بار [illegible]۔

انس کی پیاسی نگاہیں ملاحت کو دیکھنے لگیں۔ بلیو جینز پر پنک کرتا' گلے میں بلیو اسکارف۔۔ لمبے بالوں کا جوڑا بنائے' کانوں میں سونے کے ٹاپس' لائنر لگی سنہری چمکتی آنکھیں۔ شفاف لپ جیل نے ہونٹوں کو مزید دل آویزی بخشتے ہوئے جیسے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بالوں پر اسٹائلش سن گلاسز لگائے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت اسٹائلش لگی۔ انس کی نگاہوں میں ستائش تھی۔ ملاحت مسکرائی۔

دونوں پارک میں نصب سنگ مرمر کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ان کی خاموشی بھی محسوس کی جانے والی تھی۔ آخر انس نے اس خاموشی کو توڑا۔

"ملاحت۔۔ تم جانتی ہو کہ آج میں نے تمہیں فون کر کے خاص طور پر یہاں ملنے کے لیے کیوں بلایا ہے۔" یہ وہ سوال تھا جس کا جواب دونوں کو آتا تھا۔ پھر بھی ملاحت نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تم مجھے جانتی ہو... میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔ امی آج کل بہت بیمار رہنے لگی ہیں۔" وہ دکھی ہو کر بولا تو اسے بھی افسوس ہوا۔

"وہ اپنی زندگی میں مجھے آباد دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے مجھے شادی کے لیے دوبارہ مجبور کرنا شروع کر دیا۔" اس کے چوڑے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا۔

"ہاں... تو اس میں برائی کیا ہے؟ نیک کام میں کیسی دیر۔" ملاحت نے مسکرا کر چھیڑا۔ تو وہ جل بھن گیا۔

"پلیز ملاحت پلیز... اب میری محبت اور صبر کو مزید مت آزماؤ۔ میں بہت تھک چکا ہوں۔"

"مگر اب تو میں... ایری کی شادی کرنے جا رہی ہوں۔ ایسے میں اپنی شادی کا سوچتی کیسی لگوں گی؟" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"بات سنو... تم نے اپنے اوپر بزرگی کا جو خول چڑھا



لیا ہے پلیز اسے اتار پھینکو۔ اتنی بھی بڑی نہیں ہوئی ہو جتنا بنتی ہو؟" انس بری طرح سے چڑ گیا تو ایک شوخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جھانکنے لگی۔ کبھی کبھی کا حق جتانا۔ ہم سے ہمارے لیے ہی لڑنا۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔ ملاحت کے محسوسات کچھ ایسے ہی ہو گئے۔

"اچھا... دیکھو میرے دونوں چھوٹے بھائی بہن کی اس معاملے میں کیا رائے ہوتی ہے۔" وہ نیم رضامند دکھائی دی تو انس کی باچھیں کھل گئیں۔

"عزیزی کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن لگتا ابی کی یقین دہانی پر... میں نے پاکستان کا ٹکٹ کٹوا لیا ہے۔" انس کا انداز شرارتی ہو چلا۔

"کیا مطلب... ابی بھی نہیں؟" ملاحت نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ جو بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

"ابی نے مجھے کال کی تھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس لوٹ رہا ہے۔ اور سب سے پہلے تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ بقول اس کے۔ تمہاری زندگی ان لوگوں کے لیے قربانیاں دیتے گزری ہے۔ اس لیے تمہیں بھی خوشگوار طریقے سے جینے کا حق ملنا چاہیے۔" انس نے ملاحت تک بھائی کے جذبات پہنچائے تو اس کی آنکھ بھر آئی۔

"ویسے ملام... ایک راز کی بات بتاؤں... اعزاز تو بہت غصے میں تھا۔ کہہ رہا تھا کہ فون پر تم سے شادی کے لیے بول بول کر تھک چکا ہے۔ اب پاکستان آ کر تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈولی میں ڈال کر میرے ساتھ رخصت کروے گا۔" اس نے اعزاز کی باتوں میں مطلب کی آمیزش کی تو ملاحت نے اسے گھور کر دیکھا۔ انس کا قہقہہ اتنا بلند ہوا تو جوگنگ کرنے والے ایک جوڑے نے مسکرا کر ان دونوں کو دیکھا۔

"پلیز تم اپنی اس جناتی ہنسی پر قابو رکھو یہ پبلک پارک ہے کیوں تماشا بنا رہے ہو اور میرے بھائی کی باتوں کا مطلب اپنے حساب سے تبدیل کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔" ملاحت لوگوں کو دیکھ کر شرمندہ سی ہوئی۔ وہ پیار سے اسے دیکھا کیا۔ اس کا حق جتاتا انداز کتنا بھلا لگ رہا تھا۔

"کچھ۔ اس نے ایسے ہی کہا تھا یقین نہیں آیا تا کل ملاؤں ویسے بھی وہ سوچا ہو گا اپنی بیوی کے لیے راستے کے خار چن دے۔" وہ مکمل طور پر شرارت پر آمادہ اسے مسلسل چھیڑے جا رہا تھا۔

"اچھا۔ خیر آگے کی سنو۔ سالی صاحبہ سے کل ریڈی میڈ مانگ چکا ہوں۔ جب ہی تو اس نے حسب منشا سجا سنوار کر ساتھ بھیجا ہے۔" انس بالائی بالا سب کچھ طے کر کے آیا تھا۔ جب ہی تو۔ شباہت نے کرید کرید کر انس کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ فون نمبر تک مانگ لیا تھا اور اس سے ملنے پر مجبور بھی کیا۔

"تم۔ بڑی کمال کی چیز ہو۔ سب کو اپنی طرف کر لیا۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے بچا ہی کیا ہے؟" ملاحت نے تھک کر ہار مان لی۔ تو وہ تو لب سجالیا۔

"جی۔ جناب۔ پھر ماننی ہوتا مجھے۔ دنیا نے شباہت اور حسن بھائی سے تمہاری پہلی ہوٹل میں ملاقات کی اور بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے پر رہو۔ کیونکہ تمہاری سس اور بھائی شادی کے معاملے میں تم سے بات کرنے میں جھجکتے تھے۔

یوں جانو اب سارے ووٹ میری طرف ہو چکے ہیں۔ بلی فکریں میرے لیے چھوڑ کر۔ بس۔ تم اپنی خیر مناؤ۔ گاجے باجے کے ساتھ لینے آؤں گا ڈولی میں بٹھا کر۔ اوہو۔ غلط بول دیا۔ ہوائی جہاز میں بٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔" انس گنگنایا۔ کافی دیر ہو چکی تھی دونوں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ملاحت نے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے سر اٹھا کر تازہ ہوا۔ اپنے اندر اتاری۔ رنج والم کی ان دیکھی زنجیریں جیسے کٹ گئیں۔ ان کے دل ایک ہی لے پر آزادی کے گیت گنگنانے لگے۔ سب کچھ ایک دم انوکھا سا لگنے لگا۔ ملاحت نے سرخ ہوتے افق کو دیکھ کر انس کو بھی اشارہ کیا۔ وہ دونوں مبہوت ہو کر فطرت کے نظاروں میں گم ہو گئے۔

سورج ڈوبنے کی تیاریوں میں مصروف۔ سرخ گولا بنا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ بغیر چھوئے محسوس کیا۔ دکھ بھرے دن طویل سہی گزر ہی جاتے ہیں۔ ہجر کا سورج بھی ڈوبنے کو تھا۔ ملن کا چاند جو چمکنے والا تھا۔

☼

حنا یاسمین

بارش کے بعد

سوں سوں کرتی آواز کے ساتھ اس نے کوئی تیسری دفعہ سسکی بھری تھی۔

"او ہو... نہ سوں بیٹا! مریض کے پاس بیٹھ کر رونا بدشگونی ہوتی ہے۔" گلزار پھپھو نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے تنبیہ کی۔

"کیا کروں پھپھو! امی کی طبیعت ہے کہ بگڑتی ہی جارہی ہے۔"

"بس بیٹا! پتا نہیں کس بدفطرت کی نظر کھا گئی آمنہ کو۔" پھپھو نے سارے جہاں کی افسردگی لہجے میں سموتے ہوئے کہا۔

"زین نہیں آیا ابھی تک؟"

"پھپھو! اس کے ایگزامز ہونے والے ہیں۔ اکیڈمی جاتا ہے اس لیے لیٹ ہو جاتا ہے۔" وہ ٹیبل سے کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔

پھپھو نے اطمینان سے دونوں ٹانگیں پلنگ پر رکھ کر کمرے کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کر دیا۔

"بیٹا! یہ دیواریں دیکھو کتنی میلی میلی سی ہو رہی ہیں سو ذرا یہ صاف کر لیا کرو۔"

اس نے گھبرا کر دیواروں کو دیکھا۔ اسے پتا تھا کہ آج پھپھو نے آنا ہے۔ اسی لیے صبح سے گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ امی کی تیمارداری کے علاوہ صفائی، کھانا پکانا، انسانی کاموں کا بوجھ۔ پھر بھی پھپھو کو موقع مل گیا۔

"پھپھو! چائے بناؤں؟" وہ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں بنا لو۔ میری تو کمر میں بھی درد ہو رہا ہے۔" پھپھو گول تکیہ کمر کے پیچھے رکھ کر لیٹتے ہوئے بولیں۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں آگئی۔ چینی کا ڈبا کھولا تو وہ خالی تھا۔

"او ہو! پھپھو کے ہاتھ ایک اور ایشو لگ جائے گا۔ زین بھی پتا نہیں کب آئے گا۔ اکیڈمی سے سیدھا دوستوں کی طرف نکل جاتا ہے۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

ظاہر ہے پھپھو امی کے کمرے میں تھیں۔ وہ پیچھے دالان والی سیڑھی سے دبے قدموں بے آواز چلتے ہوئے دالان میں آئی۔ ساتھ والوں کی دیوار کے ساتھ لگا کر کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر دیوار کے اوپر سے دیکھنے کے قابل ہوئی۔

"اوئے عفان۔ کیا کر رہے ہو؟" کرسی پر بیٹھے عفان کو ڈور سنوارتے دیکھ کر وہ بولی۔

"تم کسی دن اپنی ٹانگ تڑواؤ گی۔" وہ دانت کچکچا کر بولا۔

"اور تم میرے ہاتھوں اپنی پکوڑے جیسی ناک مزید سجاؤ گے۔ چینی ہے؟ ورنہ چھینکوں گی۔ سیدھی طرح ادھر آکر بات سنو۔"

"امی کو بلاتا ہوں — وہی اچھی طرح باتیں سنیں گی۔ روز ہی بندریا کی طرح دیوار پر چڑھ جاتی ہو انٹرنیشنل فقیرنی، کوئی چیز ہی مانگنے آئی ہو گی۔"

"تم بولتے ہوئے کالے حبشی لگتے ہو۔ کتنی مرتبہ کہا ہے کہ میرے جیسی نازک اور کمزور دل لڑکی کو اپنی آواز سے نہ ڈرایا کرو۔ مانگی تو میں نے چینی تھی مگر تم نے کنجوسی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"اور تم نے ڈھیٹ پن کے... جو مرضی کہہ لو۔ چینی

لیے بغیر تو تم شکل بھی نہ گم کروگی۔"

"میرے نانا کا گھر ہے چچا، لوں یا ٹھینگی۔"

"اچھا اس سے پہلے کہ میں مزید تمہیں برداشت کروں۔ چچا لاری رہتا ہوں۔" وہ اس کے تیے تیے انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

جبکہ وہ ـــــ وہاں جا رہی تھی پیچھے مڑ کر بار بار دیکھ رہی تھی کہ مبادا پھپھو نہ آ جائیں۔ پھپھو تو نہ آئیں مگر سائی کے مخصوص اسٹائل پر کھنکھو ڈالنے کے طریقے سے اچھلتا کودتا زین ضرور گیٹ سے اندر آگیا تھا۔

"کیا ہوا زین؟ ٹیسٹ تو ٹھیک ہوا ہے نا۔" وہ وہیں سے اونچی آواز میں بولی۔

"آپا! میرے فزکس کے ٹیسٹ میں پورے مارکس۔" وہ دوبارہ سائی بن گیا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔

"یہاں اوپر سے ایک موٹا تازہ نظر آئے گا۔ اس



کے ہاتھ سے پٹی لے کر کچن میں گھسے لگا تھا۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔

"پہلے ٹیسٹ پر تو مبارک باد دے دیں۔" وہ اس کے نوٹس نہ لینے پر چڑاتے ہوئے منہ بنا کر بولا۔

"تب مبارک باد دوں گی۔ جب سالانہ میں اچھے نمبرز آئیں گے۔" وہ پیار سے اس کا کان کھینچ کر بولی۔

"ارے اب اس بچارے کے پیچھے پڑ گئی ہو۔" عفان نے ہاتھ میں پکڑا چپس کا ڈبا بچے کی طرف لٹکاتے دیوار سے گردن نکالتے ہوئے کہا۔

"عفان بھائی! میرے ٹیسٹ میں فل مارکس آئے ہیں۔ ان شاء اللہ ایف ایس سی میں آپ کو بھی ٹف دوں گا۔"

"ضرور ضرور یار! اللہ تمہیں مزید کامیاب کرے۔" عفان نے بغیر کسی حسد کے انتہائی محبت سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جبکہ وہ سوچ رہی تھی کہ عفان اور ضمیرہ آپی کی شخصیت میں کتنا اپنا پن اور اعلیٰ ظرفی جھلکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اور زین دو ہی بہن بھائی تھے۔ پاپا نے بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی امی کی گرتی طبیعت کے پیش نظر اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر گھرداری سنبھال لی۔

ابو شام کو لوٹتے تو امی کو مختلف ڈاکٹرز کے پاس لیے لیے پھرتے۔ طرح طرح کے ٹیسٹ کرواتے۔ پھر بھی امی کی بیماری ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہ آرہی تھی۔

رشتوں کے نام پر ایک تایا اور ایک پھپھو تھیں۔ تایا کے گھر کی دیوار سانجھی ہونے کے باوجود رشتوں میں اتنی بڑی خلیج تھی کہ برسوں کی ناراضی ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ بڑے تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔ صرف بچے ایک دوسرے سے اپنے ماں باپ سے چھپ کر مل جل لیتے۔ البتہ پھپھو گلزار کی تو وہ دل سے قدر دان تھی۔ کم از کم انہیں اس کے اماں ابا کا خیال تھا۔

پھپھو کی زبانی ہی اسے بڑوں کی ناراضی کی وجہ معلوم ہوئی تھی۔ امی اور تائی امی سگی بہنیں تھیں۔ مطلب تائی امی اس کی خالہ بھی تھیں۔ ابو کی نسبت پہلے تائی امی سے طے تھی لیکن انہوں نے اپنی بچپن کی طے کی ہوئی نسبت توڑ کر امی کو پسند کرکے شادی کرلی۔ پھر تایا ابا سے تائی امی کی شادی کروی گئی۔ تائی امی اور باقی دونوں ماموؤں کو امی سے نفرت ہوگئی۔ البتہ پھپھو کا رویہ ٹھیک ہی تھا۔ جائیداد کے جھگڑے نے اور کچھ تائی اماں کی تعصب پرست شخصیت نے دونوں گھروں میں دراڑیں ڈال دیں۔ بات اتنی بڑھی کہ نوبت قطع تعلقی تک آگئی۔

وہ اور زین رشتوں کی کمی کے باوجود خوش رہ لیتے اگر امی ٹھیک رہتیں۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کی مسلسل نہ سمجھ میں آنے والی بیماری نے دونوں بہن بھائی کو آزردہ اور پریشان کردیا تھا۔ ابو کے حوصلے بھی پست ہونے لگے تھے۔ ان پر دو سرے دن پھپھو گلزار کی بیوگی ہوا میں آکسیجن بھرنے آجاتیں تو سانسیں پھر سے رواں دواں ہوجاتیں۔

وہ انہیں ماں کے ٹھیک ہونے کے دلاسے دیتی رہتیں۔ کبھی زین کی یونیفارم دھودی۔ تو کبھی علیزہ کے سر میں تیل ڈال دیا۔ بس اتنی سی محبت پر ہی وہ دونوں بہن بھائی خوش ہوجاتے۔

☼ ☼ ☼

آج چھٹی تھی۔ وہ صبح فجر کی اذانوں پر ہی اٹھ گئی۔ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے اس نے اسی وقت مشین لگا کر سارے کپڑے دھوئے امی کے کپڑے تبدیل کروا کر انہیں وضو کروایا۔ اور کچن میں آٹا گوندھنے چلی گئی۔

زین اور ابو کے اٹھنے سے پہلے پہلے وہ صفائی اور دھلائی سے فارغ ہوچکی تھی۔ ساتھ والے گھر کے ٹیرس پر بیٹھا عفان جو بی اے کے فائنل کی تیاری میں مشغول تھا۔ آج کے دور میں اس لمبی سی چٹیا والی لڑکی کو اتنی پھرتی سے کام کرتے دیکھ کر حیرت زدہ ہی ہوئے جا رہا تھا۔ اس نے سیڑھی لگا کر دیوار سے گردن

نکل کر جھانکا۔

"ارے تائی عفان۔ تم!" وہ اسے چھیڑنے کے لیے ہمیشہ تائی عفان کہتی تھی۔

"میں نے تمہیں آج پہلی دفعہ اتنا مصروف دیکھا ہے۔ تم کتنے کام کرلیتی ہو؟"

"پہلی بات تو یہ کہ میں روز ہی اتنی مصروف ہوتی ہوں۔ اور میں جتنے بھی کام کروں تم سے مطلب؟" وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔

"دراصل میں کچھ دن سے ماسی کام والی نہیں آرہی۔ اسی لیے ہمیں بھی برتن دھونے والی اور صفائی کرنے والی چاہیے۔" بڑی سعادت سے مسکراہٹ چھپاتے کہا گیا۔

"میری امی اور تمہاری خالہ پس پچھلے کافی عرصے سے بیمار ہیں اور میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ جسے سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ تم لوگوں سے اتنا تو ہوتا نہیں کہ آکر پتا ہی کرلو۔ آگئے ہو طنز کرنے۔" یادو جہ غصہ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"او نہیں یار! میں تو مذاق کررہا تھا۔ خالہ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہے۔ میں ضمیرا آپی سے کہوں گا کہ آیا کریں۔"

"تم لوگوں کا ہمارے ہاں اور ہمارا تم لوگوں کے ہاں داخلہ بند ہے۔" اس نے قدرے تیز لہجے میں جتایا جیسے وہ اس بات کو بھول رہا ہو۔ وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

"بیٹی! مجھے تمہارا یوں عفان اور ضمیرا سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں' تمہاری ماں کو پتا چل گیا تو غصہ کرے گی۔" پھپھو نے ڈبے سے گاجر کا مربہ نکال کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پھپھو! امی کو پتا ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اچھا! پتا نہیں کس طرح اجازت دے دی۔" پھپھو کی بات اسے کچھ بری تو لگی مگر کیا کہہ سکتی تھی۔ وہ امی کی مالش کرنے کے لیے تیل لینے باہر چلی گئی۔

"ارے آمنہ! تمہیں پتا ہے کہ علیزہ' عفان اور ضمیرا میں بات چیت ہوئی ہے؟" پھپھو امی سے یوں مخاطب تھیں جیسے کوئی بڑا راز افشا کررہی ہوں۔

"ہاں! میں نے خود ہی اجازت دی ہے۔ بڑوں کے جھگڑوں میں بھلا بچوں کا کیا قصور؟ سارا دن میرے ساتھ لگی رہتی ہے۔ میری تو تکلیف ایسی ہے کہ نہ زیادہ بولنے کو دل کرتا ہے اور نہ ہی کچھ کھانے کو۔" ابھی وہ اتنا ہی بول پائی تھیں کہ ان کی سانس پھولنے لگی۔

"امی! یہ پانی پئیں۔" علیزہ نے دو گھونٹ پانی ان کے حلق سے اتارا۔

"بیٹا! گرمی لگ رہی ہے۔ یہ چادر میرے اوپر سے ہٹا دو۔" مارچ کے معتدل درجہ حرارت میں بھی ان کو جون کی گرمی گھیرے ہوئے تھی۔

"ہائے ہائے۔ میری ٹانگیں۔" اچانک ان کی ٹانگوں میں درد شروع ہوجاتا۔ وہ جھٹ سے ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔ گلزار پھپھو بھی ان کی ٹانگیں دبانے لگیں۔

"پتا نہیں میری بھابھی کو کیا ہوتا جارہا ہے۔" ایک بے بسی کی فکر چہرے پر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

علیزہ کی آنکھیں تو بن بادل کے برسات کی طرح منٹ منٹ بعد ہی بھر آتیں۔ چھ ماہ ہوگئے تھے امی کو یوں بستر سے لگے۔

"بیٹی! ہمت سے کام لو۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔" پھپھو کے دلاسے لے اندھیرے میں جگنو کی طرح لگتے۔

"جاؤ تم جاکے کھانے کا انتظام کرو۔ زین آنے ہی والا ہوگا۔ میں آمنہ کے پاس بیٹھی ہوں۔"

وہ تشکر سے پھپھو کو دیکھتی ہوئی کچن میں آگئی۔ کریلے چھیل کر نمک لگا کے وہ دھوپ میں رکھنے آئی ہی تھی کہ ضمیرا آپی کی آواز سن کر چھت سیڑھی لگا کر چڑھ گئی۔

"کیسی ہو علیزہ! خالہ کیسی ہیں؟" ضمیرا بھی اس پر نظر پڑتے ہی خوش ہو کر بولیں۔

"امی کی طبیعت بس سمجھ سے باہر ہے۔" وہ مایوس کن انداز میں بولی۔

"تو بڑی! مایوسی کفر ہے۔ تمہارے جیسی چڑیل کو تو

بہادر ہونا چاہیے۔ زندگی اگر تکلیفوں کی اسپیڈ بڑھاتی ہے تو ان کو ختم کرنے کا بریکر بھی فراہم کرتی ہے۔" وہ لاؤنج سے نکل کر سید ھا لان کے بغلی حصے کی طرف آتے ہوئے بولا۔

"ہاں عفیرا! عفان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم مضبوط رہو۔ بلکہ ہو سکے تو پڑھائی کا سلسلہ بھی دوبارہ شروع کرلو۔ ویسے خالہ کو میری طرف سے پوچھنا۔ میں امی سے بات کروں گی کہ خالہ کی خیریت لیں۔ ورنہ میں خود ہی آنے کی کوشش کروں گی۔"

وہ یہ بھی نہ کہتیں تو تب بھی عفیرا کو ان دونوں بہن بھائیوں کے خلوص کا اندازہ تھا۔ وہ دونوں تائی اماں کا الٹ تھے۔ جتنا وہ ان لوگوں سے نفرت کرتی تھیں اتنی ان کے بچے محبت دیتے۔

سعد ماموں اور معین ماموں اور ان کے بچوں کی خبریں ضمیرا آپا کے ذریعے اس تک پہنچتیں۔ ورنہ تائی اماں نے پتا نہیں کیا سحر پھونکا تھا کہ انہوں نے کبھی پلٹ کر خبر نہ لی۔ وہ اور زین بھی انہیں خالہ کہتے تو کبھی تائی اماں۔

☼ ☼ ☼

زین کے پیپرز شروع ہو گئے تھے۔ ابا کی آج کل لکڑی کے کاروبار کی وجہ سے کبھی فیصل آباد، کبھی اوکاڑہ تو کبھی کہاں ہوتے۔ انہیں بیوی کے ساتھ ساتھ عفیرا کی بھی فکر ستاتی۔ پر مجبوری تھی کاروبار کی۔ امی کی طبیعت تو پل میں تولہ پل میں ماشہ والی تھی۔

آج بھی ابا کا فیصل آباد کا ٹرپ تھا۔ مغرب کے وقت سے امی بے حد اداس تھیں۔ اس نے زین کو فون کر کے جلدی گھر آنے کا کہا تھا۔ کیونکہ ان کا پھپھو کا کبھی کا کوئی چکر نہ لگ رہا تھا۔ وہ نماز کی نیت باندھتے ابھی کھڑی ہی ہوئی تھی کہ ماں کی کراہ اور چیخ پر الٹے پاؤں بھاگی۔ امی دہری ہوئی تو بستر سے نیچے تھیں۔ اس کی اپنی بھی چیخیں نکل گئیں۔ باہر کن من شروع ہو گئی تھی۔ اندر اس کا دل لرز رہا تھا۔ امی کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا جیسے لہو ٹپک رہا ہو۔

"امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" وہ روئے جا رہی تھی۔ اتنے میں زین آ گیا۔ زین ماں کی حالت دیکھ کر رکشا لینے دوڑا۔ جبکہ وہ ہاتھ پاؤں سہلانے لگی۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا اور باہر کن من بوندوں نے موسلا دھار بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ زین ابھی تک رکشا لے کر نہیں آیا تھا۔ وہ ماں کو تسلی دے کر تیز بوندوں کی پروا کیے بغیر تائی اماں کے گھر بھاگی۔

گیٹ تایا ابو نے کھولا تھا۔ ضمیرا آپی نے لاؤنج کی کھڑکی سے اسے دیکھا۔ اس نے روتے ہوئے تایا ابو کو امی کی حالت بتائی تھی۔ ان کی سرد مہری جوں کی توں قائم تھی۔

"میں تو ابھی دفتر سے لوٹا ہوں۔ اتنی بارش میں تمہاری ماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو تمہاری خالہ ویسے ہی شہید ہو جائے گی۔" وہ ناگواری سے بولے۔

وہ روتی ہوئی واپس گھر آئی ہی تھی کہ پیچھے عفان اور ضمیرا آپی بھی آ گئے۔ عفان نے اپنی گاڑی نکالی اور ضمیرا آپی کی مدد سے تا "خالہ" کو گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔

"تم گھر میں رہو۔ زین آیا تو اکیلا پریشان ہو گا۔" بھیگی پلکوں والی ڈری سہمی لڑکی کو وہ تسلی دیتا چلا گیا۔

رات کو ابو بھی آ گئے اور عفان سے بات کر کے اسپتال پہنچے۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ کانٹوں بھرا تھا۔ زین بھی اس کے گلے لگ کے سسکتا تو کبھی وہ زین کے گلے لگ کے روتی۔

"کیا ہوا تھا تمہاری ماں کو۔" کچھ دیر بعد تائی اماں چلی آئیں۔ عفیرا نے "نجمہ" ان کی طبیعت بتائی۔ تائی تو شاید وہ جھگڑنے کے موڈ میں تھیں۔ مگر نجانے روتے بچوں کو دیکھ کر یا بہن کے خون کی جھلک سی کشش نے ان کے لبوں کو خاموش کروا دیا۔

کچھ دیر بعد عفان، ضمیرا آپی، ابا ابو اور اماں سب ہی آ گئے۔

"کہاں تھے تم دونوں؟" تائی اماں نے پژمردہ بہن کے چہرے کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔

"وہاں جہاں آپ کو ہونا چاہیے تھا۔" عفان کے ناگواری سے کہنے پر وہاں کھڑے سارے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

"مجھے تو بتا کر جاتے۔ ویسے تم دونوں کا جانا ضروری تھا؟" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولیں۔

"جاؤ عفیرا! اپنی نانی کے لیے کچھ چائے' پانی کا انتظام کرو۔" عفان نے ان کی بات کے جواب میں عفیرا کو مخاطب کیا۔

"شکریہ! جب خالہ کی خدمت پوری ہو جائے تو گھر آ جانا۔" وہ غصے سے انہیں گھورتی فوراً چلی گئیں۔

"پتا نہیں سلمیٰ کا مزاج کب نرم ہوگا۔" ابا نے کھسیا کر کہا تھا۔

"ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔ یہ خالہ جان کی ادویات ہیں۔ ان کا بی پی خطرناک حد تک شوٹ کر گیا تھا۔ آج انہوں نے کیا کھایا تھا؟" وہ دوائیاں چچا کو پکڑا کر عفیرا کی طرف دیکھ کے بولا۔

"امی نے دلیہ کھایا تھا۔"

"دلیے سے تو بی پی شوٹ نہیں کرتا۔" ضمیرا آپی حیران ہو کے بولیں۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ابا نے پریشانی سے پیشانی مسلی۔

"کوئی بات نہیں۔ چچا! آپ اللہ سے دعا کریں۔" عفان نے ان کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

بھتیجے کی محبت پر وہ نہال ہو گئے۔ "کیا ہے اگر تھوڑی سی گنجائش تمہارے ابا بھی پیدا کر لیں۔"

"چچا! آپ ہمیں بتائیے کہ آخر کیا مسئلہ ہے جو ابو جی کہ ماموں وغیرہ بھی آپ سے اتنے ناراض ہیں؟" ضمیرا ان کا کندھا تھام کر لجاجت سے بولیں۔

"بیٹا! بس ہمارے ہاں رواج تھا کہ نسبت بچوں کی بچپن میں طے کر دی جاتی تھی۔ میں تمہاری ماں سے منسوب تھا۔ میری غلطی یہ تھی کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی مجھے تمہاری چچی بھا گئیں۔ میں نے بچپن کی منگنی کو اپنی مرضی کے خلاف سمجھ کر اس رشتے سے انکاری تھا۔ تمہاری ماں بچپن سے میرے خواب دیکھتے آئی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں آمنہ کو پسند کرتا ہوں۔ وہ آمنہ سے حسد کرنے لگی۔ حسد کی آگ اتنی پھیلی کہ بہن کا رشتہ بھی لپیٹ میں آ گیا۔ بڑی منت سماجت سے تمہاری دادی میرے لیے آمنہ کا رشتہ لینے پر راضی ہوئیں۔ سلمیٰ نے سعید اور معین کو بھی بھڑکا دیا۔ بس اب کیا کیا بات میں جاؤں۔ شادی بخیر و عافیت ہو گئی۔ اماں جان نے تمہاری نانی اور ماموؤں کا غصہ کم کرنے کے لیے بڑے بھائی کے لیے سلمیٰ کا رشتہ مانگ لیا۔ غصہ تو کم ہو گیا پر دل جدا ہو گئے۔ آمنہ کی خدمت گزاری اور میری طبیعت کی وجہ سے تمہارے دادا نے مرتے وقت جائیداد کی بھی منصفانہ تقسیم نہ کی اور زیادہ حصہ میرے پاس آ گیا۔ تمہاری پھپھو تو صبر کر گئیں مگر تمہارے تایا بگڑ گئے۔ میں نے ابا کے مرنے کے بعد اضافی حصہ دوبارہ بھائی جان کو دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر ان کی انا کا مسئلہ بن گیا۔ بہت بگڑتی ہے تو پھر سمیٹنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔"

وہ تھک کر چپ ہوئے تو عفیرا آنسو پیتی خاموش بیٹھی ماں پر ایک نظر ڈال کر کچن کی طرف چلی گئی جبکہ ضمیرا آپی اور عفان بھی ابا سے اجازت لے کر گھر آ گئے۔

"خالہ اور چاچو کی غلطی اتنی بڑی تو نہیں کہ ہم ان سے قطع تعلق کر لیں۔" عفان نے دکھ سے ضمیرا آپی سے کہا۔

"انسان کی جبلت میں معافی کا عنصر بڑی دیر سے آتا ہے۔ جب رشتے تھک جائیں یا جب رشتوں کی ڈور میں بے حسی کی گانٹھ لگ جائے۔" ضمیرا نے گیلے دوپٹے کو نچوڑتے ہوئے کہا۔

"ہمیں امی اور ابو کو احساس دلانا ہوگا۔" عفان کا لہجہ پرعزم تھا۔

"دونوں ادھر ہی رک جاتے؟" ابو نے دروازہ کھولتے ہی طنز کیا۔

"اگر خالہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو یقیناً رک جاتے۔" ضمیرا نے بھی دو ٹوک کہا۔ باقی

گھر کیوں بلاؤں نجیں آکر بھی نہ تھی تھیں۔

"خالہ تمہاری بیماری ہوئی ہے۔ کوئی اللہ کو پیاری نہیں ہوگئی جو تم لوگوں کو اتنی ٹینشن ہوگئی ہے۔" ماں نے بھی بے نقط سنائی تھیں۔ ضمیرا نے عفان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ انہیں دلانا ہے احساس۔

"خدا کا خوف کریں امی! وہ آپ کی بہن بھی ہے۔" عفان بھڑک گیا۔

"ہاں ساری عمر اپنے لیے سوچنے والی۔ دوسروں کے جذبات سے کھیلنے والی۔" اماں نے نفرت کا مزید مظاہرہ کیا۔

"پسند کرنا اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ بندہ نفرت کے مینار پر ہی چڑھ جائے۔" عفان نے ماں کو تاسف سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہو تو وہ دونوں تم لوگوں کو ماضی کے قصے سنا چکے ہیں۔" ابو نے جتے ہوئے کہا۔

"ابو! جو ادا ابو نے کیا اس میں بھلا چچا کا کیا قصور؟" ضمیرا نے بھی بات کی۔

"تم دونوں بہن بھائی یہاں سے چلے جاؤ۔" سلمیٰ نے غصے سے کہا جبکہ ابو کچھ خاص تو ہاہر کے۔ وہ دونوں اپنے ماں باپ کی ضدی طبیعت پر افسردہ ہوتے وہاں سے اٹھ آئے۔

☆ ☆ ☆

"آئے ہائے! مجھے تو تم لوگوں نے اطلاع نہ دی کہ آمنہ کی طبیعت اتنی خراب ہے۔" دوسرے دن گلزار پھپھو نے آکر دہائی دینا شروع کردی۔

"علیزہ بیٹی ذرا چائے تو بنا کر لانا۔ آج میرا ابھی سر دکھا جا رہا ہے۔" پھپھو نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی۔ وہ کچن میں چلی آئی۔

یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ گھی بندھی روٹین۔ صبح سے شام۔ شام سے صبح۔ گھر کے کام۔ امی کی تیمارداری۔ خود کو تو وہ یکسر بھول گئی تھی۔

اچانک کچھ یاد آنے پر وہ چائے کی ٹرے اٹھانے کے بجائے اپنے کمرے میں آکر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"میں تم سے ریحان کے لیے علیزہ کا رشتہ مانگنے آئی ہوں۔ باپ تو پردیس بیٹھا ہے۔ خرچہ بھیج کر مطمئن ہے۔ مجال ہے جو بھول کر بھی پاکستان کا رخ کرے۔

دل و دلاوری کے سہارے میرا بیٹا پلتا رہا۔ لیا نے مجھے بیٹیوں میں دے ڈالا۔ بیٹا بھی انہی کی نسل پر چلا گیا۔ اب تو ضد کرتا ہے کہ کسی سلجھی ہوئی لڑکی کو سونپاؤں۔ علیزہ سے بڑھ کر مجھے کوئی لڑکی نظر ہی نہیں آئی۔"

پھپھو کی بات پر وہ آئینہ دیکھنا بھول گئی۔

"لیکن باجی! ریحان تو کوئی کاروبار نہیں کرتا پھر بقول تمہارے سر اٹھ رہا ہے۔"

"ارے ہو بھلا اتنی بڑی تعلیم کون دیکھتا ہے۔ رہی کمائی کی بات تو ماشاء اللہ علیزہ کے نام کافی بینک بیلنس ہے۔ دو لوگ گھر کے ہی بچے ہیں۔ وہ کوئی کاروبار شروع کروا دے گی۔" پھپھو کی بات سے آمنہ کے دل کو دھکا سا لگا بلکہ علیزہ ابن کی ہو گئی۔

"سلمیٰ نے تو تمہیں پوچھا نہیں۔ تمہارے بھائی بھی شاید کیا بلکہ یقیناً تمہیں بھی گلے نہ لگائیں۔ بیمار بہن کی خیریت معلوم کرنا انہیں گوارا نہیں۔ تو کیا وہ تمہاری بیٹی کا رشتہ لیں گے۔ رشتے کے نام پر تمہارا میرا ساتھ رہ گیا ہے۔ اگر مجھے بھی انکار ہوا تو سمجھو یہ بھی رشتہ ختم۔ پھر میں عمر بھر تمہیں شکل نہ دکھاؤں گی۔ غیروں پر بھروسا کرنا چاہو تو جہاں مرضی بیٹی کو بیاہ دینا۔"

امی کی مسلسل خاموشی نے گلزار پھپھو کی وضاحت کو حوصلہ افزائی بخشی تھی۔ اور علیزہ اپنی تقدیر کی بھول بھلیوں میں گم ہوتے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر گرتے تنکے نے اس کے ارتکاز کو توڑا تھا۔ وہ جلدی سے پھپھو کو چائے تھما کر سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھ آئی۔

"ہم نے سوچا کہ اتنے اچھے موسم میں کوئی چڑیل اپنا ابھی تک دیدار کیوں نہیں کروا رہی۔ سو خود ہی متوجہ کرلیا جائے۔" ضمیرا نے خوشگوار موڈ میں

اسٹرابری منہ میں ڈال کر اس کے طرف دیکھا۔

"آج کوئی چیز نہیں بانٹی ہوگی۔" عفان نے شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب مانگوں گی تو شاید تمہارے پاس دینے کے لیے بھی کچھ نہ ہو۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"اوہو۔ ہاہاہا۔" وہ بلاوجہ ہنسنے لگا۔ "لگتا ہے آج خالہ سے مار پڑی ہے۔ منہ پر اسی لیے کافی رونق نظر آرہی ہے۔ ویسے بائی دا وے میں کون سی چیز تمہیں نہیں دیتا۔"

"تم صرف چیونگ گم ہی دے سکتے ہو۔ اتنی اوقات نہیں ہے تمہاری، کہ کچھ اور دو۔" اس کے بلاوجہ کے قہقہے اسے سخت برے لگ رہے تھے۔

"ہاں یہ تو ہے۔" ضمیرا آپی نے اس کا ساتھ دینے کے لیے کہا۔

"اچھا جی۔ ان شاء اللہ کچھ ہی دنوں میں جب مجھے جاب ملے گی تو تمہیں اور ضمیرا کو ایک آئس کریم آفر کروں گا۔"

"رہنے دو اپنی آئس کریم۔ میں نے سوٹ لینا ہے اور سینڈل بھی۔ بلکہ تم علیزا کو بھی لے کر دینا۔" ضمیرا نے رعب سے ایک کی آفر رد کرتے ہوئے کہا۔

"اوف اتنی بڑی فرمائش۔" ضمیرا آپی کو چڑانے کے لیے وہ جان بوجھ کر آئس کریم ہی آفر کر رہا تھا۔

اس سارے معاملے میں وہ یکسر بے نیاز بنی بس دونوں کے چہرے دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼

امی نے من و عن پھپھو کی بات ابا کے سامنے دہرائی تھی۔ ابا نے سنتے ہی صاف انکار کر دیا۔

"ریحان اور علیزا کا کوئی جوڑ نہیں۔ داؤد نے خود ساری عمر سارا پیسہ الٹے تلکوں میں اڑا دیا۔ بیٹا بھی اسی روش پر چل رہا ہے۔ میں علیزا کے لیے ریحان کو بالکل مناسب نہیں سمجھتا۔"

"لیکن پھر گلزار بھی ہم سے تعلقات ختم کر دے

گی۔" امی کی سراسیمگی پر علیزا نے ہمدردی سے اپنی کمزور ماں کو دیکھا۔ جو قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی اپنوں کی بے رخی کا کھٹکا سہتے آئی تھیں۔

"کر دے بند بول چال۔ میں بھر گیا ہوں اپنوں کے رویوں سے۔ اب کسی کی بات دل کو نہیں لگتی۔ بس میں اپنی بچی کو جانتے بوجھتے آگ میں انہیں جھونک سکتا۔"

"امی! ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ریحان بھائی مجھے بھی نہیں پسند۔ ہر وقت بونگیاں مارتے رہتے ہیں۔" زرین نے کہا۔

☼ ☼ ☼

ساتھ والے گھر سے قہقہوں اور شور کی آواز آرہی تھی۔ ضمیرا آپی کی وجہ سے اسے سعید ماموں کی جرمنی سے آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔

امی کی حالت آج بار بار بگڑ رہی تھی۔ وہ انہیں نیند کی گولی دے کر باہر اپنے چھوٹے سے لان میں آکر رونے بیٹھ گئی۔ ان کی بیماری سمجھ میں آکر نہیں دے رہی تھی۔ بے تحاشا کمزوری تھی۔ کچھ کھلاؤ تو الٹیاں کر کے سب نکال دیتیں۔

"آپی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟" زرین نجانے کب گھر لوٹا تھا۔

"زرین تمہاری امی کیوں نہیں ٹھیک ہو رہی ہیں؟"

"پتا نہیں۔ آپی میرا دل کرتا ہے کہ کوئی نہیں کرتا۔ امی کی حالت ایسی ہوتی جارہی ہے۔ نہ ان کو میرے آنے کا پتا نہ جانے کا۔ میں امی کے لاڈ کو ترس گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں۔ ہمارا گھر پہلے جیسا ہو جائے۔ امی ہم دونوں کے لیے ویسے ہی ناشتہ بنائیں۔ ہمیں ویسے ہی۔"

وہ علیزا کے سامنے بچوں کی طرح نجانے کب سے رکے آنسوؤں کو راستہ دے کر دھاڑیں مار مار کر رو پڑا۔

علیزا کی اپنی سسکیاں بے قابو ہو گئیں۔

انہیں بالکل پتا نہ چلا تھا کہ کوئی ان کے سر پر کھڑا

ہے۔ اور نجانے کب سے ان کی باتیں سن رہا ہے۔ ان کی باتوں کی تیزابی نے اس کا دل بھی زخمی کر دیا تھا۔

"بس کرو میرے بچوں!" وہ دونوں کرنٹ کھا کر سیدھے ہوئے تھے۔ سعید ماموں کی آنکھوں میں مدتوں کا ٹھہرا گلیشیر پگھلنے لگا تھا۔

"ماموں۔" وہ دونوں جذبات کی رو میں بہہ کر کسی پیار کے سہارے کے متلاشی بچے ان کے ساتھ لپٹ گئے۔

آج کی تاریخ خوشیوں کی شروعات تھی۔ زین نے اپنے کمرے میں لگے کیلنڈر پر مارکر سے اس تاریخ کے نیچے سرخ روشنائی کا نشان لگا دیا۔

وہ آج کے دن کو کبھی بھی بھلانا نہ چاہتا تھا۔

سعید ماموں نے بچھڑے لوگوں میں ملاپ کروا دیا تھا۔ ضمیرا آپی اور عفان بھائی کے خلوص پر وہ نجانے کتنی بار رویا تھا۔ ضمیرا نے عفان کی نوکری پر انگوری اور کاسنی رنگوں کے امتزاج سے بھرپور ایک شاندار سوٹ علیزا کو گفٹ کیا تھا۔

آج خالہ، تایا ابو، سعید ماموں اور [illegible] بی بن کے گھر دعوت تھی۔ اس خوشی کے موقع پر زیاتے گلزار پھپھو کو بھی بلایا تھا۔

"آپی آپ! ریحان بھائی کو گولی لگی ہے۔" زین حواس باختہ سا چیختا آیا۔ وہ اور عفان دم بخود رہ گئے۔

"اللہ خیر!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ جبکہ زین اور عفان باہر کو بھاگے۔

پل بھر میں منظر بدل گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی ہی کے کمرے میں آئی۔ پھپھو دیوانہ وار پاگلوں کی طرح امی کے پیروں اور گھٹنوں کو چھو چھو کر معافیاں طلب کر رہی تھیں۔ پھپھو کے ذریعے ہی سب کو ریحان کو گولی لگنے کا انکشاف ہوا۔ وہ ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوا تھا۔ گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہوئی تھی۔ وہ ایمرجنسی میں تھا۔

سلمٰی خالہ اور ضمیرا آپی پھپھو کو سنبھال رہی تھیں۔

پھپھو کی حالت نے سب کو ہراساں کر دیا۔

"گلزار! حوصلہ کرو۔ اللہ ریحان بیٹے کو زندگی دے۔ تم مجھ سے کیوں معافیاں مانگ رہی ہو۔" امی انہیں نرمی سے سمجھانے لگی۔

"میں بہت گناہگار ہوں۔ میں بہت خطا کار ہوں آمنہ! میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ہائے میرا بیٹا۔" وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ سب ناسمجھی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"کیا کہہ رہی ہو گلزار۔" معین ماموں نے اب ذرا درشتی سے کہا۔

"میں نے ضمیرا کی ریحان سے شادی کروانے اور جائیداد ہتھیانے کے لیے آمنہ پر کالا علم کروایا تھا۔ [illegible] یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ امی کے پیروں پر جھک سی گئیں۔ جبکہ امی نے کرنٹ کھا کر دونوں پاؤں پیچھے ہٹا لیے۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔

"میرا ریحان! ہائے میں مر جاؤں گی۔ میں اندھی ہو گئی۔ ہوس میں۔ حسد میں۔ ہائے اللہ! ہائے میرے رب! میرا بیٹا!" وہ بین کرتی نیم پاگل سی ہوئی جا رہی تھیں۔

انسان کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ اصلی چہرہ پہچانتے پہچانتے ہی انسان آدھی قبر میں اتر جاتا ہے۔ علیزا کا تو ذہن بند سا ہو رہا تھا۔

"سورۃ الناس اور سورۃ الفلق میں اللہ نے انسانوں اور تمام مخلوق کے شر سے پناہ مانگنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ جھاڑ پھونک کرنے والیوں اور حسد کرنے والیوں پر اللہ کریم نے لعنت بھیجی ہے۔ سب گناہ معاف ہیں سوائے شرک کے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم ہماری بہن ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ انا اور تکبر میں ہم لوگ ہی ڈوبے ہوئے ہیں۔ اتنے سالوں سے اپنی انا کے پندار میں اکڑے بیٹھے رہے۔ ہم نے صلہ رحمی کی کوشش ہی نہ کی۔ میرا بھائی۔ بھابھی اور بچے ہم سب کی نفرتوں کا نشانہ بنتے رہے۔ میں اس بات پر فخر کرتا رہا کہ چلو گلزار کا دل تو موم ہے۔ وہ تو خدا خوفی [illegible] ہے مگر تم

تو اللہ کی حدود کو پار کرنے میں مجھ سے بھی بڑھ گئیں۔"
تایا ابو پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

"اللہ کریم ہے۔ رحیم بھی ہے۔ موت سے پہلے معافی کے دروازے کھلے ہیں ہمیں سب کو کوشش کرنا چاہیے ہوں کہ حقوق العباد میں ہم نے آپ کو معاف کیا۔ آپ اپنے رب سے معافی مانگیں بھائی جان۔!"

ابو نے ہمیشہ کی طرح اپنی نرم خوئی اور نرم طبیعت سے کھلے دل سے سب کو معاف کر دیا۔

ان دونوں بہن بھائیوں نے اور باقی سب نے ان روشن مزاج لوگوں کی طرف دیکھا جو ان ہی میں سے تھے پر ان جیسے نہ تھے۔ زین اور عفیرا کو ایک دم امی ابو پر پیار آیا اور ان پر فخر محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

اس واقعہ کو ایک ماہ بیت گیا۔ امی کی صحت بحال ہونے لگی۔ بس وہ چپ چپ سی رہتیں۔ عفیرا بڑے اہتمام سے سورۃ الناس اور سورۃ الفلق کی تسبیح روزانہ پڑھتی۔

گو کہ پھپھو نے اعتراف بھی کر لیا تھا۔ مخلوق کے شر سے پناہ کا حکم اللہ کا تھا اور ہر انسان کو اپنی زندگی میں ہمیشہ مخلوقات کے شر سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

ابا کا کاروبار ترقی کی طرف گامزن تھا۔ سفلی خانہ روز چکر لگاتیں۔ وہ پہلے سے کمزور ہو گئی تھیں۔ اس واقعہ نے مختلف لوگوں پر مختلف اثرات مرتب کیے تھے۔

عفیرا ابو کی اجازت سے ایم اے اسلامک اسٹڈیز کر رہی تھی۔ وہ اپنے پیارے دین کو مزید سمجھنا چاہتی تھی جو زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کرتا ہے۔ زین کا رزلٹ شاندار آیا تھا۔ عفان نے اپنی یونیورسٹی میں اس کا داخلہ کروا دیا۔

ریحان بھائی ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے تھے۔

ضمیرا آپی کی متوقع شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

"نجمہ! میں اور تم ایک ہی رنگ کے سوٹ بنائیں گے جیسے ہم دونوں شادی سے پہلے پہنا کرتے تھے۔"

امی اپنی بہن کی محبت پر مسکرا اٹھیں۔

"پھر میں بھی ضمیرا آپی جیسے کپڑے بنواؤں گی۔"

"تم اگر دلہنوں کی طرح کے کپڑے پہنو گی تو لوگ اصل دلہن کو کیسے پہچانیں گے۔" عفان نے اسے چھیڑا۔

"پھر ہم اصل دولہا ڈھونڈ لائیں گے۔" ضمیرا آپی نے ذو معنی انداز میں کہا۔ اس کے ہونق بنے چہرے کو دیکھتے ہوئے امی نے کہا۔

"ہم سوچ رہے ہیں کہ ضمیرا کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی اپنے عفان کی دلہن بنا کر اپنے گھر لے آئیں۔"

عفیرا اتنی کھلی بات پر سٹپٹا کر کچن میں بھاگ گئی۔ جب کہ باقی سب ہنسنے لگے۔

"میں چاہتا ہوں کہ چٹکی بجی کے ساتھ تمہیں اپنا دل، دماغ سب کچھ دے دوں۔" وہ بنا آہٹ پیدا کیے اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا۔

"دماغ تو تمہارا چلتا نہیں ہے البتہ دل کا سوچوں گی۔" وہ بھی شوخی سے بولی۔

"عفان بھائی! دماغ مجھے دے دیں۔ ایمان سے بہت سالانہ امتحانوں کی تیاری نہیں ہو رہی۔" وہ دونوں زین کی بات پر ہنس دیے۔

"دل تو کوئی لے ہی چکا ہے یار! اب ایک دماغ رہ گیا ہے۔ وہ تم لے لو۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"کیا مطلب۔" زین حیران سا ہوا۔

"مطلب یہ کہ میرے بھائی! تم یہ پانی پیو اور جا کر ٹیسٹ کی تیاری کرو۔ عفان۔ موٹا تازہ۔ میرے بھائی کو پریشان مت کرو۔"

"شادی کے بعد تم مجھے ذرا موٹا تازہ کر تو سکو گی۔"

وہ اسے دھمکاتا ہنستے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

جبکہ عفیرا اپنے رب کا شکر ادا کرنے اندر کی طرف دوڑی۔ وہ خوشیوں کے راس آ جانے کی دعا چاہتی تھی۔ جو مدتوں بعد ملی تھیں۔

کنیز نبوی

صنم سے صمد تک

ملک حسنین رضا اور حسین رضا دونوں بھائی ہیں۔ حسین رضا پڑھائی کے سلسلے میں شہر میں رہتا ہے اور اس کا بڑا بھائی ملک حسنین رضا گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔
حسین رضا اپنے ماموں کی بیٹی حمیرا کی محبت میں گرفتار ہے اور حمیرا بھی حسین رضا کے جذبات سے آگاہ ہے اور اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔
حسین رضا اپنی ماں کی طرف سے گاؤں آنے کے ارجنٹ تار پر سامان سفر باندھ کر گھر جاتا ہے اور گھر پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ حمیرا اور حسنین رضا کی شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے۔ یہ خبر سن کر حسین رضا کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ حمیرا اور حسنین رضا کی شادی ہونے کے بعد وہ بجھے دل کے ساتھ دوبارہ شہر آجاتا ہے اور تعلیم کی تکمیل کے بعد کاٹن فیکٹری میں منیجر کی جاب کر لیتا ہے۔
شادی کی پہلی رات ہی حمیرا کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور اسے دورے پڑنے لگتے ہیں جس پر اکثر لوگ جن آسیب کے سائے کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ حمیرا کو آنے والے ان دوروں سے خوفزدہ ہونے لگے یہاں تک کہ اس کی ساس ہونے کی اس لیے قبر میں جا سوئی جبکہ شوہر حسنین رضا ان دوروں سے تنگ آکر زمینوں پر ڈیرے میں رہنے لگا۔ وہاں منشی کی بیٹی زبیدہ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ حمیرا کے پاگل پن سے پریشان حسنین رضا کو بے پناہ زبیدہ کے وجود میں میسر آئی تو اس نے منشی سے رشتہ مانگ کر سادگی سے نکاح پڑھوا لیا۔
ان ہی دنوں حسین رضا زمینوں پر اپنا حصہ وصول کرنے حویلی پہنچتا ہے تو اسے حمیرا کی حالت کا پتا چلتا ہے۔ وہ حمیرا کو

مکمل ناول



علاج کے لیے لاہور لے آتا ہے۔ ان کے ساتھ ماسی حمیدہ بھی ہوتی ہے۔ حمیرا لاہور آکر بہتر ہو جاتی ہے اور حسین رضا سے شادی کرنے کا کہتی ہے۔ ان دونوں کی باتیں بخشل سن لیتا ہے۔ حسین رضا یہ جان کر ڈر جاتا ہے۔

غضنفر حسنین انتہائی غربت کے باوجود اعلا تعلیم حاصل کرتا ہے اور اپنے ماموں اور ماں کے خواب پورے کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اسی کوشش کے دوران غضنفر حسنین کو حسین رضا کے دفتر میں جاب مل جاتی ہے۔ حسین رضا کی بیٹی حیا حسین غضنفر حسنین کو پہلی نظر میں دیکھ کر ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ بات حسین رضا کو پتا چل جاتی ہے۔ اور پھر غضنفر حسین کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے کا کہتا ہے۔ کچھ دن سوچنے کے بعد غضنفر حسنین، حیا حسین سے شادی کے لیے ہاں کر دیتا ہے۔

ماہم اپنی والدہ اور اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے اور اسے اعلا تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کا عزم ہمیشہ پرجوش رکھتا ہے۔ ماہم اپنی والدہ کے ساتھ گاؤں آتی ہے تو وہاں اس کی دوستی گاؤں کی ایک لڑکی سے ہو جاتی ہے جو دراصل حیا کی کزن ہوتی ہے۔ وہ ماہم کی جاب کے لیے حیا سے سفارش کرتی ہے اور یوں ماہم کو حیا کی سفارش پر غضنفر حسنین کی سیکریٹری کی جاب مل جاتی ہے۔ حیا کے کہنے پر وہ اسے رہنے کے لیے فلیٹ بھی دے دیتا ہے۔ جسے پا کر ماہم اور اس کی والدہ کو بہت خوشی ہوتی ہے۔

۲

دوسری اور آخری قسط

وہ رات کتنی سہانی تھی۔

سوال کے قتل جیسی طلسماتی روہی کی رات میں جب نامعلوم کے نامعلوم کے سفر پر رواں دواں جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہم سفر ستاروں کو گنتی۔ خوابیدہ نیند کی گالیوں پہ جھومتی تھی۔ اس کے اردگرد رقصاں ہوا کے جھونکے گالوں سے ٹکرا کر اسے تحیر زدہ کر رہے تھے۔ فریدن پیر کے سرائیکی روہیب کا طلسم اسے جکڑ رہا تھا۔

وہ اپنے سانول یار کے بلاوے پر ملاپ سے مدہوش ہوئی جاتی تھی۔ چولستان کے ٹیلوں کے بیچ ہر جگہ عشق کے جلوے۔ حسن کوٹ کی روہی کو سانول یار جیسے روپ میں ظہور پذیر کرتے۔ روہی اک ایسے معشوق کی مانند طرح دار ناز و ادا سے بھرپور محبوبہ بنی بیٹھی تھی کہ صرف اس روہیب کے باشندے ہی نہیں، ہر محبت کرنے والا انسان اس روہی کی معشوقہ محبوبہ کا عاشق بن بیٹھے۔

اس کا بہروپ سانول یار روہی روہیب اس کے آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اسے کسی نامعلوم سفر پہ لے جا رہا تھا۔ ساکت و سکون کی فضا سحر زدہ ماحول پر طاری تھی اور صحرا والوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن کی آواز اسے الگ ہی موسیقیت عطا کرتی۔ جس موسیقی پہ رات دیباج سر کنا کر سخاوت کے درجہ اعلا پر فائز ہوا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا، وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے اور کس سفر پر۔ وہ تو ہجر و فراق کو شکست دے کر وصل و ملاپ کے لمحے میں آگئی تھی۔ اس کے دل میں بہاسنے پیر پیار لیے اس کے دل کی اجڑی جھوک وس گئی۔ سانول یار نے گلے کیا لگایا کہ ہفت اقلیم مل گئی۔

وہ شام سلونا پیا آج بھی اس کے دل میں مقیم تھا۔ اسی لیے اس کا محل جیسا دل آباد تھا۔

جو جس دا عاشق ہووے اسی دی گل کروا
سو سو مکر بہانے کروا اسے اوہدے مروا

(جو جس سے پیار کرتا ہے، اسی کی بات کرتا ہے۔ سو سو بہانے بنا کے دل کو فریب دے کر۔ اسی کے غم میں مرتا ہے۔)

وہ فجر پڑھ کر جائے نماز پر غمگین بیٹھی تھی، آج کئی سالوں بعد اسے نماز پڑھنے کا خیال آیا تھا اور رب سے دعا مانگنے کو دل چاہا تھا۔ اسی دم جیجی کی سریلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

جس دل اندر عشق سمانا اس نئیں فیر جانا
بھانویں سوہنے ملن ہزاراں' اساں نئیں یار وٹانا

(جس دل میں عشق سما جائے پھر نکلتا نہیں' چاہے کتنے ہی خوب صورت لوگ ملیں' محبوب بدلا نہیں جاسکتا۔)

اس کی آنکھیں یکدم پُرنم ہوئیں۔ وہ آہستگی سے جائے نماز سے اٹھ کر اسے لپیٹنے کو جھکی' آنکھوں سے آنسو جائے نماز پر گر کر اپنی بے بسی کی فریاد کرنے لگے۔ وہ اس دردیلی آواز کے تعاقب میں چلتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

جنہاں دکھاں وچ دلبر راضی' سکھ رہتاں توں وارے
دکھ قبول محمد بخشا' راضی رہن پیارے

(جن دکھوں پر محبوب خوش رہے' میں ان پر خوشیاں قربان کروں گا' مجھے دکھ قبول ہیں۔ محمد بخش! بس محبوب خوش رہے۔)

اسے وہ سارے دکھ قبول تھے جن سے اس کا محبوب خوش رہ سکتا تھا۔

اس نے تین دن سے مختر حسین کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے مبائل پر وہ پہلے ہی آنے چھ میسج کر کے بیٹھ لے چکا تھا۔ وہ سراپا انتظار' سوالی کا اظہار ہی آن کا دامن تھامتی' کبھی نوازش ہو کر رہ جاتی۔

کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ اور کیا ہو گا اب اس کے ساتھ۔ حیا حسین جسے وصل جاں افروز' کبھی وہ ہجر جاں سوز لگتا۔ دل کے دامن تار تار پر وہ دلاسوں کے

پیوند لگاتی۔ حیا حسین اپنا غلطہ خراب دل لیے اب بھی اس کے التفات و توجہ کی منتظر تھی۔ کیونکہ اس نے عشق کیا تھا اور دل بیمار کا گر کوئی مسیحا تھا تو وہ مختر حسین تھا۔

وہ محبت کے محل سرا میں محبوب کی گلیوں میں گم ہو چکی تھی اور اب ان بھول بھلیوں سے باہر نکلنا ناممکن اور بے کار تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچا ہے آپ نے؟" مختر نے فون کر کے حسین رضا سے سوال کیا تھا۔

"دیکھو مختر بیٹا! مانتا ہوں' مجھ سے ماضی میں غلطیاں ہوئیں مگر میری بیٹی۔ میرے جرم کی سزا اسے نہ دو۔" وہ جو چند دنوں سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے' رابطہ ہونے پر پہلی بات یہی کی۔

"اس کا یہ قصور کم ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے؟"

حسین رضا نے بے بسی سے موبائل کو دیکھا۔

"وہ تمہاری بیوی ہے۔ کوئی غیرت مند شوہر بیوی کو یوں اغوا کر کے اس کے والدین کو بلیک میل نہیں کرتا۔" وہ اپنے تئیں بڑی وزنی دلیل لائے تھے۔

"اور غیرت مند بیوی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ چند لمحے رکا۔ "اور غیرت مند بھائی کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں مسٹر حسین رضا!" وہ زہر خند انداز میں گویا ہوا۔ "جنہوں نے اپنے نفس کی خاطر کسی کی جان لے لی۔" اس کا لہجہ زہر خند ہوئے۔

"دیکھو۔۔۔ تم میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔ تم جو کہو گے وہ کروں گا۔ میں حمید اور عقیل کو آزاد کرنے کو تیار ہوں۔"

"لو۔۔۔ ہو!" وہ دل کھول کر ہنسا۔ "بڑی جلدی لائن پر آگئے آپ۔"

حسین رضا نے اس کے طنزیہ فقرے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ "بس تم میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔" وہ گڑگڑائے۔

"ہوں۔۔۔ کب چھوڑ رہے ہیں؟"

"سنو! تم نے میری بیٹی پر تشدد تو نہیں کیا؟" وہ عجلت میں بولے۔

"اوہ۔۔۔ کیا آپ نے میرے ماموں پر کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو؟" دانستہ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ بخدا نہیں' حمید پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔"

"تو پھر آپ کی بیٹی پر بھی کوئی تشدد نہیں ہوا۔" مختصر کا لہجہ پُراسرار تھا۔ اس کے لفظوں اور لہجے سے کوئی چیز واضح نہیں ہوئی تھی۔

حسین رضا کی آنکھوں میں بے بسی نمی بن کر تیرنے لگی۔

"اک بار میری بیٹی سے بات کروا دو۔" ان کے لہجے کی نمی مختصر سے چھپی نہ رہ سکی۔

"صبر۔ صبر۔ صبر۔ کتنا مزا ہے صبر میں ہے نا حسین رضا!" استہزائیہ لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

"دیکھو، میں بار بار وعدہ کر رہا ہوں۔ تم جو کہو گے وہی ہوگا۔ مگر میرے اطمینان کے لیے میری بیٹی کی آواز سنا دو۔" وہ گڑگڑائے۔

"اونہوں۔" اس نے نفی میں ہنکارا بھرا۔ "آپ نے میرے ماموں کی آواز مجھے سنائی نہیں تھی نا؟"

"میں اس کی آواز سنوانے... بلکہ ابھی اسی وقت چھوڑنے کو تیار ہوں۔ بس تم میری بیٹی کو چھوڑ دو۔"

"ارے رے!" وہ لہجے میں حیرانی سمو کر بولا۔ "میں بے غیرت تھوڑی ہوں، جو بیوی کو چھوڑ دوں گا۔ یہ تو سوچیے بھی مت حسین رضا!" ان نے دانت کچکچائے۔

حسین نم مروت سے سونپ پڑھتے گئے۔

"تم میری اس سے بات کرا دو، اچھا۔ میں کہاں چھوڑوں بختل اور حمید کو۔" وہ بے تاب ہوئے۔

"کل صبح دس بجے بادشاہی مسجد میں چھوڑ جائے گا اور کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ یہ آپ کو مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" مردہ آواز اسپیکر سے ابھری تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا۔ وہ تیرا میاں ہے نا؟" اس بوڑھی عورت نے پوچھا، جو چند دن سے اسے کھانا دینے آ رہی تھی۔

"جی اماں!" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے اس سے؟" وہ نرم لہجے میں استفسار کرنے لگی۔

"میرا تو نہیں۔ خود ہی ناراض ہو گیا ہے۔"

"بیٹا! میاں، بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ کبھی سانجھ، کبھی سویرا، کبھی دکھ، کبھی سکھ، کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں، آپس کی چھوٹی موٹی ناراضیاں تو چلتی رہتی ہیں۔ مگر اک دوسرے کے بغیر گزارا بھی نہیں ہوتا۔ وہ ناراض ہے تو تم ہی منا لو۔" وہ اپنی بوڑھی عورت کے ناصحانہ انداز پر کتنی ہی دیر چپ رہ گئی۔

"وہ مانے بھی تو نا۔"

"تو مت منا۔ تو خود جانے گی شوہر کیسے جنے یا جھکے لپٹ کر پھر آ جاتا ہے۔" وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"اماں! میرا دل تو اس کے عشق کا ایسا آتش کدہ ہے جو کبھی ٹھنڈا ہی نہیں ہوا۔" وہ آبدیدہ ہوئی۔

"اسے ٹھنڈا ہونے بھی نہیں دینا، ایک نہ ایک دن تم اسے تسخیر کر ہی لوگی۔" وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولی۔

"بہت مشکل ہے اب مجھے تسخیر کرنا حیا حسین!" وہ جو اندر کمرے میں اسے لینے آ رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر خود کلامی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔ آتے ہوئے اس کی سنگت میں بے انتہا خوش تھی اور جاتے ہوئے افسردہ۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے نہیں تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھا تھا مگر اجنبیت کی دیوار بیچ میں حائل ہو گئی۔ آتے ہوئے جو سفر گھنٹوں کا منٹوں میں طے ہوتا محسوس ہوا۔ وہ جاتے ہوئے صدیوں پر محیط ہو گیا۔

وہ بار بار اسے نظریں چرا کر دیکھتی۔ مگر اس کے چہرے پر کسی نرمی اور اپنائیت کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہ اس کے دل کے تار تار وجود کو امید کی سوئی سے محبت کے ٹانکے لگاتی رہی۔

سفر کیا' مگر بہت تھکا دینے اور روح پر زخم لگانے والا۔ جس میں اس کے محبوب نے اک نظر التفات تو کجا بے التفاتی سے بھی نہیں دیکھا۔

لاہور کے مضافات میں اک گھر میں گاڑی کھڑی ہوگئی۔ وہ اس کی معیت میں اک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں وہ آدمی بیٹھے تھے۔

وہ حمید ماموں کہہ کر ایک آدمی سے لپٹ گیا۔ حمید ماموں اسے گلے لگا کر بے تحاشا رونے لگے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا بیٹا! کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں پھر دیکھ رہا ہوں۔"

وہ روتے ہوئے ماموں کے ہاتھ چومنے لگا۔

"مجھے معاف کردیں ماموں! میں آپ تک نہ پہنچ سکا اور شاید ساری عمر پہنچ نہ پاتا۔ اگر مجھے آپ کا فون نہ ملتا۔ شاطروں کی تدبیریں ——— تقدیر سے ہار گئیں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اب وہ شاطر میرے دام میں ہے' کیونکہ جس طوطی میں اس کی جان ہے' وہ میرے قبضے میں ہے۔" اس کی نظروں کے تعاقب میں حمید ماموں نے اسے دیکھا۔

اس جھنک پر بے ساختہ لب بھینچ کر اس نے سر جھکا لیا۔

"کیا یہ شخص ساری عمر یونہی خود بدولت کیے کی سزا مجھے دیتا رہے گا۔ میری محبت و چاہت کا احساس کیے بغیر۔" نم آنکھوں میں تیرگی پرچھائیں لہرائیں۔

"یہ حسین رضا کی بیٹی ہے کیا؟" مطلل نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

خضر حسین نے سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس وقت حیا کا دل شدت سے چاہا' کاش وہ یہ کہہ دے کہ یہ خضر حسین کی شریک حیات ہے۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے حسین رضا! میں نے منع کیا تھا۔ زندگی میں اتنے بڑے رسک نہیں لیتے۔ مگر تم پر تو بھلائی کی محبت کا نشہ چڑھا تھا۔ اٹھا کر میری پھولوں جیسی نازک بیٹی کو اس ظالم کے حوالے کردیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اسے ملازمت دینے کی غلطی مجھ سے ہوئی مگر بعد میں حیا کی محبت نے مجھے مجبور کردیا تھا اور وہ میرا بھتیجا ہے۔ یہ پتا تو بعد میں چلا تھا۔"

"جب پتا چلا تو رشتہ کیوں دیا۔"

"تب تک حیا بہت آگے جاچکی تھی۔ ہم اس کی شادی نہ کراتے تو وہ خود کرلیتی۔" حسین رضا بے بسی سے کھنکتے بولے۔

"میں ماں تھی اس کی' کبھی بھی اسے یہ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

"ہاں۔ تم ہی تھیں اس کی' اسی بات نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر تم کچھ بھی کرسکتی ہوتو وہ بھی شہر کی ہی بیٹی تھی نا۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تلخی سے بولے۔

وہ چہرے کے رنگ کی بیٹھی رہ گئیں۔ آج یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ان کا محبوب' ان کا شوہر' ان کی محبت کی شدتوں کو طعنہ بنا کر ان کے منہ پر مارے گا۔

"کیوں خاموش ہوگئیں' بری لگی ہے نا میری بات حقیقت کی ہے جمیرا۔ حقیقت کیا ہے۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔ "ہم جو بازی جیت کر سرشار بیٹھے تھے۔ آج جب جذبے سرد اور شدتیں ماند پڑی ہیں تو پتا چلا' ہم تو بازی ہار گئے ہیں۔" ان کے لہجے میں دکھ' تاسف گئے زمانوں کا پچھتاوا۔ کیا کچھ نہیں تھا۔

"ہم اپنی سب سے قیمتی متاع ہار بیٹھے ہیں اور اب ہمیں سر اٹھا کر نہیں جھکا کر جینا ہے۔" وہ آبدیدہ ہوگئے۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑائیں۔

"ہاں ایسا ہوگیا ہے' کیونکہ سب سے بڑا منصف اوپر بیٹھا ہے۔ تب ہی ہم اتنے دنوں سے تڑپ رہے ہیں اور اب تو حمید اور مطلل کو چھوڑے ہوئے بھی وہ

دن ہو گئے۔ مگر کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں ہماری بیٹی زندہ بھی ہے یا۔"

"نہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہیں کہو۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخیں۔

حسین رضا پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

☼ ☼ ☼

"میں حمیرا کے کہنے پر دودھ لینے گیا۔ واپس آیا تو جو میرے کانوں نے سنا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں تمہاری ماں خوشی خوشی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ حسنین رضا کی جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اس سازش سے بے خبر نہیں تھی۔

حسین رضا، حسنین رضا کے آگے قسمیں کھا کر میرے اور زبیدہ کے بیچ ناجائز تعلق کا یقین دلا رہے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ میں ان کے اور حمیرا کے ناجائز گھناؤنے تعلق سے باخبر ہو گیا ہوں۔ اس لیے یہ الٹا مجھ پر اور فرشتہ صفت زبیدہ بھابھی پر الزام لگا رہے ہیں تاکہ میں ان کے تعلق کے بارے میں حسنین رضا کو نہ بتادوں۔"

یہ حقیقت جو ان سب پر منکشف ہو رہی تھی۔ حیا کے لیے سوہان روح تھی۔ اسے تو آج تک پتا نہ چلا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ سے شادی سے پہلے اس کے تایا کی بیوی رہ چکی تھی۔ اسے تو ہمیشہ یہی بتایا گیا کہ حسین رضا اکلوتے تھے۔ کبھی کسی اس کا جاننا نہیں ہوا تھا۔

"منتظر میاں! میں کبھی بھی ان کے تعلق کے بارے میں بتانہ پاتا۔ کیونکہ ہم کمین لوگ تھے بڑے لوگوں کے عیب دیکھ بھی لیں تب بھی انجان بن کر رہتے ہیں۔ ورنہ ہماری آنکھیں نکال دی جاتی ہیں اور زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں یا موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔"

بختل اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیر کر افسردگی سے بولا۔

حیا پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کی ماں بدکردار تھی۔ کاش یہ سننے سے پہلے وہ مر جاتی کاش کوئی فرشتہ گواہی دے کر آتا اور ببانگ دہل کہتا ان پر یہ الزام سراسر جھوٹ ہے۔

"میں الٹے پاؤں بھاگا۔ اس وقت رک جاتا تو زندہ نہ بچتا۔ سید جمالی سائیں کے پاس گیا اور کہا کسی طرح سے میری بیوی کو گاؤں سے لے آئے۔ پھر مڑ کر واپس نہیں گیا۔ ایک ہسپتال میں صفائی کے کام پر لگ گیا۔ دال روٹی اچھی چل رہی تھی۔"

"امی کے ساتھ کیا ہوا تھا پھر؟" منتظر بے چین ہوا تھا۔ تب ہی حمیدہ ماموں بول اٹھے۔

"ابا نے اسی وقت اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ بھابھی جان اتنے بڑے الزام سے روتی لرزتی گھر سے نکلیں۔ میں اسی وقت اسے لے کر وہاں سے نکل گیا۔ مجھے خوف بھی ستا رہا تھا کہ وہ کب قتل کر دیں۔ آخر ان کی عزت پر بن آئی تھی۔" حمیدہ ماموں کی آواز بھرا گئی۔

"شہر میں مختلف مزدوریاں کرتے وقت کاٹا۔ وہیں تمہاری پیدائش ہوئی۔ ساری عمر ہم ملکوں سے چھپتے رہے۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں، مگر ان کے ہتھے چڑھ ہی گئے۔" حمیدہ افسردہ ہو گئے۔

حیا کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کے پاس صوفے پر بیٹھا منتظر اس کو نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر۔ پھر اس کے بعد بابا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"ٹھیک آٹھ ماہ بعد میں نے اسی اسپتال کے ایک کمرے میں حسنین رضا کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے یا غنودگی میں تھے۔ حسین رضا ان کے پاس بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے ڈسٹ بن اٹھایا اور فوراً باہر نکل گیا۔ حسین رضا نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اخبار پڑھنے میں مصروف رہے۔

میں نے شکر ادا کیا کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ اس دن کے بعد میں اس کمرے کی صفائی کے لیے

ساتھ کام کرنے والے دوسرے آدمی کو بھیجا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ حسین رضا کے آتے ہی فوراً ایک جونیئر ڈاکٹر لپک کر ان کے پیچھے جاتا تھا۔ شک تو مجھے پہلے ہی تھا۔ میں نے کھوج لگائی۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ حسین رضا کو سلو پوائزن دیا جا رہا تھا۔ یہ لوگ ہمیں جاہل سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے سامنے زیادہ احتیاط نہیں برتتے۔ میں چونکہ ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس لیے میرے کانوں میں کچھ باتیں پڑ گئی تھیں۔ ایک دن جب ڈاکٹر نے انہیں انجکشن دیا۔ ان کی حالت بہت بگڑ گئی میں بڑے ڈاکٹر صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے کہا کہ ان کو کوئی غلط انجکشن دیا گیا ہے۔ انہوں نے فوراً اینٹی انجکشن لیا۔ وہ ڈاکٹر جس نے یہ انجکشن لگایا تھا وہ پکڑا گیا۔ حسین رضا نے دے دلا کر معاملہ ٹھنڈا کر دیا اور حسین رضا کو وہاں سے لے گئے۔ مگر جلد ہی پتا چلا کہ ان کی موت واقع ہو گئی ہے۔ بس پھر ایک دن مجھے اٹھا لیا گیا اور پھر ساری عمر قید میں ہی لزر گئی۔ مظفر میاں۔ میں ہر دن منتظر رہا کہ کب میری موت کے احکامات جاری ہوں گے۔ مگر شاید تقدیر بنانے والے نے مجھے زندہ رکھنا تھا یہ حقیقت آپ تک پہنچانے کے لیے۔ تب ہی زندہ بیٹھا ہوں۔"

٭ ٭ ٭

اجنبیت کی ایک دیوار ان کے بیچ حائل تھی۔ وہ بھی خود میں ہمت نہ پاتی اس کو مخاطب کرنے کی۔ اس وقت بھی سر جھکائے اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا چپ چاپ بیڈ پر نیم دراز رہا۔ پھر ایک دم اپنا موبائل اٹھایا۔

"ہاں مسٹر حسین رضا!"

حیا نے چونک کر دیکھا۔

"بیٹا! ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟" حسین رضا کا لہجہ اپنائیت بھرا تھا۔

وہ طنزیہ ہنسا "اس لیے کہ کیا گارنٹی ہے میرے پاس کہ واپسی پر آپ مجھے قتل نہیں کروا دیں گے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ بے چین ہو کر بے ساختہ بول اٹھے۔ مظفر حسین نے دزدیدہ نظروں سے ان کو گھورا۔

"بیٹا! کیا کہہ رہے ہو! تم میرے داماد ہو۔ میری بیٹی کا سہاگ۔"

"آپ جو اپنے سگے بھائی کو قتل کر کے اس کا زر' زمین اور زن ہتھیا سکتے ہیں تو داماد کا کیوں نہیں؟" وہ سختی سے گویا ہوا۔

"تم جو گارنٹی چاہو' میں دے سکتا ہوں۔" وہ نزع کے عالم میں بولے۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میرے وکیل سے بات کر لیں جو کچھ وہ کہیں لکھ دیں۔"

"کیا۔۔۔ کیا بات؟" ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

"یہ کہ اگر مظفر حسین کسی بھی طرح کی حادثاتی موت کا شکار ہوا تو اس کے ذمہ دار مسٹر حسین رضا ہوں گے۔ چونکہ مظفر حسین کو صرف شبہ ہی نہیں' یقین ہے کہ وہ اسے قتل کروا سکتے ہیں اور اگر موت طبعی ہو تو بھی مکمل پوسٹ مارٹم کیا جائے کہ کہیں اسے سلو پوائزن تو نہیں دیا گیا۔"

"میں تیار ہوں۔" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے کہا۔

"ٹھیک ہے میرا وکیل آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اسے اندر بلا لیں۔"

اس وقت حسین رضا کو لگا جیسے وہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر رہے ہیں۔ مگر اپنی جان سے عزیز تر بیٹی کو بچانے کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔

٭ ٭ ٭

وہ صالحہ خاتون کی گود میں سر رکھے سر میں مالش کروا رہی تھی۔ جب اک نیا نمبر اسکرین پر دیکھ کر اس نے سیل فون واپس رکھ دیا اور پھر سے آنکھیں موند کر خالہ سے لاڈ اٹھوانے لگی۔ جب پانچویں بار کال آئی تو وہ جھنجلا اٹھی۔

"پتا نہیں کون ڈھیٹ ہے تھکتا ہی نہیں۔"

"ارے بیٹا! اٹھالے گیا پتا کسی کو ضروری کام ہو۔"
اس نے فون اٹھایا۔
"مس ماہم! میں منظر بول رہا ہوں۔"
"سر آپ۔" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔
"مس ماہم! دو مہمان ہیں۔ میرے لیے بہت خاص بے حد اہم' جب تک میں ان کے رہنے کا انتظام کروں' آپ ان کو چند دن اپنے فلیٹ میں رکھ سکتی ہیں؟"
"سر! یہ میرا فلیٹ کہاں ہے' آپ کا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں کوشش کروں گا کہ آپ کو زیادہ دن تکلیف نہ ہو۔"
"پلیز سر۔ میری ذات پر آپ کے جو احسان ہیں وہ عمر بھر نہیں اتار سکتی۔"
"ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح آرہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کل چھٹی کر سکتی ہیں۔"
"نہیں سر! اس کی ضرورت نہیں' گھر میں بھیا ماں اور خالہ ان کی مہمان داری کے لیے موجود ہوں گی۔"
"اوکے۔ اللہ حافظ۔"
"حیرت ہے خالہ! سر اپنے مہمانوں کو کسی ہوٹل میں بھی ٹھہرا سکتے ہیں۔ وہ یہاں کیوں بھیج رہے ہیں۔"
"ارے بیٹا! ہوگی کوئی مصلحت۔ اتنا بڑا فلیٹ ہے۔" ماں نے ٹوکا۔
خورشید اٹھ گئی۔ ان مہمانوں کی آمد کی تیاری بھی کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے ٹیکسی والے کو پتا سمجھا کر ماموں اور بخشل کو بھیجا۔ خود اس کی گاڑی میں آبیٹھا۔
"پہلے آفس چلو۔" حیا نے اس کے تحکمانہ لہجے پر ایک لمحے کو اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
کیا منظر حسنین کے نرم لہجے کے لیے میں اب ترستی ہی رہوں گی۔ اس کا دل بھر آیا۔
"آ۔۔۔ آپ گھر نہیں چلیں گے؟"
سر اٹھاتے خدشوں کو بے حد مشکل سے ہمت مجتمع کرکے زبان دی۔
"ابھی نہیں' شام کو آجاؤں گا۔" وہ اس کے لہجے میں اپنائیت کو تلاشتی رہ گئی۔ مگر کوئی شائبہ تک نہ ملا۔ اس کے لیے نہ ٹھہرا جیسی تھا نہ ہی ساتھ بیٹھا شخص' مگر اجنبیت کے لمبے سائے اس کی زندگی پر محیط ہو رہے تھے۔
اس لمحے وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔ وہ انسان کو تنہا نہیں اور انسان دنیا میں تنہا آتا ہے۔ تنہا جاتا ہے' مگر دنیا میں تنہا نہیں رہ پاتا۔
گھر پہنچ کر وہ اس کے ماں' باپ صدیوں کی پیاس لیے اس کی طرف بڑھے۔ مگر وہ ہر سوچ و احساس سے عاری تھی۔ ان کی کسی گرم جوشی کا جواب نہیں دے پا رہی تھی۔
"اللہ کا شکر ہے۔ میری بیٹی گھر واپس آگئی ہے۔" حسین رضا آبدیدہ ہوئے۔
"ہاں۔۔۔ مالک نے بڑا کرم کیا۔ احسان ہے خدا کا کہ آج زندہ سلامت اپنے جگر گوشے کو دیکھنا نصیب ہوا۔" حمیرا اس کا منہ چومتے بولیں۔
"آپ ٹھیک تو ہیں نا بیٹا! منظر نے کوئی برا سلوک تو روا نہیں رکھا۔" حسین رضا غور سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولے مگر حیا کی شکایتی نظروں سے گھبرا کر رخ پھیرا اور بے چین ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔
"اس گندی عورت کے بیٹے نے میری پھولوں جیسی بیٹی کی زندگی زہر کر دی نا حسین رضا؟" حمیرا نے غصے سے شوہر کو مخاطب کیا۔
حیا نے اک نظر سر جھکائے باپ کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر شرمندگی غلطیوں کا پچھتاوا ابھر کر نمایاں تھا۔ پھر ماں کو دیکھا' جو بالکل پہلے کی طرح تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی شرمندگی اور پچھتاوا نہ پا کر اس کے اندر بھرا غصہ ابھر کر باہر آیا۔
"زندگی زہر تو آپ لوگوں نے میری کی ہے۔ آپ

کے گناہوں کا کفارہ اب ساری عمر مجھے ادا کرنا پڑے گا۔"

وہ کہتے ہوئے لاؤنج میں رکی نہیں۔ اپنے کمرے میں آگئی۔ جہاں ہر سو وحشت اور تنہائی چھپی ہوئی تھی۔

"زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔" حسین رضا نے ندامت و افسوس سے خود کلامی کی۔

☼ ☼ ☼

"سر! یہ فائلیں آپ کے دستخط کی منتظر ہیں۔" ہام نے فائلوں کا ڈھیر اس کی میز پر رکھا۔

"ارے مس ہام! آپ میرے منع کرنے کے باوجود آفس آگئیں۔" منتظر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"سر! مجھے پتا تھا کہ آپ آفس کے معاملات کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے فائلوں پر دستخط کرتا رہا پھر بولا۔

"یہ فائلیں چھوڑ جائیں۔ میں ان کو دیکھ کر بعد میں سائن کروں گا اور یہ لے جائیں۔" اس نے دستخط شدہ فائلیں اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

"جی بہتر سر!" وہ فائلیں اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اس نے نظریں اٹھائیں تو ہام کی پشت پر لہراتی لمبے بالوں کی چٹیا دیکھتے اسے اپنی ماں کے لمبے بال یاد آگئے۔ پہلے کالے پھر سفید و کالے اور پھر سرخ بال مہندی سے رنگے۔

وہ برآمدے میں لکڑی کے تخت پر بیٹھی سلائی کرتی ماں کی پشت کی طرف لیٹ کر اس کی چٹیا سے کھیلتا رہتا جو تخت پر گری رہتی۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنی چٹیا سے کھیلتے بیٹے کو سر گھما کر ترچھی آنکھوں سے دیکھتی۔

"بے ڈھلکوں کا خون گھوڑے پر سواری کرنے والوں کا بیٹا اب گھوڑے کی لگام نہیں ماں کی چٹیا ہی سہی۔"

وہ ہنس کر کہتی۔

اس نے بہت آہستگی و نرمی سے اس دلکش یاد کو دل کے کونے میں بحفاظت رکھا۔

وہ بمشکل سے اس کی بیٹی اور بیوی کو ڈھونڈنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اسے لے کر سیالکوٹ جانا تھا۔ جہاں اس کی سالہ رہتی تھی۔

آفس میں کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے حیا یاد آگئی۔ جو اسے فون کر کے لنچ پر گھر آنے کی یاددہانی کرا چکی تھی۔

"حیا حسین!" اس نے غصے سے لب بھینچے۔

دشمن کی بیٹی جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے باپ کے قاتلوں کی اولاد۔ سر جھٹک کر اپنا سیل فون اور گاڑی کی چابی اٹھاتا باہر نکل آیا۔

"مس ہام!"

"جی سر!" وہ مستعدی سے اٹھی۔

"آپ چل رہی ہیں۔ میں آپ ہی کے گھر جا رہا ہوں۔"

"جی ضرور سر!" وہ کھل اٹھی۔

"مجھے اپنے مہمانوں سے ملنا ہے۔" اس نے وضاحت دی۔

"میں جانتی ہوں سر... ورنہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔"

اس نے مسکرا کر "اچھا" سو "فورا" دام میں آیا۔

"ارے نہیں... نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ آپ بلائیں تو میں ضرور آتا۔" اس نے رسا" کہا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس قابل جانا۔" وہ گاڑی ڈرائیو کرکے مین روڈ پر لے آیا۔ وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی رہی۔

"کاش یہ بندہ ہمیشہ کے لیے میرا ہو جائے۔" اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرا بند کیے بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ جیسے

جیسے جیسے لنچ ٹائم قریب آرہا تھا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"کتنی خوش اور مسرور تھی۔

وہ اس کو فون کر کے گھر آنے کو کہتی۔ وہ شوق سے پوچھتا۔

"آج میرے لیے کیا بنایا ہے۔"

وہ اس کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز بنا کر بیٹھی ہوتی' کبھی نام بتاتی' کبھی کہتی "سرپرائز ہے۔ خود آکر دیکھنا' کھانا' پھر تعریف کرنا۔"

وہ ہنس کر کہتا۔ "آتا ہوں۔"

ایک گھنٹہ اس کے ساتھ گزار کر وہ پھر واپس آفس چلا جاتا۔

شام کو آنے کے بعد وہ گھومنے نکل جاتے۔ ڈنر کبھی باہر کسی ہوٹل میں کرتے یا پاپا کی طرف چلے جاتے مگر آج... ان کی جدائی کا آغاز ہونے جارہا تھا۔

"نہیں... وہ میری زندگی ہے۔ میں اسے خود سے الگ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ میرے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتا ہے۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

وہ دیوانی ہوئی' اس کا نمبر ملاتی رہی۔ آفس کا نمبر' سیل فون' ہر جگہ سے جواب ندارد۔

وہ میسج کرتی رہی۔

"میں کھانے پر تمہاری منتظر ہوں۔"

"میں تمہارے بغیر کھانا نہیں کھا سکتی۔ پلیز جلدی گھر آؤ۔"

"تمہیں پتا ہے میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

کتنے ہی میسج کر ڈالے۔ کوئی جواب نہ تھا۔ پتا نہیں وہ پڑھنے کی زحمت بھی گوارا کرتا ہے یا نہیں۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی' تو مگر کہاں

اس نے تھک ہار کر آخری پیغام بھیجا۔ آنسو اس کے رخساروں کو بھگوتے رہے۔

دروازے پہ ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ تیسری بار اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔

"چلیں بی بی! آپ کو بیگم صاحبہ..."

"دفع ہو جاؤ۔ نہیں کرنا لنچ' جا کر بتاؤ میری زندگی برباد کرنے والوں کو۔"

ڈائننگ ہال تک اس کی آواز کی گونج گئی تھی۔

حسین رضا اور حمیرا کے گلے میں نوالے اٹک گئے۔ کھانا ان کے لیے بھی زہر ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا فون بج رہا تھا۔ مسلسل پیغامات آرہے تھے۔ اسے پتا تھا کہ حیا حسین اس کی منتظر ہے۔ حیا اس سے لاکھ محبت کی دعوے دار سہی مگر تھی تو اس کے باپ کے قاتلوں کی اولاد۔ اس کی محبت اس احساس کے نیچے دب جاتی۔ وہ اس کے پیغاموں کو نظرانداز کرتا ناہم کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔

گھر کے منظر نے ان دونوں کو حیران کر دیا۔ مخشل اور حمیدہ ان کے گھر میں ایسے گھل مل کے بیٹھے تھے' جیسے ہمیشہ سے رہ رہے ہوں۔

"بیٹا! تو زبان کا دھنی نکلا' وعدہ کرتے ہی مجھے میری بیوی کے پاس پہنچا دیا۔" مخشل نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ حیرانی سے بولا۔

"یہ... یہ ہے نا میری بیٹی!" مخشل صدیوں کی پیاسی شفقت لیے ناہم کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ارے پاگل! یہ تیرا باپ ہے۔" اس کی ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے مخشل کے قریب کیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

وہ اس عجیب ڈھنگ سے حلیے والے آدمی کو فوری طور پر باپ کے روپ میں قبول نہ کر پا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا سر پکڑ کر ماتھا چوم رہا تھا۔ آنکھیں پونچھ رہا تھا۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہے میری بیٹی۔" خوشی مخشل کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ارے مخشل! یہ تیری بیٹی تو ہے ہی نہیں' ملکال

لگ رہی ہے انکل۔" حمید نے خوشی سے قہقہہ لگایا۔
باہم نروس ہو گئی۔ مگر اک خواہش جو اندر کہیں چھپی ہوئی تھی۔ فوراً" سر اٹھانے لگی۔ اس نے بے اختیار منتظر حسنین کو دیکھا۔ جو اس دلچسپ منظرو مکالمے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"سر! آپ پلیز بیٹھیے میں کولڈ ڈرنک لاتی ہوں۔" اس ماحول سے بھاگنے اور خود کو سنبھالنے کے لیے فوراً بہانہ مل گیا۔

وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر ماموں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا تھا کہ ہمخشل کی بیوی بیٹی مل گئیں مگر ساتھ ہی اس احساس نے رنجیدہ کر دیا کہ اک باپ اپنی بیٹی کے لیے سالوں تک ترستا تڑپتا رہا تھا۔ حمیرا اور حسین رضا سے شدید نفرت کا احساس گہرا ہوا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

رات گئے جب وہ گھر پہنچا تو حسین رضا اور حیا کو جاگتے پایا۔

"منتظر! کہاں رہ گئے تھے تم؟ کتنی دیر سے ہم انتظار کر رہے تھے۔" حیا کا لہجہ نم ہوا۔ حسین رضا لاؤنج کے صوفے سے اٹھے۔

"ہاں بیٹا! میں بھی صبح سے آپ کا منتظر ہوں۔"

"کیوں؟" آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تلخی سے بولا۔

"مجرم ہوں تمہارا۔ معافی مانگنی تھی۔"

"معافی اس بات کی مانگی جاتی ہے، جس کی تلافی ممکن ہو۔" وہ چبا چبا کر گویا ہوا۔ وہ قدم آگے چل کر ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"لا سکتے ہیں وہ پدرانہ شفقت، جو مجھ سے چھین لی۔ کر سکتے ہیں میری ان محرومیوں کا ازالہ، جو میری ماما رات دن ساہی کرتی، پھر بھی میری چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہی۔"

حیا نے آزردگی سے لب بھینچ کر آنکھیں موند لیں۔

"بیٹا! جس کی تلافی ممکن ہو کرنی چاہیے۔ تم اپنے ماموں کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو۔ میں ہمخشل کو بھی بھاری تاوان دینے کو تیار ہوں۔ مانتا ہوں میں غلطی پر تھا۔ مگر مجھے تم سے محبت ہے بیٹا! تم ہمارے ملکوں کے خاندان کے اکلوتے وارث ہو۔" وہ آبدیدہ ہو گئے۔

"محبت؟" وہ لفظ چباتے سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔ "محبت تو خود کو اور دوسروں کو جینے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ خوشی دے کر تحفظ فراہم کرتی ہے، مگر یہ کیسی محبت ہے مسٹر حسین رضا۔ کہ میں خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگا ہوں۔ ہر وقت اپنی موت کا خدشہ اور آپ کی بد نیتی کا اندیشہ رہتا ہے۔"

"بیٹا! تم سے محبت نہ کرتا تو تمہیں اپنا وارث کیوں بناتا۔ اپنی جان سے پیاری بیٹی تمہارے حوالے کیوں کرتا۔" وہ تڑپ کر لہجے میں تلخی لیے ہوئے۔

"خود غرض، لالچی اور حاسد لوگ محبت جیسے نرم و ملائم جذبے سے واقف ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کے پیچھے بھی کوئی چال ہو گی۔"

"یقین کرو بیٹا! میں تمہاری اور حیا کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"وہ سب کچھ! ویسے ہی نا جیسے اپنی اور حمیرا کی خوشیوں کے لیے کیا۔" وہ استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

حسین رضا نے گہری سانس لے کر اپنی شرٹ کا گریبان والا بٹن کھولا۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ ان کی بیٹی سر جھکا کر بوجھل قدموں سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چند لمحوں تک اسے بیڈ پر جوتوں سمیت نیم دراز دیکھتی رہی۔ پھر دل مضبوط کر کے آکر اس کے جوتے اتارے۔

وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو مشرقی بیویوں کی طرح یہ خدمت کے ڈرامے کر کے مجھے جیت لو گی؟"

اس نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ کو نظرانداز کر دیا۔
"نہیں۔۔۔ محبت ہے۔"
"محبت ہونہہ۔۔۔ تمہاری محبت اب میری نفرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" اس کے تحقیر آمیز لہجے نے دل کو تڑپا دیا۔
"مجھے تم سے محبت ہے منتظر! مانا کہ تم رشتوں پر اعتماد کھو چکے ہو مگر وفاؤں کی قسم کو رشتوں پر یقین۔"
اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
"تم مجھے کوئی یقین نہیں دلا سکتیں۔ کھو چکی ہو تم میرا اعتبار' اعتماد اور محبت۔" دونوں ہاتھ جھٹک کر منہ پھیر لیے۔
اس کے لہجے کی انی دل میں پیوست ہوئی۔ وہ بیڈ کے کونے پر ڈھے سی گئی۔

☆ ☆ ☆

ساری رات کی بے چینی کے بعد اس نے اپنے اپ کے ٹکڑے جوڑے ریزہ ریزہ وجود کو مجتمع کیا اور جلدی جلدی ناشتے کی تیاری میں مگن ہو گئی۔ اپنی نگرانی میں ناشتا بنوا کر ٹیبل پر لگوایا۔ پھر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔
منتظر اٹھا تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ ساری رات اسے بے چینی میں نیند نہیں آئی تھی۔ ایسا لگا کہ جیسے حسین رضا اس کو آواز دے رہے ہیں۔ وہ چونک چونک کر اٹھتا' آنکھیں کھول کر دیکھتا۔ صبح کے قریب اسے گہری نیند آئی تھی۔ جاگا تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر باہر آیا تو ڈائننگ ٹیبل پر انہیں اپنا منتظر پایا۔
"آجاؤ منتظر! ناشتہ کب سے تیار ہے۔" حیا نے مسکرا کر استقبال کیا۔
وہ آہستہ روی سے چل کر ڈائننگ ٹیبل تک آیا۔ حیا کے پہلو میں بیٹھنے سے گریز کرتے عین سامنے والی کرسی ہٹائی۔ دونوں ہتھیلیاں ٹیبل پر جما کر حیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھکا۔
"ناشتے میں زہر ملا کر انتظار کر رہی ہو۔۔۔ ہے نا!"

طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تیر گئی۔ حیا تاسف سے اسے دیکھ کر لب کاٹنے لگی۔
"مارنا چاہتی ہو؟"
"میں تو خود محبت کے ہاتھوں مر گئی ہوں۔" اس کی آواز نم ہو گئی۔
حسین رضا کے چہرے پر دکھ امڈ آیا۔
حیا ٹیبل کی دوسری طرف سے گھوم کر اس کے پاس آگئی۔
"میری رگوں میں تمہاری محبت دوڑتی ہے منتظر!"
"اور میری رگوں میں تمہاری نفرت۔۔۔ گھن آتی ہے مجھے تم سے' تمہاری محبت سے۔" بھنویں اچکاتے حیا کو گھورا' جو اس کے سامنے ایستادہ تھی۔
"اور تمہاری رگوں میں دوڑنے والے اس خون سے' جو تمہاری قاتل ماں کے ناپاک بطن سے تم میں منتقل ہوا۔"

حمیرا غصے میں کھڑی ہو گئیں۔ حسین رضا نے ذرا سا ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ بھی بولنے سے منع کیا۔ حمیرا کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔
"تم۔۔۔ تم قاتل کی بیٹی ہو۔ مجھے بھی قتل کرنا چاہتی ہو اپنی ماں کی طرح۔"
حیا کے آنسو اس کے گالوں پر رواں ہو گئے۔ وہ صرف دکھ سے نفی میں سر ہلاتی رہی۔
"مگر میں تمہیں یہ موقع کبھی فراہم نہیں کروں گا۔ میں۔۔۔ منتظر ہوں۔" اس نے اپنے سینے پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی رکھی۔ "حسین رضا نہیں کہ بے خبری میں مارا جاؤں۔" وہ نفرت سے کہتا باہر نکلا۔
"اس۔۔۔ اس کی اوقات کیا ہے' جو یوں ہمیں بے عزت کر رہا ہے۔" پیچھے سے حمیرا کی دہاڑ سنائی دی۔
"اس کی اوقات یہ ہے کہ وہ تمہاری بیٹی کا شوہر ہے۔"
حسین رضا نے حمیرا کو جواب دیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مسکرایا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆ ☆ ☆

آفس میں اس کا دل آج بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ناشتا بھی نہیں منگوایا۔ وہ بھی کتنی ہی دیر کرسی پر جھولتا رہا۔ اس کے اندر جیسے آگ بھری تھی۔ جو اسے جلا رہی تھی۔ بے سکون کر رہی تھی۔ وہ فرار چاہتا تھا۔ ان حالات اور اپنی حالیہ زندگی سے۔

"السلام علیکم سر!"

اس نے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی ماہم کو دیکھا۔

"کیسی ہیں مس ماہم؟" چاہنے کے باوجود وہ مسکرا نہ سکا۔

"بالکل ٹھیک سر! مگر لگتا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کا ساتھ رہا تو میری طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔

"جی سر!" وہ ٹھٹک گئی۔

"آپ کیسی میزبان ہیں؟" اس نے بے وجہ بات بڑھائی۔

"یہ تو آپ اپنے مہمانوں سے پوچھیں؟" وہ کھلکھلائی۔

"وہ تو بہت خوش ہیں آپ کی میزبانی سے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی بات ہوئی ہے فون پر۔"

"پھر تو میں اچھی میزبان ہوئی نا سر!" وہ خوش ہوئی۔

اس کی بات پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ کسی حد تک وہ ذہنی دباؤ سے باہر آیا۔

"چلیں تو پھر ناشتا منگوائیں۔ آج ناشتا کر کے نہیں آیا۔ اصل میں آنکھ ہی دیر سے کھلی۔ اس وجہ سے۔" اس نے خواہ مخواہ وضاحت دی۔

☼ ☼ ☼

"ماموں! گھر جانے کو دل نہیں کرتا۔ بحالت مجبوری جاتا ہوں۔" وہ حمید ماموں کے پاس بیٹھا تھا۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے؟" حمید نے ڈرائنگ روم میں اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھے مظفر کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"دعوے تو بہت بڑے بڑے کرتی ہے۔" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"دعوے تو کرے گی نا بیٹا جانی! تاکہ تم بے وقوف بنے رہو اور وہ اپنی ماں کی طرح تمہارا کام تمام کر دے۔" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نفرت سے بولے۔

مظفر کو حیا کی باتیں یاد آئیں۔

حمید نے سوچ میں ڈوبے مظفر کو دیکھا۔

"تم اپنی نفرت پر قائم رہنا۔ مت بھولنا کہ وہ تمہارے باپ کے قاتلوں کی بیٹی ہے۔ سمجھو قاتلوں کی جان تمہارے قبضے میں ہے۔ اب تو حساب چکانے کا وقت آیا ہے۔"

مظفر کے اعصاب تن گئے۔ لب بھینچ کر اس نے غصے کو روکا۔

"تم تو اپنی ماں کی دربدری کا، اپنی عمر بھر کی محرومیوں کا، میری اور حطشیل کی قید کا اور سب سے بڑھ کر اپنے باپ کے قتل کا۔"

حمید کا ایک ایک لفظ اس پر پوری شدت سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ماموں ہی نہیں محسن بھی تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے کہو کہ بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے بہت جنوں ہے اس کا

یہ شعر بار بار سسکی بن کر اس کے لبوں پر مچلتا تھا۔ سارا دن گزر گیا شام سے رات ہو گئی۔ وہ مظفر کی منتظر ہی رہی۔

اس نے نہ دن کا کھانا کھایا تھا نہ شام کی چائے پی تھی۔ عجیب چڑچڑا پن اس کی طبیعت پر وارد ہو جاتا۔ جب حمیرا اس کو کچھ کھانے پینے کو کہتیں۔ وہ مظفر کو دل ہی دل میں کوستی رہیں۔ حیا کے سامنے کہنے کی ہمت نہ کر پائیں۔

وہ فون کرتی تو بند، میسج کا جواب نہ آتا۔ آفس کے فون سے آدھے دن تک۔

"سر ماہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔" کا جواب۔

وہ سر کو کرتی تو۔ "سر آفس سے چلے گئے ہیں۔" کا جواب جان جاتی تھی۔ چار دن گزر گئے تھے۔ اس نے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ وہ رات دیر تک لان میں اس کا انتظار کرتی۔ وہ مبارک گھڑی تھی کہ وہ آیا تھا مگر اس کو نظر انداز کر کے وہ تیزی سے کمرے میں چلا گیا۔

"آپ کے بغیر چار دن چار صدیوں سے کم نہیں تھے۔ آپ کو پتا ہے میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

"نہیں رہ سکتیں تو رہنا سیکھ لو۔" وہ غصے سے پلٹا۔

"ہر وقت قید کا سا احساس رہتا ہے مجھے' میں یہاں نہ اپنی مرضی سے سو سکتا ہوں۔ نہ اٹھ سکتا ہوں' نہ کھا سکتا ہوں' نہ پی سکتا ہوں' تم مسلط ہو کے رہ گئی ہو مجھ پہ۔ کیوں؟ کیا میں تمہارا غلام ہوں' یا تمہارے باپ کا۔"

تیز لہجے پر اس کا دل لہو بن کر آنکھوں میں چھلک آیا۔

"انتخاب۔" اس کے لب ہلے۔

"بکواس بند کرو' میں کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں اور ہاں' یہ ڈھکوسلے مت کیا کرو میرے سامنے۔ پوری حمیرا لگتی ہو' بالکل۔"

وہ اس کے ماں' باپ کا ذکر ہتک آمیز انداز میں کرتا۔ مگر وہ یہ بھی برداشت کر جاتی کہ شاید اس کا غصہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔ ایک امید کا دیا دل کے دوار روشن رہتا۔

☼ ☼ ☼

"یہ حقیقت ہے کہ میں اس سے شادی کے بعد خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔" وہ باربی کیو میں بیٹھا تھا۔ ماہم انہماک سے سنتی کھانے کے ساتھ مکمل انصاف کر رہی تھی۔ اس کی اس بات پہ اس کے دل میں مایوسی اتری' وہ دونوں ایک مشہور ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

"مگر یہ اس سے بڑی حقیقت ہے کہ اب میں خود کو بدنصیب ترین انسان تصور کرتا ہوں۔ میری بیوی وہ ہے کہ جس کے ماں' باپ نے میرے باپ کو قتل کیا۔ میری ماں پر رکیک الزامات لگائے۔ مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔" اس کے لہجے میں دکھ پھر غصہ نمایاں ہو کر ابھرا۔ ماہم نے اس کی بات پر خوشی بھری سانس لی۔ اسے جیسے ڈھارس مل گئی۔ یک گونہ اطمینان اس کے رگ و پے میں امڈ آیا۔

اسے یک دم سب کچھ زہر لگنے لگا۔ پلیٹ اپنے آگے سے ہٹا کر اس نے ٹشو سے ہاتھ پونچھے۔

"زندگی کی ساری آسائشیں' سہولتیں جو مجھے مل سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے مجھ سے چھین لیں۔ میں ان کی بیٹی کو اپنی بیوی' اپنی شریک زندگی کیسے تسلیم کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک۔ ایک بات کہوں سر' اگر آپ برا نہ مانیں تو؟" اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"شیور۔ ضرور کیوں نہیں۔ آپ تو اس شخص کی بیٹی ہیں۔ جس نے مجھے حقیقت سے آشنائی دی۔ آپ کی کوئی بات مجھے بری نہیں لگے گی۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔

"آپ اگر ان سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ تو انہیں اپنی زندگی سے نکال کیوں نہیں دیتے؟" اس کے دل کی بات زبان پر آگئی۔

"بس فی الحال کچھ مجبوریاں ہیں۔ جب شادی ہوئی تو مجھے حیا کی جائیداد کا کوئی لالچ نہ تھا۔ اس لیے اس معاہدے کا تفصیل جائزہ لینے کی زحمت ہی نہیں کی۔ جو حسین رضا نے حیا اور میری شادی کے وقت کروایا تھا۔" اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔

"ہمارا وکیل بیرون ملک گیا ہوا ہے۔ جیسے ہی آئے گا میں اس سے' معاہدے اور طلاق کے بارے میں بات کروں گا۔"

ماہم کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ قدرت اس کے راستے کی رکاوٹ دور کرنے کا خود ہی بندوبست کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا وہ مجھے قبول کرلیں گے؟" بالکونی میں کھڑی
ہالم قمقموں کی روشنیوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ "منتظر
میرے حواس پر چھا گئے ہیں۔ پتا نہیں مجھے ان سے
محبت ہوگئی ہے یا اپنی دربدری' ناآسودگی' احساس
محرومی کو ختم کرنے کا اک وسیلہ سمجھ بیٹھی ہوں' ناتمام
خواہشات ان کی ذات سے پوری کرنا چاہتی ہوں۔"
اس نے گہری سانس بھر کر اڑتی لٹ کان کے پیچھے
اڑسی۔
"کچھ بھی ہو' ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے لیے بے حد
ضروری ہوگئے ہیں۔ اتنے ضروری کہ مجھے لگتا ہے اگر
وہ نہ ملے تو میں ادھوری رہ جاؤں گی' مگر کیا وہ مجھے قبول
کرلیں گے؟"
کئی دن کا سوال جو اندر ہی اندر کھٹک رہا تھا۔ پھر اپنی
جگہ آموجود ہوا۔ مانا کہ انہوں نے بھی کسمپرسی کی
زندگی گزاری ہے۔ محرومیوں میں پلے بڑھے ہیں۔ مگر
پھر بھی ہے تو ملکوں کا خون اور میں ان کے باپ کے نوکر
کی بیٹی۔
وہ مایوسی سے نفی میں سرہلا رہی تھی۔ یہ سوچ اس
کے پورے وجود کو مضمحل کر رہی تھی۔ کیا وہ یہ طبقاتی
فرق مٹانے کو تیار ہو جائیں گے۔ وہ فاصلے مٹنے کے
بعد اب بھی ملک منتظر ہیں اور میں اپنے باپ
کی طرح ان کی ملازم۔ ایک سوال کھڑا ہی بیچ میں آ
اٹکتا ہے۔
"یااللہ منتظر کو مجھے دے دے۔" اس نے دل سے
دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے پچھلے پہر کا سناٹا' صرف اس کمرے میں
ہی نہیں اس کے دل میں بھی موجود تھا۔ اس کا ہم سفر
ہم نشین' شریک حیات اجنبیت اوڑھے سو رہا تھا۔
وہ جو محبت میں یک جان بننے کی چلہ کشی تھی۔
جب جدوجہد ختم ہوئی تو تجہ دوئی کی صورت نکلا۔
دوئی بھی ایسی جہاں ایک ہی بستر پر صدیوں کا فاصلہ
سمٹ آیا۔ اس نے اپنا دم گھٹتا سا محسوس کیا۔ وہ آہستگی
سے اٹھی۔ اس کے پاؤں ابھی زمین پر ٹکے بھی نہ تھے
کہ منتظر نے سرعت سے اٹھ کر اس کا بازو پکڑا۔ اس
نے حیرانی سے منتظر کو دیکھا۔ جو اس کا بازو سختی سے
پکڑے ہانپنے والے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔
"کہاں جا رہی ہو؟" بے یقینی میں ڈوبی آواز میں
غصہ نمایاں تھا۔
"دم گھٹ رہا تھا' باہر لان میں جا رہی تھی۔"
"بہانے بنانی ہو مجھ سے' جھوٹ بولتی ہو' مارنا
چاہتی ہو نا مجھے' بولو۔ بولو۔"
اس نے شانوں سے پکڑ کر حیا کو جھنجوڑا۔ حیا کو اس
وقت وہ پہلے والا سلجھا ہوا منتظر نہیں لگتا تھا۔ وہ بالکل
ابنارمل لگ رہا تھا۔
"جب جینے کی جستجو زندگی کی لگن عروج پر ہو۔ تب
بھلا کوئی کیسے آپ کو بھی مارتا ہے۔ منتظر!" حیا کے
لہجے میں دکھ اور الم کا ہجوم سمٹ آیا۔
"غلط۔ غلط۔ غلط۔" وہ پرزور انداز میں گویا ہوا۔
"نہ میں تمہاری جینے کی جستجو ہوں' نہ زندگی کی لگن۔"
"آپ میرا سب کچھ ہیں۔" اس نے "سب کچھ"
پر زور دیتے کہا۔
"میں نے تمہاری سازش ناکام بنا دی ہے۔ تب ہی
ایسا کہہ رہی ہو نا؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔
"ناگن کی بیٹی ناگن ہی ہوتی ہے۔ زہر تو تمہاری
سرشت میں ہے۔" اس نے آنکھوں میں آنکھیں
گاڑیں۔ "ڈسنا چاہتی ہو مجھے' ہرانا' جھکانا چاہتی ہو نا؟"
سوالیہ کڑی نگاہوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔
حیا کا دل کٹ مرنے کو چاہا۔ وہ نڈھال ہو کر وہیں بیڈ
کے کونے پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تیزی سے بھیگتا جا رہا
تھا۔ منتظر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
"اپنا کالی پر رو رہی ہو؟"

☼ ☼ ☼

"تم ہالم سے شادی کرلو۔" ایک دم سے بنا کسی
تمہید کے حمید ماموں کے اس مشورے پر وہ خاموشی
سے ماموں کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں بری لگی میری بات۔" حمید ماموں سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ وہ روز ماہم کو ڈراپ کرتا' چند گھنٹے ماموں کے ساتھ گزارتا' کبھی رات کو وہیں رہ جاتا' کبھی واپس گھر جاتا۔

"نہیں بری تو نہیں لگی۔"

"وہ ان کی بیٹی تو تمہارا گھر بسانے سے رہی' جہاں تمہیں نیند بھی اس خوف سے نہیں آتی کہ کہیں سوتے میں قتل نہ کر دیے جاؤ۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو برخوردار!" ماموں نے شانے پر تھپکی دی۔

"ماموں! میں دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ سارے بزنس سرکل میں یہ خبر پھیل جائے کہ حسین رضا کے داماد نے دوسری شادی کرلی۔" وہ مختم لہجے میں گویا ہوا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ حسین رضا کی بیٹی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔" حمید ماموں خوشی سے بولے۔

"اب دیر کس بات کی؟" ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ فوراً اس کی شادی کردیں۔

"بس ماموں! وکیل سے وارنٹ آنے کا انتظار ہے۔ فیصلی کونے کر چھٹیوں پر جانے لگا ہوا ہے۔"

"وہ کس لیے؟" ماموں نے بھنویں سکیڑ کر حیرت سے پوچھا۔

"اصل میں شادی کے وقت حسین رضا نے ایک معاہدہ کروایا تھا۔ اس وقت میں نے سرسری دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اب یہ فیصلہ کرتے وقت میں تفصیل سے وہ معاہدہ وکیل سے لے کر پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ پھر بہتر حکمت عملی سے سارے کام سرانجام دے سکوں۔"

"ہاں ہاں ضرور۔ یہ تو بڑی عقل مندی کی بات ہے بیٹا!"

☆ ☆ ☆

"سر! بیرسٹر وقار احمد آئے ہیں۔"

"لے کے اندر بھیجو۔"

"السلام علیکم مسٹر مظفر حسنین!" اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"وعلیکم السلام! بڑے دن لگا دیے وکیل صاحب!"

"بس کیا کریں مظفر صاحب! اس دوڑتی بھاگتی زندگی سے بمشکل کچھ وقت چرا کر فیملی کے ساتھ گزارے ہیں' ورنہ کراچی کی مصروف زندگی تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

"جی ہاں بیرسٹر صاحب! آخر بڑے شہروں کے بڑے لوگوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔" وہ نادانستہ کہہ بیٹھا۔ وکیل صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"ویسے کیا ہوا؟ منشی نے بتایا کہ آپ ایگریمنٹ کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کاپی ہے۔" انہوں نے ایک کاپی اس کے سامنے رکھی۔

"یہ معاہدہ باہمی رضامندی کے ساتھ حیا حسین بنت حسین رضا اور مظفر حسنین کے درمیان ہے۔ دونوں فریق حیا ٹیکسٹائل مل کے برابر کے شریک ہوں گے۔ دونوں فریق شریک حیات بن کر ساری عمر ایک دوسرے کے ساتھ محبت' عزت سے نبھائیں گے۔ ان میں سے اگر کوئی بھی فریق اس رشتے کو توڑنے یا علیحدگی کی صورت میں اپنے ففٹی پرسینٹ شیئر فریق ثانی کو دینے کا پابند ہو گا یا ہوگی۔ علاوہ ازیں یہ کانٹریکٹ حیا حسین کی مرضی و منشا کے مطابق ہوگا۔"

نیچے اس کے دستخط موجود تھے۔

اس نے تب دستخط کرتے ایک نظر بھی معاہدے پر ڈالنا گوارا نہ کی تھی۔

غصے سے اس کی کنپٹی کی رگ پھڑک رہی تھی۔ بوڑھے نے جال پھینکا' وہ اس میں پھنس گیا۔

"بیرسٹر صاحب! کوئی ایسی صورت جس میں علیحدگی کے بعد بھی مجھے اپنے ففٹی پرسینٹ شیئر سے دست بردار نہ ہونا پڑے۔"

"اس کی صرف ایک صورت ہے' اگر حیا حسین خود آپ کو ففٹی پرسینٹ شیئر دے دے۔"

"میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے قلم کو ہاتھوں کی دونوں انگلیوں میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"اس کی اجازت بھی تحریری طور پر حیا حسین سے لینی پڑے گی۔" تیمور نے سگار کا کش لگایا۔

"تیمور صاحب! میں آپ کو منہ مانگی رقم دوں گا کوئی حل نکالیں آپ' ایگریمنٹ کو ادھر ادھر کریں' کوئی تبدیلی وغیرہ۔" وہ پریشانی سے بولا۔

"مظفر صاحب! یہ معاہدہ ہمارے پورے چیمبر کے پاس ہے' صرف میرے پاس نہیں اور آپ دونوں قانونی طور پر ایک دوسرے کی املاک کے وارث ہیں۔ ذاتی اور کاروباری زندگی میں ایک دوسرے کی رضا مندی کے قانونی محتاج۔ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو صرف آپ کی مسز ہی کر سکتی ہیں۔ آپ اپنی وائف کو راضی کریں۔"

"تب مجھے پھر اس ڈائن کی بیٹی کے آگے دست سوال دراز کرنا پڑے گا۔" اس سوچ کے تحت اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

وہ تیزی سے سیل اٹھا کر باہر نکلا۔

"سر یہ فائل؟" ماہم جو اندر آرہی تھی اسے یوں باہر جاتے دیکھ کر ٹھٹکی۔

"یہ رکھ دیں۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔"

ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ حسب معمول ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال کر اس نے ماہم کے لیے اگلا دروازہ کھولا اور تیزی سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ رخ ماہم کے فلیٹ کی طرف تھا مگر وہ سارے راستے خاموش رہا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اس کے چہرے کے تناؤ کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"عیاری تو دیکھو حسین رضا کی۔" بخشل بولا۔ سب سر جوڑ کر اس مسئلے کو سلجھانے بیٹھے۔

"اگر تم دست بردار ہو جاؤ تو تمہارے پاس کتنے اثاثے ہیں؟"

"ماموں! سارے اثاثے ان ہی کے ہیں میرے پاس اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں صرف ایک کروڑ ہیں۔" وہ بے دلی سے بولا۔

"یہ فلیٹ؟" بخشل نے سگریٹ کا دھواں ناک سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ان ہی کا۔"

"گاڑی؟"

"ان ہی کی۔"

"برخوردار! انہوں نے تمہیں بالکل ہی خالی ہاتھ اور اپنا دست نگر رکھا ہے۔ لیکن فکر کی بات نہیں' ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

وہ ماموں کو غور سے دیکھنے لگا۔

"تمہارا بیٹا ڈائن کی بیٹی کی زندگی سے مر جائے گی ان بہت اچھے۔"

"ہائے! لگا جیسے کسی نے دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔" بڑی جذباتی ہوئی۔

"اس کی محبت سے فائدہ اٹھاؤ۔ نفرت بھی اپنے ساتھ باندھ کے رکھو' اور اپنے بھی سارے کام نکالتے رہو۔" حمید کا انداز رازدارانہ رہا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے' آزماؤ اس کی محبت کو۔" بخشل جذباتی ہوا۔

"پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں بیٹا!" حمید نے اس کا کاندھا تھپکا۔

"آج کھانے میں کیا بناؤں۔" خورشید نے روز کا مسئلہ سامنے رکھا۔

"ارے یہ لوگ تو جا رہے ہیں نا خود کھا کر آئیں گے ہمارے لیے لے کر آئیں گے۔" بخشل ہنسا۔

"بس جلدی آنا۔ زیادہ بھوک برداشت نہیں ہوگی۔" حمید نے خوش ہوتے کہا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا ہے یار! کمرا نشین ہو گئی ہو کال ریسیو نہیں کرتیں فون کرو تو ملازمہ جواب دیتی ہے۔ بی بی تو اپنے کمرے میں ہیں۔" مہرین کمرے میں داخل ہوتے ہی

کئی شکوے بیٹھی۔ وہ خاموشی سے غائب دماغی سے اسے دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا؟ منتظر بھائی کے ساتھ کوئی ٹینشن چل رہی ہے۔ آنٹی بتا رہی ہیں' وہ چند دن سے گھر بھی نہیں آئے۔"

اس کا دل بھر آیا۔ چاہنے کے باوجود بھی جواب نہ دے سکی۔ اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"تم نے بلایا؟ فون پہ بات ہوئی؟"

"کئی بار.... فون اٹھاتا ہی نہیں ہے۔" گلے میں پھر کچھ اٹکا' آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ ہر منظر دھندلا گیا۔ مرین نے اس کے ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔

"مردوں کی عادت ہوتی ہے ادھر ادھر منہ مارنے کی' سنبھل جائے گا' حوصلہ رکھو۔"

"تمہیں شاید حقیقت کا علم نہیں۔"

"ارے سب علم ہے۔ چھوڑو یہ رونا دھونا۔ اٹھو فریش ہو جاؤ' کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا مرین۔"

"اے ہاں اسے کھونا' اسی کے ہجر میں رہنا یہی تو عشق ہے' محسن! تو ہم تنہا ہی اچھے ہیں" اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر ہوئے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

حیا کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ مرین نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"چلو اٹھو' تھوڑا موڈ بہتر ہو جائے گا۔"

وہ بادل نخواستہ آ گئیں۔ آرادوں کے چاروں طرف جائزہ لینے کے لیے نظریں گھمائیں۔ مگر نظر نے لوٹنے سے انکار کر دیا۔

مرین نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔

"وہ!" اک گہری سانس خارج ہوئی۔

"ان کو میں ایک بار گاڑی میں بھی دیکھ چکی ہوں۔ میں سمجھی کہ منتظر بھائی اپنی رحم دل طبیعت کی بنا پر بام کو گھر ڈراپ کرنے جا رہے ہیں۔ مگر بات شاید اور ہے۔"

کتنا اذیت ناک منظر تھا۔ وہ جس دیوتا کی پجارن تھی۔ وہ دیوتا کسی اور کے ساتھ تھا۔ کتنا خوش نظر آ رہا تھا بام کے ساتھ۔ ہشاش بشاش' باتیں کرنے میں مگن بیٹھا تھا۔

مرین نے اس کے زرد پڑتے وجود کو دیکھا۔

"خود کو سنبھالو حیا! بعض دفعہ زندگی میں بہت تکلیف دہ حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب سہنا پڑتا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔" اس نے منتظر سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے حیا کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔

اسے لگا جیسے وہ مردہ وجود کو گھسیٹتی جا رہی ہے۔

"تو یہ طے ہے' منتظر حسنین کہ اب تم میری طرف نہیں لوٹو گے۔"

☆ ☆ ☆

رات بیت رہی تھی اور وہ فراق یار میں گھل رہی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا' لاڈ اٹھواتے اٹھواتے اسے بڑا کیا۔ اسکول' کالج' یونیورسٹی کے دور سے گزر کر وہ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ رہی تھی۔ جب حسین رضا نے اس کے نام پر ٹیکسٹائل مل لگانے کا منصوبہ بنایا اور اچانک اک دن بابا منتظر حسنین کو لے آئے۔

"یہ بڑا قابل اور محنتی نوجوان ہے۔ میں نے ابھی سے مل کی جی ایم کی پوسٹ پر اپائنٹ کر لیا ہے۔ سارے تعمیراتی کاموں کی نگرانی بھی اس کے ذمے ہو گی۔"

اس پہلی ملاقات نے اس پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا سب کچھ بن گیا۔ محبت کا اک اک لمحہ احساس کے کواڑوں سے جھانک رہا تھا۔

جب سے مرین اس کو چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔

آدھی رات کو دروازہ کھلا۔ وہ اندر آیا۔ کسی طرح سے لاک لگایا' پلٹا' اس کو نظر انداز کر کے واش روم میں چلا گیا۔ چینج کر کے آیا تو پہلی بار اس کو بغور دیکھا۔

"تم یوں بیٹھ کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
وہ پلٹ کر اس کی طرف آیا' ٹھوڑی سے پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
"تم سمجھتی ہو کہ میں متاثر ہو جاؤں گا کہ میری مشرقی بیوی رات گئے میرے انتظار میں جاگتی رہتی ہے۔ خام خیالی ہے تمہاری۔" وہ چبا چبا کر بولا۔
اس کی آنکھیں نئے سرے سے مرچوں سے بھر گئیں۔
"یہ۔ یہ آنسو مجھے موم نہیں کر سکتے۔ بند کرو یہ ڈرامہ۔" اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا۔ اس کا شہر دل لٹ چکا تھا۔
نہ چاہتے ہوئے بھی گھٹی گھٹی سسکیاں اس کے بے آواز بینوں میں شامل ہو گئیں۔
"خضر پلیز۔ میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ آپ کے ساتھ خوش رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر ایک بار پھر بھیک مانگی۔
"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر' تمہارے ماں باپ پر اور اس گھٹیا بندھن پر۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے اپنا بازو چھڑا کر اسے دھکا دیا وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ زمین کے اوپر جا گری۔
اس کی محبت بھری جھوک کو نفرت کا سموم نگلتا جا رہا تھا۔ دل بکھر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت خوش تھی۔ آج اس کی سنگت میں خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کیا تھا۔
وہ سونے کے لیے لیٹی تھی۔ اس کے سیل پہ بیل ہوئی۔ اس نے فوراً" اٹھایا۔ مبادا خضر نہ ہو مگر اسکرین پر مہرین کا نام آ رہا تھا۔
"ہیلو۔ السلام علیکم مہرین! کیسی ہیں؟"
"کیسا ہونا چاہیے؟" چبھتا ہوا لہجہ۔
"جیسی ہمیشہ ہوتی ہیں' زندہ دل' خوش مزاج' خوش باش۔" ناہم ہنسی۔

"تو تم اب بھی مجھ سے یہی توقع رکھ رہی ہو۔"
"کیا مطلب؟"
"جان بوجھ کر انجان نہ بنو؟"
"یقین کریں۔ مہرین میں نہیں سمجھی۔"
"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"
"کیا کہہ رہی ہو؟ کون سی امید؟ میں واقعی نہیں سمجھ پا رہی ہوں۔"
"سمجھ بھی کیسے سکتی ہو' جھونپڑی سے اٹھ کر محلوں کے خواب جو دیکھ رہی ہو۔"
"پلیز الزام تراشی مت کریں۔"
"میں نے خود تمہیں آج خود خضر بھائی کے ساتھ ڈنر کرتے دیکھا ہے۔ تم۔ اس کی معمولی سی ملازمہ' آخر کس حیثیت سے اس کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی تھیں۔"
"پلیز تمیز سے بات کریں مہرین!"
"واہ۔ تم نے اپنی محسن کو ڈسا ہے' جس نے میرے صرف ایک بار کہنے پر تمہیں فوراً" جاب دی۔ کتنی کم ظرف ہو تم۔"
"میری حیا اور ان کے والدین کا ظرف بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔" ناہم کا لہجہ طنزیہ ہوا۔
"تمہارے جیسے کسی کمین لوگوں سے یہی توقع رکھی جا سکتی ہے۔" مہرین کی طیش بھری آواز ابھری۔
"یاد رہے خضر بھی اک ایسی کمین عورت کا ہی بیٹا ہے' جسے حیا نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔"
"ہاں تب ہی بھگت رہی ہے نا۔"
"مہرین صاحبہ وہ صرف اپنے والدین کا کیا بھگت رہی ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دے کر سیل ہی آف کر دیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے سے قطرے نمودار ہوئے۔ اب کیا ہوگا' اس کی نیند اک بار پھر اڑ گئی۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

صبح رات کا بوجھل پن لیے نمودار ہوئی۔ وہ بند پڑے دروازے شاید ساری رات روتی رہی تھی۔ اک کمرے

کے لیے لب اس پر ترس گیا۔ پھر فوراً "جھٹکایا۔

"ڈائن کی بیٹی ڈائن۔"

حیا کی مندی آنکھیں کھلیں تو نظر اس کی پشت پر پڑی۔ دھڑام سے دروازہ بند ہوا۔ وہ بوجھل دل بوجھل وجود' بوجھل آنکھیں لیے فوراً" اٹھی۔ اس کے پیچھے لپکی۔

"استغفر بہ شاہ!"

اس کی آواز پر وہ رکا' پلٹا تو سامنے سے ناشتے کے لیے آتے حمیرا اور حسین رضا کو دیکھا۔

حمیرا کو دیکھتے ہی اس کے اندر سے لاوا ابل پڑا۔

"او رات کے ڈر سے سیرابی نہیں ہوئی۔ ابھی ناشتے کی بھی ضرورت ہے۔" وہ دل جلانے والی مسکراہٹ سے اس کے سامنے آیا۔ اس نے گھبرا کر سامنے کھڑے ماں' باپ کو دیکھا۔

"تم یہ کیا کر رہے ہو ہماری بیٹی کے ساتھ؟" حمیرا بھڑکیں۔

"جیسا آپ نے میرے باپ کے ساتھ کیا تھا' ویسا ہی۔" اس نے حمیرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزیہ کہا۔

"ہم نے تمہارے باپ کے ساتھ کچھ نہیں کیا جو کیا تمہاری ماں نے کیا۔"

"بکواس بند کرو مکار عورت۔" وہ دھاڑا۔

"ہمارے گھر میں بیٹھ کر' ہمارا کھا کر ہم پر دھاڑتے ہو۔" حمیرا چیخیں۔

"اور تم لوگ جو سالوں تک میرے باپ کی جائیداد ہڑپ کر کے بیٹھے ہو' تمہاری رگوں سے کھینچ کے نکالوں گا اپنی جائیداد۔"

"کنگلے! تھا کیا تمہارے پاس' گلے پڑ گئے ہو ہمارے۔"

"حمیرا بیگم! یہ مل میرے باپ کی جائیداد سے بنی ہے۔ احسان نہیں کیا آپ نے۔ نہ مجھے بخشش میں دی ہے۔" وہ حسین رضا کے مدمقابل آیا۔ "یہ میرا حق ہے۔ وہ حق جو آپ نے میرے باپ سے چھینا تھا۔

افسوس رہا ہوں اس دن کو جب تمہیں داماد بنانے کی پیش کش کی تھی۔ سوچا بھتیجا ہے' زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی حق ہے' مگر تم تو انتہائی محسن کش نکلے۔" ان کے لہجے میں افسوس' دکھ کیا کچھ نہ تھا۔ وہ دل کھول کر طنزیہ ہنسا۔

"بھول گئے مسٹر حسین رضا! کہ ہر بازی پلٹنے والا اوپر بیٹھا ہے۔" انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ "آپ جیسوں کو مکافات عمل سے گزارنے والا۔ آپ چاہیں تو بھی اس سخت پکڑ رکھنے والے کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے' بس کبھی وہ خود پکڑ لیتا ہے۔ کبھی کسی انسان کو وسیلہ بناتا ہے۔ پکڑنے کا بہت برے پھنسے ہیں حسین رضا! چاہیں بھی تو اپنی گردن نہیں چھڑا سکتے۔"

حیا تو سکتے میں تھی۔ حسین رضا اور حمیرا پر بھی سکتہ طاری ہو گیا۔ حقیقت کے زور نے ان کو لرزا دیا۔ خضر جنید سرعت سے باہر نکلا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح تک ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ آفس پہنچتے ہی اس نے پیون سے سر کے آنے کا پوچھا۔

"صاحب ابھی نہیں آئے۔"

جب سے اس نے جوائن کیا تھا' یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنا لیٹ ہو گیا ہو۔ وہ لیٹر ٹائپ کر کے خضر کی منتظر تھی۔

ٹھیک دس بجے وہ آفس میں داخل ہوا۔ وہ فوراً" اس کے پیچھے لپکی' خاموشی سے فائل اس کے سامنے رکھ کر پلٹی۔ خضر نے اک سرسری نظر فائل پہ ڈال کر اس کو پکارا۔

"مس ہاتم!" وہ دروازے سے باہر نکلتے نکلتے رکی۔

"ادھر آئیے۔" وہ آہستگی سے واپس مڑی۔

"بیٹھیے۔" تحکمانہ لہجہ۔

اس نے اک نظر خضر کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر غصے کی لہر ابھر آئی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" کاغذ ہاتھ میں اٹھا کر لہرایا۔

"میرا ویرائٹی سر!"

"کیوں؟"

"سر! ہمیں رات ڈنر کرتے آپ کی وائف اور بیٹی نے دیکھ لیا۔"

"مجھے پتا ہے اس بات کا۔" اس نے بیچ میں اس کی بات کاٹی۔ "پھر؟" سوالیہ نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

"سر! جو ملازمت دلوا سکتے ہیں' وہ نکلوا بھی تو سکتے ہیں نا؟" اس کے بچگانہ سے تبصرے پر وہ مسکرا دیا۔

"یقیناً" ملازمت دی ان کی مرضی سے تھی۔ مگر نکالنا کا اب اپنی مرضی سے۔ اطمینان رکھیے! اب اگر نکلیں گے تو اکٹھے ہی نکلیں گے۔" وہ پہلی بار مسکرایا۔

ماہم کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔

"رات میں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور میں بھی چاہتا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ لیں۔ اسی لیے صف ماتم بچھی ہوئی تھی ان کے ہاں۔" وہ محظوظ ہو کے ہنسا۔

✲ ✲ ✲

تم جو کہتے ہو کہ کیوں روتے ہو اس بن جو چاہت
سے نادان تنگ نہ کر بس یہ جو بیمار ہوتے ہیں
پورے تین دن ہوگئے تھے اسے ہم انیتے ہوئے۔ وہ

حسب معمول اس کا فون انیڈ کر رہا تھا نہ میسج کا جواب دے رہا تھا۔

وہ جیسے یار منائے "کیسے دل کو بہلائے اور اگر یار نہ مانے تو جو کوئی کرنہ تھا اس کے پاس یار کو منانے کا۔ گریہ۔ گریہ صرف گریہ تھا جو اس کے بس میں تھا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا ایک بہانہ تھا یا قرینہ۔ کمرے کی افسردہ بوجھل فضا میں وہ خوشگوار جھونکے کی مانند آیا تھا۔

اس نے ویدہ بیدار میں بے پناہ چاہت کا جہان سمو کر اسے دیکھا۔

وہ اس کے قریب آیا' جیب سے چیک نکال کر اس کے سامنے لہرایا۔

"اس پر دستخط کردو۔" کتنے دنوں بعد اس کا لہجہ اور رویہ نارمل تھا۔ وہ بھول گئی ساری کج ادائیاں' رسوائیاں' اس کے سامنے اس کا محبوب پوری دل فریبی کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے فوراً' ہاتھ سے چیک لے کر دستخط کردیے۔ اس نے یہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا کہ کتنی رقم کا چیک ہے۔ اسے جب بھی بڑی رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ جوائنٹ اکاؤنٹ سے چیک کیش کرواتے' وہ چیک دے کر بتاتا کہ اتنی رقم اس کام کے لیے چاہیے' وہ دستخط کردیتی۔

مگر آج اس کی زندگی میں وہ لمحہ تھا جو ہر کسی محبت کرنے والے کی زندگی میں آتا ہے۔ جب محبوب کو دیکھنے کی خواہش زندگی کی قیمت پر بھی قبول ہوتی ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی چیک کی رقم پر غور نہیں کیا۔ اس کا محبوب اس کے سامنے تھا پاس تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا۔ دل مضطر کو قرار دیا۔ بے کلی' سکون میں بدل ہوئی۔ بے قراری قرار کے بیٹھ گئی کی سب بے چینی نے چین کو چوم لیا۔ محبت پر اس سے کاملیت کا نزول ہو رہا تھا۔

وقت تھم جانے کی خواہش پوری شدت سے ابھری۔

اس سے چیک لے کر وہ جانے کے لیے مڑا تو دل کو جیسے شعلوں نے گھیر لیا۔ وہ برق رفتاری سے اٹھی۔ اس کے راستے پر محبت کا کشکول لے کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بے نیاز بنا رہا۔

"خدا کے لیے رک جاؤ۔" وہ گڑگڑائی۔ وہ بے نیازی سے مسکرایا۔

"میں نہیں رہ سکتا تمہارے ساتھ۔"

"اور میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر۔" اس نے پھر التجا کی اور اشک رواں نے اس کے سراپے کو دھندلا دیا۔ اس کے اندر کا شیشہ چھنا کے سے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔

"بالکل اپنی ماں کی طرح جذباتی اور مکار ہو۔" کشکول بھرنے لگا۔ وہ بہت کچھ بڑھیا اس تھما کر دے رہے ہیں۔

"اور اپنے باپ کی طرح چالاک شکاری۔ جال میں پھانسنے والی۔"

جملے نے کانوں میں تیزاب پھینکا۔ وہ اندر تک جھلس گئی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! آپ نے تین کروڑ کے چیک پر دستخط کرنے سے پہلے کچھ سوچا ہوتا' کچھ پوچھا ہوتا کہ کس کام کے لیے یہ رقم اسے چاہیے' کیوں لے رہا ہے۔"

بوجھل رات کے بعد بوجھل دن جب اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے باپ نے آتے ہی اضطراب سے اس سے کئی سوال پوچھے۔ اس نے خالی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"رقم بھیجی کس نے تھی؟" خود کلامی پر حسین رضا نے ٹھنڈی سانس لی۔

"دیکھو بیٹا! اسے باندھ کے رکھنے' مجبور کرنے کے طریقے اپناؤ' ترساؤ اسے' ہر چیز کے لیے' مجھے چاہے وہ کچھ نہیں کر سکتا تم سے الگ ہو کر۔ وہ اتنی آسائشات کا عادی ہو چکا ہے کہ اب اپنی اصلی زندگی کی طرف لوٹ کر جانے کی غلطی کبھی کر ہی نہیں سکتا۔"

"وہ اپنی اصلی زندگی کی طرف تو اب لوٹنے سے پہلے تو ترس کر جیا ہے۔ وہ آپ کا بھتیجا ہے بابا! یہ کیوں بھول جاتے ہیں آپ؟"

حسین رضا لاجواب ضرور ہوئے مگر بار نہیں مانی۔

"مگر اس سب کا لنک وہ نہیں' تم ہو بیٹا!"

"قدرت نے اسے میرا صرف شریک سفر ہی نہیں شریک' دولت ملکیت بھی بنا دیا ہے۔" وہ خیال یار کے پہلو سے کھسکنے کو کسی طور راضی نہیں ہوئی۔ حسین رضا نے آنکھیں موند کر اپنے تئیں اس کی عقل کا ماتم کیا۔

"اس نے یہ رقم جوائنٹ اکاؤنٹ سے ذاتی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروائی ہے۔ وہ آپ سے محبت نہیں کرتا۔ صرف آپ کی دولت کو استعمال کرنے کی خاطر یہ بندھن نہیں توڑ رہا۔" انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"محبت حسرت سے نہیں ملتی ہے کی جاتی ہے بابا جان! آپ کی دلیلیں چاہے کتنی ہی وزنی ہوں' مگر میرے دل کے نزدیک بے وزن ہیں۔"

"تم اسے اتنے اختیارات مت دو بیٹا! مل کے معاملات خود دیکھنا شروع کرو۔"

وہ ڈوب گئی سیل روانیوں میں' حسین رضا بھول گئے اپنے دلائل اور بھاری رقم کو۔ صرف اور صرف انہیں اپنی بیٹی اور اس کا درد یاد رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بابا! دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ ہر کام اس سے نکلواؤ' محبت کرنے والے بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اگر وہ تم سے سچی محبت کرتی ہے تو تم اس کی محبت سے فائدہ اٹھاؤ۔" نوی ماہ اسے بنگلہ دیکھتے حمید ماموں خوش ہو رہے تھے۔

"اتنے بڑے خوب صورت گھر میں ہم رہیں گے؟" ہمشعل چاروں طرف دیکھتے حیرت سے بولی۔

"ہاں اس گھر میں ہم سب رہیں گے۔" مختفر نے مسکرا کر ماہم کو دیکھا۔ ماہم کے اندر تک طمانیت سرایت کر گئی۔

"گھر تو لگ ہی نہیں رہا۔ جنت ہے جنت۔"

حمید کی تو جیسے آنکھیں ہی کھل گئی تھیں۔

"بس یار! سالوں تک جہنم کی قید کاٹ کر آئے ہیں۔ اب اللہ نے زمین پر ہی جنت دے دی۔ شکر ہے اس رب جلیل کا۔" ہمشعل کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

"اس قارون کی ملکیت پر ہم عیش کریں گے۔"

حمید کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"ماموں! میں اپنی نفرت کی زمین میں دفنا دوں گا اس قارون کو۔" مختفر کے لہجے میں انتقام کا عزم تھا۔

"یہ کمرا تو میں نے اپنے لیے لیا ہے۔ ہمارا بیڈ روم۔" وہ ماہم کو دیکھ کر مسکرایا۔

ماہم سب کے سامنے خجل ہو گئی۔

"اور آپ لوگوں کو جو کمرا پسند آئے' وہ اپنے لیے سیٹ کر لیں۔"

"میں تو تمہارے کمرے کے ساتھ والے کمرے

میں رہوں گی۔" حمید نے فیصلہ کر دیا۔
"اور اس کے ساتھ والا ہم لے لیں گے۔"
مخمل نے اپنا فیصلہ سنایا۔
"یہ پیسے تو سارے لگ گئے گھر میں۔ شادی کا خرچا؟" حمید ماموں کو پھر فکر لگ گئی۔
"ماموں! کیوں پریشان ہوتے ہیں شادی کی اجازت نامے کے ساتھ خرچے کا چیک بھی سائن کروالوں گی۔" وہ حمید کے گلے میں بازو ڈالے لٹکی ہوئی تھی۔
"اوہو... یہ تو میں بھول گیا کہ ہمارے پاس سونے کی چڑیا ہے۔" وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔
ہاشم کے انگ انگ سے سرشاری عیاں تھی۔
"خوش ہو نا؟" سارا گھر گھومنے کے بعد وہ اس کے مدمقابل آیا۔
"کیا اظہار کی ضرورت باقی ہے؟" اس نے جواب کے بدلے سوال داغا۔
"نہیں... تم سراپا اظہار ہو۔" وہ مسکرایا۔
"اور آپ سراپا محبت۔" ہاشم نے کہا۔
اس کے چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔
"تم سراپا محبت ہو مخمل!" حیا کی کھنکھناہٹ اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔
اس نے سر جھٹک کر سماعت کو بھٹکایا۔

☆☆☆

بعض دفعہ انسان کو اپنے عمل کا حساب اولاد کے عمل میں دینا پڑتا ہے۔ حیا کی محبت نے حمیرا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کتنے دنوں تک وہ کھل کر بچی سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ نہ ہی حیا پہلے کی طرح ان کے پاس آ کر بیٹھتی مشورے کرتی۔ اس کا رویہ بہت خراب تھا۔ ان تک جیسے پہنچ آتی تھیں مگر ابھی جا تی تو ماں کو دیکھنا بات کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا تی رہتیں۔
زندگی میں پہلی بار انہیں احساس ہوا اپنے جنون، غلطیوں کا، وہ اس وقت حیا کی حالت سے پریشان کسی کل چین نہ تھا۔ اگر حیا رنجیدہ تھی تو خوش وہ بھی نہ

تھیں۔ اس کو اس حالت سے ہر حال میں نکالنا چاہتی تھیں۔ سوا پنی پوری ہمت مجتمع کر کے سی کے ساتھ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔
وہ بہت نفیس طبیعت کی مالک' اپنے کمرے کو صاف ستھرا رکھنے والی حیا یوں خود سے بے خبر ہو گئی تھی۔ کمرا سارا الٹ پلٹ تھا۔
یہ سوٹ اس نے پانچ دن سے پہنا ہوا تھا۔ اس دیوانی جنونی سے بچی کی دیوانگی دیکھی نہ جاتی۔
"حیا!" ان کی زبان سے صرف یہ تین حرفی لفظ ادا نہ ہوا تھا۔ بلکہ ممتا کی پوری تڑپ اور محبت تھی اس پکار میں۔
بیڈ پر لیٹی حیا نے کروٹ بدل کر ماں کو دیکھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔
"بیٹا! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"
"جیسا آپ نے تو بہتر کیا ہے۔"
وہ حیا کے لہجے میں چھپے طنز کو نگل گئیں۔
"مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔" آواز روہانسی تھی۔ "خود کو سنبھالو بیٹا۔"
"آپ سنبھل پائی تھیں؟"
ان کے پورے جسم میں جیسے لرزش ہوئی تھی بمشکل تھوک نگلا۔
"جو غلطیاں ہم سے ہوئیں تم تو ان غلطیوں کو نہ دہراؤ۔ ہم سے تمہارا دکھ ہوتا نہیں دیکھا نہیں جاتا۔"
"آپ کی وجہ سے کتنے لوگ دکھی ہوئے ہیں۔ کبھی آپ نے یہ سوچا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آپ نے کبھی کسی کا خیال رکھا؟ رکھا تو صرف اپنے دل کا۔" وہ تاک تاک کر تیر چلا رہی تھی۔
"تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو بیٹا! مجھے یوں تو زخمی مت کرو۔"
"پتا چل رہا ہے نا زخم کتنا دردیتے ہیں۔ آپ نے کتنے ہی لوگ ہیں کہ زخمی ہوئے۔ آپ نے تو صرف زخمی کرنا سیکھا ہے مرہم نہیں۔"
اس کے لہجے کی تپش پر وہ موم کی مانند پگھل رہی

تھیں۔ ان کی لاڈلی بیٹی حقیقت کی چٹان بن کر استادہ تھی۔

☼ ☼ ☼

بقول شاعرہ سر پر خیال یار کی چادر تان کر بیٹھی تھی۔ جب ملازمہ نے اسے وکیل کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آئی۔

"السلام علیکم! بیٹا کیسی ہیں آپ؟" بیرسٹر وقار احمد نے کھڑے ہو کر اپنائیت سے پوچھا۔

"وعلیکم السلام انکل! الحمد اللہ! آپ کیسے ہیں۔" اس نے بڑی مشکل سے دنیاداری نبھائی۔

"اللہ کا شکر۔" وقار صاحب نے عاجزی سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے توقف کیا۔ ٹھنڈی سانس لی۔

"آپ کے لیے ایک بری خبر ہے بیٹا! آپ کو سناتے ہوئے بھی ڈر رہا ہوں۔"

"فکر نہ کریں انکل! میں اب بری خبروں کی عادی ہو چکی ہوں۔"

ملازمہ نے چائے لوازمات کے ساتھ لا کر آگے رکھی۔

"یہ فائل آپ خود پڑھ لیں۔" انہوں نے ٹیبل پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے فائل اٹھا کر اس میں ٹائپ کی ہوئی تحریر پڑھی۔

خیال یار کی چادر سر سے سرک گئی۔

سیاہ ہجر زدہ لباس میں وہ درد کے درمیان گر گئی۔

گویا کہ گل ہوئی محبت کا چراغ بجھ رہا تھا۔ ہجر کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

"مجھے پتا تھا بیٹا! آپ کو شدید صدمہ پہنچے گا۔" اس کا متغیر چہرہ دیکھ کر بیرسٹر وقار خود پریشان ہو گئے۔

وہ موہوم سی تھی 'بالکل بے جان۔

حمیرا اندر داخل ہوئیں۔ اس کے خاموش وجود کو دیکھا۔ بہتے آنسوؤں پر تڑپ کر فائل اس کے ہاتھ سے لی اور زور سے دیوار پر دے ماری۔

"بھاڑ میں جائے منحوس انسان۔ نالی کا کیڑا 'میری بچی کے لائق ہی نہیں تھا۔ ایک چھوڑ دس شادیاں کر لے۔ ہماری بلا سے۔ ہماری جوتی کو بھی پروا نہیں ہے۔" وہ اور غبار نکالتیں اگر وقار صاحب اسے حیا کے بے ہوش وجود کا احساس نہ دلاتے۔

"میری بچی حیا۔ حیا!" تڑپ کر حیا کو بازو میں بھرا۔ حیا کا سر ان کے کاندھے پر گر گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ حیا کو سکون آور ٹیبلٹ دے کر وہ بڑے کمرے میں آئی تھیں۔

"حیا کی یہ حالت۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کیسے خوشیاں خریدوں اس کے لیے۔" حسین رضا بے بس تھے۔

"اس نے شادی کی اجازت مانگی ہے۔ اسے جواباً" طلاق کا مطالبہ بھجوا دو۔"

"اور اگر اس نے طلاق دے دی تو؟" حسین رضا نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"تو اچھا ہے۔ جان چھوٹ جائے گی خبیث سے۔"

"ہاں جان تو چھوٹ جائے گی مگر کیا حیا مانے گی؟"

"وہ بچی ہے حسین رضا! ہم اس کی پھر کسی اچھی جگہ شادی کر دیں گے۔" اپنی دانست انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

"وہ خوش رہ سکے گی۔ تمہاری بچی ہے؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی حسین رضا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"تم اور تمہاری بچی مجھے طعنے ہی دیتے رہنا ——"

وہ غصے سے چیخیں۔

حسین رضا نے خاموشی سے سگار جلا لیا۔ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

حمیرا نے مزید بحث سے گریز کیا۔ وہ چیخنے چلانے لگتیں۔ وہ دنیا کے لیے کیسی بھی ہوں 'بہرحال ان کو اور حیا کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔

کتنی ہی دیر بعد حمیرا کو اپنے لہجے کی تلخی کا احساس

ہوا۔

"سنو! میری بات مانو تو یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔ اسے لارنج دو اور کہو خود ہی حیا کو طلاق دے دے۔ ہمارا اہم لیے بغیر۔"

"حیا جیتے جی مر جائے گی۔" حسین رضا نے جیسے خود کلامی کی۔

"وہ اب بھی تو پل پل مر رہی ہے۔ صدمہ ضرور ہوگا مگر ان شاء اللہ سنبھل جائے گی۔ ہاں کچھ وقت ضرور لگے گا۔"

ان کے پرسوچ انداز نے حیدر کی ہمت بڑھائی۔

"تم بات تو کر کے دیکھو اس سے۔"

✲ ✲ ✲

"بیرسٹر صاحب! آپ نے اجازت نامہ نہیں بھیجا۔ میں سارا دن انتظار ہی کرتا رہا۔" رات دس بجے اس نے فون کر ہی ڈالا۔

"اجازت نامے پر سائن ہوتے تو بھیجتا نا۔" بیرسٹر صاحب نے بے دلی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ کیا حیا نے سائن کرنے سے انکار کر دیا؟"

"وہ ہوش میں ہوتی تو انکار کرتیں نا۔"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں بیرسٹر صاحب۔"

"وہ تو اجازت نامہ دیکھ کر ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ پھر مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔ انہوں نے گلی سے کہہ کر سیال تک کر دیا۔"

اس نے پھر کال کی 'نمبر بند' کا جواب موصول ہو رہا تھا۔

اسے صدمہ ہوگا یہ اندازہ تھا مگر اتنا شدید ہوگا یہ بہانہ تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں سکوت تھا۔ تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔ وہاں سب بیٹھے تھے۔ ان کو اطلاع دی۔

"لو بھئی برخوردار! اب دعا کرو وہ زندہ بچ جائے ورنہ حسین رضا ہمارے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔"

حمید ماموں کے لہجے پر انداز پر اسے حیرت نہیں ہوئی سو وہ ان کی فطرت سے واقف تھا۔

"ہاں دعا تو کرنی ہی پڑے گی ورنہ صرف جان کے لالے ہی نہیں پڑیں گے۔ خالی ہاتھ بھی رہ جائیں گے۔" بھتیجی کی فکر انگیز آواز ابھری۔

ماہم نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کے تاثرات سے وہ اس کے دل کا حال نہ جان پائی۔

اپنے مستقبل کی فکروں نے اسے آن گھیرا تھا۔ یہ بنگلہ لینے آرائش کرنے کے بعد صرف چند لاکھ ہی باقی بچے تھے۔

✲ ✲ ✲

بیرسٹر صاحب کی طرف سے نوٹس آیا تھا۔ وہ حیا کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کتنی ہی دیر تک اسے یقین ہی نہ آیا۔ وہ بار بار نوٹس کو پڑھتا۔ یہ حیا نے بھیجا ہے؟ حیا میرے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔ نہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے آخر اس کی محبت پر اتنا گہرا یقین کیوں تھا۔ اپنے اندر کی اس پکار کو جذبے کو سمجھنے کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

کتنی ہی دیر تک وہ غصے سے ٹہلتا رہا۔

ماہم نے اسے یوں دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ اس نے لفافہ اٹھا کر ماہم کو دیا۔

وہ اب پہلے والی زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ جیسے جیسے زندگی کی آسائشات و سہولیات زندگی میں آتی جاتی ہیں۔ وہ غربت کو پچھلی مشکل زندگی کو بھول بیٹھتا ہے۔ وہ بھی بھول گیا۔ زندگی کس مشکل سے کاٹی تھی۔

ماہم کو بھی اپنے خواب چکنا چور ہوتے محسوس ہوئے۔

"مانا کہ میں قانونی طور پر پابند ہوں مگر یہ میرا حق ہے میں کسی بھی طرح اپنے حق کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"آپ نے حیا سے بات کر کے دیکھی ہے۔"

حیا ان کی رقیب تھی۔ وہ دشمن مگر وہ اندر ہی اندر اس سے اتنا مرعوب تھے کہ انصاف کے لیے پھر حیا ہی کو

پکارنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ وہ حیا کی اچھائی سے متاثر تھے' تم مانتے نہیں تھے۔

اس نے سیل اٹھایا۔ حیا کا نمبر ملایا۔ حیا کا دل خوش گمانی سے دھڑکا' شاید اسے احساس ہو گیا ہے۔ میری مزاج پرسی کے لیے فون کیا ہے۔

وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ مزاج پرسی نہیں' محبت کے پرسے کے لیے کال آئی ہے۔ اس نے بکھرے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"کیسے ہو منتظر' مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم نے مجھے فون کیا ہے۔" اس کے لہجے سے خوشی عیاں تھی۔

"تمہارے بغیر بہت اچھا ہوں اور بہت خوش اور یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا کہ تم نے مجھے نوٹس بھیجا ہے۔ جو محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتی تھیں۔"

"کون سا نوٹس؟"

"میرا خیال تھا صدمے سے تم مر جاؤ گی۔ مگر نہیں تم کیوں مروگی' ہو نا حمیرا کی بیٹی۔ بلکہ مجھے پریشرائز کررہی ہو کہ میں دل کے اپنے غلطی پر شرمندہ ہو کر حق سے دست بردار ہو جاؤں۔ میں اپنا حق کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ کان کھول کے سن لو۔ تم تمہارا باپ اور تمہاری ڈائن ماں!"

وہ سانس لیے بغیر بولتا رہا۔ حیا اسے پکارتی رہی۔ "میری بات تو سنو" مگر وہ سننے کے نہیں سنانے کے موڈ میں تھا۔

"تم ۔۔۔ تم مجھے کیا نوٹس بھیجو گی۔ میں بھیجوں گا اب تمہیں طلاق نامہ۔ پھر چھین کے دکھانا تم مجھ سے میرا حصہ۔ میرے باپ کی جائیداد' میرا حق۔" وہ طیش سے مسلسل بولتا رہا۔

اس کی سماعتوں میں پگھلا سیسہ انڈیل کر وہ سانس لینے کو رکا۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ خدا کے لیے مجھ سے اپنا نام مت چھیننا' تم میرے نہیں ہو سکتے تو اپنا نام تو میرے ساتھ رہنے دو۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے' نہ میں نے تمہیں کوئی نوٹس بھیجا ہے۔"

وہ رو رو کر تڑپ کر گڑگڑا رہی تھی۔

منتظر حسین کے کلیجے پر ٹھنڈ پڑ گئی۔

وہ اب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے نام سے بھی اسے محبت ہے۔ وہ اپنا ہر کام با آسانی اس سے نکلوا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیل فون بجا' اسکرین پر حسین رضا کا نام دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کوندی۔ وہ اب ان سے بات کر سکتا تھا۔ ترپ کا پتا اس کے پاس تھا۔ کھیل جیتنے کی امید وہ اتنی آسانی سے نہیں ہار سکتا۔ سازی اسی کی تھی۔ تب تک حیا کی اس سے محبت برقرار تھی۔

"جی فرمائیے۔" مسٹر حسین رضا۔" طنزیہ لہجہ۔

"تمہیں ہمارا قانونی چارہ جوئی کا نوٹس تو مل ہی گیا ہوگا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"آپ کا خیال ہے میں اس کاغذ کے ٹکڑے سے متاثر ہو جاؤں گا۔"

"یہ محض کاغذ کا ٹکڑا نہیں منتظر حسین! تمہیں امیر سے فقیر' محل سے جھونپڑے تک لانے والا نسخہ کیمیا ہے۔" حسین رضا نے متحمل لہجے میں کہا۔

"آپ کے اس نسخہ کیمیا سے مٹی ہی نکلے گی۔ سونا نہیں حسین رضا!"

اس کے مضبوط لہجے پر وہ تھوڑا گڑبڑائے۔ مگر کامیاب بزنس مین تھے۔ فوراً" سنبھلے۔" ہاں سونا بھی نکل سکتا ہے تمہارے لیے۔ اگر تم مجھ سے ایک معاہدہ کرلو' ڈیل' تو مل' تمہیں پوری تمہارے نام کروں گا۔" حسین رضا نے دانہ ڈالا۔

وہ فوراً" مستعد ہوا۔ "کیا مطلب؟"

"دیکھو بہت آسان بات ہے' یا تو پرانی رنجشوں کو بھلا کر حیا کے ساتھ اچھی خوش حال زندگی گزار دو۔"

"ناممکن۔" وہ پرزور انداز میں انکاری ہوا۔ "وہ میرے سامنے آتی ہے تو مجھے اپنے مظلوم ماں' باپ یاد آجاتے ہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"تو پھر دو سرا راستہ ہے۔ تم اسے طلاق دے دو۔ صرف اتنی احتیاط کرنی ہو گی کہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ

ہم نے کہا ہے۔ میں دل تمہارے نام کروں گی۔"

"قطعاً" نہیں۔ آپ کی بیٹی میرے انتقام کی تسکین ہے۔ میں اسے کسی حال میں آزاد نہیں کروں گا۔ وہ میرے پاس آپ کے جرائم کی قیدی اور آپ کے گناہوں کی سزا کے طور پر رہے گی۔" اس نے کال کٹ دی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

وہ سونے کی چڑیا ابھی اس کے ہاتھوں سے نہیں اڑی تھی۔ اس کی محبت کے پنجرے میں قید تھی۔

☼ ☼ ☼

ورق ورق پہ تیری عبارت' تیرا فسانہ تیری حکایت
کتب ہستی جہاں سے کھولی تیری ہی یادوں کا باب نکلا

پورے تین ماہ ہوگئے اسے اک نظر دیکھے ہوئے۔ ان تین ماہ میں سیکڑوں بار وہ اسے "آئی مس یو" کے میسجز کرچکی تھی۔ کتنی بار دل مضطرب کے اضطراب سے گھبرا کر اسے کال کی مگر وہ ریسیو ہی نہیں کرتا۔

نئے نمبروں سے کال کرتی تو اس کی آواز سن کر موبائل آف کر دیتا۔

وہ مجلس گئی تھی اس کے عشق میں افسردہ تھی' پل پل اک بار دیکھنے کو تڑپ رہی تھی۔ وہ بہت سادہ لڑکی تھی' کبھی کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ اس کی طرف ہوئی تو ٹوٹ کر ہوئی۔ وہ اس کا دوست بھی تھا۔ دلدار بھی' پیار بھی' سرتاج بھی' اس کی ذات پرت در پرت اس سے منسوب' اس کی خوشبو سے معطر' اس کے احساسات کی دلفریبی' وابستگی' دلکشی صرف اسی سے وابستہ' اس کے وجود کے ہر کونے سے وہ لگتا' ہر گوشے میں وہ موجود۔

وہ کیسے رہ پائے گی اس کے بغیر' اس کے بغیر رہنے کا سوچتی تو سانس رکنے لگتی۔ کئی کئی لمحے کے لیے روٹھ جاتی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی' زندگی کو منانے لگتی۔ اس کی آس والی' اس کو یاد کرتی' اسے کسی سے یوں اتنی اور ایسی شدید محبت ہوگی۔ یہ بات شاید کبھی اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی۔

ٹوٹ کر چاہنے میں وہ کس کس طرح سے نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ ذات کے ٹکڑے یکجا کرتی' پھر اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی' طعنوں' بے اعتنائی سے ریزہ ریزہ ہوتی۔ ریزے نہیں جڑتے۔ مگر وہ جوڑ لیتی۔ پھر ٹوٹنے بکھرنے کے لیے۔

وہ کیسے یار مناتی' محبوب کو راضی کرتی' راضی کرنے کا ہر جتن بے وزن' ہر منت بے توجہ' محبت جو ان کے وجودوں میں داخل کر ذات کا حصہ تھی۔ وہ اس کی ذات کا تو حصہ رہی' مگر غضنفر کے وجود سے ایسے ڈھل گئی کہ کوئی نشان' شائبہ' دھبہ تک نہ رہا۔

وہ سراپا انتقام بن گیا۔ اس کی رگوں میں محبت کے بجائے انتقام دوڑتا' مگر پھر بھی محبوب تھا۔ تب ہجر کا بار اٹھانا۔ اک بار پھر پیرسٹر صاحب آئے تھے۔

"آپ جو کہیں وہ خود آجائیں گی کاغذات لے کر میں سائن کروں گی۔" اس نے ہتھیار پھینک دیے۔

وصل محبوب کی رضا سے ہوتا ہے' زبردستی نہیں حاصل کیا جاسکتا۔

اس نے شہادت کی انگلی کی پشت سے آنکھ سے بہنے والا آنسو پونچھا جو ہزار ضبط کے باوجود بند توڑ بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کیا کہہ رہی ہو بیٹا! اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے آپ کا فیصلہ۔" حسین رضا کی ناشتے کی ٹیبل پر اسے دیکھنے کی خوشی اس کا فیصلہ سن کر رنج میں ڈھل گئی۔

"تم نے اجازت نامہ اور چیک سائن کرنے کے لیے اسے بلوا بھیجا ہے؟" تیرا نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

وہ خاموش تھی۔ اس کے پاس ان کی باتوں کا کوئی بھی جواب نہ تھا۔

"اس کا رویہ' اس کا انتقام کچھ بھی نظر نہیں آرہا

نہیں۔ اگر تمہاری روش یہی رہی تو سب کچھ کھو دو گی۔" حمیرا مسلسل بول رہی تھیں۔

"سب کچھ ہی تو کھو چکی ہوں۔" ناشتا زہر ہو گیا۔ آنسوؤں نے گلا بند کر دیا۔

"بیٹا! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ آپ کو مار رہا ہے۔ جلا رہا ہے۔ آپ کی اتنی محبت، توجہ کے باوجود وہ آپ کے قابل ہی نہیں۔" حسین رضا نے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی۔

اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جم گئیں۔

"تم بے وقوف ہو، جو اس کو یوں چیک پر چیک سائن کیے دے رہی ہو۔" حمیرا کو اور طیش آیا۔

"میری عقل، میرا ضمیر یہی کہتا ہے، یہ اس کا حق ہے۔ اس کی ملکیت ہے۔ میں اسے روکنے کی بے وقوفی نہیں کر سکتی۔ مجھے پتا ہے بابا! اپنی ذلت کی نفی کر کے حق پر چلنا کانٹوں کا سفر ہے۔ انتقام لینا تو بہت آسان ہے۔ بپھرے سمندری طوفان کی مانند سب کچھ تہس نہس کرنا، ایثار کے رستے پر چلنا مشکل ہے۔ پھولوں کی پتیوں کی طرح ہر جگہ پہنچنا، ہموار رستوں کے ساتھ کھائیوں، خندقوں سب ہی کو سیراب کرنا بہت مشکل ہے بابا! بہت مشکل۔"

وہ پور پور بھیگی آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

حسین رضا برداشت نہ کر سکے۔ اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

حمیرا کو چپ لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

شفق آلود شام کے نیلے افق پر سرمئی بادل یوں آن بان سے رکتے تھے۔ عقب میں اٹھ آئے ہوئے سرمئی مائل رنگت سے بکھرے بادل ٹولیوں کی صورت عجب چھب دکھاتے رہے۔

وہ یادِ یار کا کونا پکڑے اس شام کے نظارے میں منہمک رہی۔ آہستہ آہستہ سورج نے رات کا کونا پکڑ لیا اور بادل اس کے ہجر میں سرمئی سے ہلکے سیاہی مائل ہوتے چلے گئے۔ اک نمرے نے افق پر نمودار ہو کر بغور اس کو دیکھا۔

وہ پھولوں کی طرح اس کی یاد میں بکھرتی، ٹکڑے ٹکڑے ہوتی رہی۔ اس کا وجود، اس کی آواز کچھ بھی تو نہ تھا۔ بس دل کے اندر یاد تھی۔ بے ساختہ ہی اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

وہ سیدھا چلتا ہوا لان میں کھڑی حیا کے مدمقابل آیا۔ اس نے لمبی سانس کھینچ کر آنکھیں کھولیں۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر اس کی سانس ساکن ہوئی۔ آنکھ جھپکنے سے انکاری، کہیں خوب صورت سپنا بھیانک خواب نہ بن جائے۔

"کیوں آیا ہے؟" چبھتا لہجہ۔

"یہ پوچھنے آیا ہوں۔" ہولے سے اس کے لب ہلے۔

"تمہیں فرق پڑتا ہے؟" اس کی آنکھوں کی بیگانگی نے لہجے کو بھی سرد کر دیا۔

"یہی تو فرق ہے۔ غضنفر حسین! یہی تو فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ تمہیں سب کچھ نظر آتا ہے۔ مجھے صرف تم، تمہاری نظر ہر کسی وا کس سے نہیں ملتی، میری تم سے۔" اس کے لہجے میں صدیوں کی پیاس سمٹ آئی۔

وہ اس کی نظروں سے پگھلنے لگا، مگر اچانک موم سے سیسہ بن گیا۔

"تم میں اور مجھ میں اور بھی بہت سے فرق ہیں۔"

وہ طنزیہ انداز میں اپنا اور اس کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔

بس اس نے اس کے دل کو ہی نہیں دیکھا۔ سب سے زیادہ خوب صورت، منفرد، محبت کرنے والا، چاہت رکھنے والا دل۔ ایسا دل ہر ایک کو تو ودیعت نہیں ہوتا۔

اس کی آنکھوں میں برسات امڈ آئی۔

"تم اگر محبت کرتی ہو تو کرتی رہو۔" بے نیاز لہجہ۔ "مگر میری طلب سے باز آجاؤ۔ میں روز روز تمہاری خواہش پر نہیں آسکتا۔" دھمکی آمیز لہجہ۔

"طلب ختم تو قصۂ زندگی ختم غضنفر حسین! طلب ہی تو زندہ رکھتی ہے۔ طلب کے بغیر کچھ نہیں۔ طلب مفاد نہیں بلکہ ہر مفاد سے بچاتی ہے۔ طلب تو ہر خلق کا زیور ہے۔ مجازی ہو یا حقیقی۔ طلب ہی تو پہاڑوں

سے نہر کھدوائے، بے آب و گیاہ صحراؤں میں دربدر پھرائے، طلب کے بغیر تو خدا بھی نہیں ملتا۔ طلب میں کتنے لوگوں نے عمریں مٹی میں رول دیں۔ یہ میرے اختیار سے باہر کا معاملہ ہے منتظر حسینین۔

وہ آگے گلا رندھ جانے کی وجہ سے ایک لفظ بھی نہ بول پائی۔

"تم اپنا یہ بے کار کا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے بھول کر بھی توقع نہ رکھنا میں قاصر ہوں، تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کرنے سے۔" وہ اس کے مدمقابل آکے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے رحمی سے غرایا۔

آنسوؤں کے ریلے میں اس کا عکس دھندلا گیا۔

اس نے فائل کھول کر اس کے سامنے رکھی۔ دوسرے ہاتھ سے جیب سے پین نکال کر اسے تھمایا۔

اس نے مرے ہوتے وجود سے جدائی کے پروانے پر خاموشی سے سائن کردیے۔ سارے ہتھیار پھینک کر ہار مان لی۔ سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

اس نے چیک آگے کردیا۔

حیا نے خاموشی سے سائن کردیا۔

وہ فاتح اسی بے نیازی سے مڑا اور چلا گیا جب مفتوح وہیں بیٹھی رہ گئی۔

* * *

وہ خوش تھی۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے۔ اس کو اپنے خوابوں کا شہزادہ مل رہا تھا۔ سپنے یوں بھی تعبیر پاتے ہیں۔ دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں۔

ماہم بار بار اللہ کا شکر ادا کرتی کہ اللہ نے اسے من پسند ہمسفر عطا کیا ہے۔ اللہ نے کتنا خوب صورت نعم البدل دیا تھا۔ اس کی منگنی خالہ زاد سے ٹوٹی تو سالوں تک غم منایا دل نے بھی اور دماغ نے بھی۔

جس رات یہ قیامت خیز خبر ان تک پہنچی، وہ ساری رات اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔ اس نے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی۔ اپنی کم مائیگی غربت کا احساس اسے مارے دیتا تھا۔ حیا اپنے والدین کے گناہوں میں گھر گئی اور

منتظر حسینین اس کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ جستجو نے اسے منتظر تک پہنچایا۔ نصیب نے منتظر سے ملا دیا۔

اس نے جی بھر کر منتظر کے ساتھ شاپنگ کی۔ مشہور ڈیزائنر سے کپڑے بنوائے۔ جیولری خریدی۔ صورت تو اللہ نے اچھی دی تھی۔ زیب و زینت نے حسین تر بنا دیا۔

* * *

اس تقریب میں منتظر نے اپنی ساری ایلیٹ کلاس کو مدعو کیا۔

چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں یہی تو وہ چاہتا تھا کہ لوگ ان پر تبصرے کریں۔ حسینین درانی کا بھتیجا تھا پھر ایسا کیا ہوا۔ ماضی کی بھولی داستان زد عام بن چکی تھی۔ وہ ان کی کسی کو کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

"ہمارا جوڑی۔" جو بھی دیکھتا کہے بنا نہ رہ پاتا۔ وہ خوب صورت تو تھی مگر عمدہ لباس، جیولری اور میک اپ نے اس کے حسن کو چار چاند لگادیے تھے۔

اسے پتا تھا، آج اس کے دشمنوں کے سینوں پر سانپ لوٹتے ہوں گے۔ اس نے انویٹیشن کارڈ حیا کو بھی بھیجا تھا، اور میرین کو بھی۔ اسے ایک بار بھی حیا کا خیال نہیں آیا تھا۔ نہ اس کی محبت نہ شکایت نہ مہربانی، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس بہت سارے پتے تھے۔ مگر وہ تو تب کارگر ہوتے جب وہ کھیلنے کو تیار ہوتی۔ اس نے تو کھیلنے سے پہلے ہی ہار مان لی تھی۔ سارے پتے پھینک دیے تھے۔

وہ جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا، اٹھا رہا تھا۔ اس کی محبت و نرمی سے بیس کروڑ کا بھاری چیک لکھوا لیا تھا۔ مبادا وہ بعد میں سوتن کے جلاپے، حسد میں سائن نہ کرے، اور اگر وہ سائن نہ کرتی تو وہ ایک روپیہ بھی نہیں نکلوا سکتا تھا۔

وہ چاہتی تو کئی قانونی رکاوٹیں ڈال کر مل کو تالے لگوا دیتی مگر ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ماہم کے ساتھ سنگت میں حیا اس کو بھول کر بھی یاد نہ آئی۔

اتنی خوب صورت شریک حیات پاکر یا انتقام کی آخری اسٹیج پر پہنچ کر اپنی کیفیات کو وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

✿ ✿ ✿

دعوت نامہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تو حیا حسین... آج اس نے اپنی زندگی سے تمہیں مکمل طور پر نکال دیا۔" اک بار پھر اسے رونے کا دورہ پڑا۔

وہ سارا دن بچھڑے یار کے ہجر کا ماتم کرتی رہی نہ کھانا نہ پینا کچھ بھی تو یاد نہ تھا اسے۔

دل کی کیفیت عجیب ہو گئی تھی۔ کبھی تیز تیز دھڑکنے لگتا اتنا تیز کہ اس دھڑکن کی پکار ناقابل برداشت ہو جاتی۔ اور کبھی اتنا مدھم ہو جاتا کہ دھڑکنیں محبوب کی طرح گم ہونے لگتیں وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

مہرین اس کا غم بانٹنے آئی تو اسے بہت برے حالات میں پایا۔

"کیوں غم منا رہی ہو اس احسان فراموش کا جس نے تمہیں سوائے دکھ کے کچھ بھی نہ دیا۔"

اس نے حیا کو بازو سے اپنے قریب کیا۔ اس کا سر اپنے شانے پر رکھ کر تھپکنے لگی۔ وہ بلند آواز میں رو کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مہرین! اسے صرف لینا آتا ہے' دینا نہیں۔ وہ سمجھتا ہے' محبت کے قابل صرف وہ ہے' نیک' پاک' پارسا' اچھا انسان بھی خود کو ہی سمجھتا ہے۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"مگر اس میں قصور اس کا نہیں میری محبت کا ہے' جس نے اس کو آسمان پر بٹھا دیا۔ کہ وہ جھک کر زمین کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔"

"اس لیے حیا کہ وہ خود غرض ہے۔ محسن کش ہے جس نے اسے محبت کے ذائقے سے آشنا کر دیا۔ دھتکارتا ہے اسے جس نے ہر طبقاتی فرق کو مٹا کر اسے اپنایا۔" مہرین کے لہجے میں دکھ' تاسف' غصہ کیا کچھ نہ تھا۔

"تو وہ مجھے میرے نا کردہ گناہوں کی سزا دیتے ایک بار بھی نہیں سوچتا کہ میں نے اس کی پرستش کی ہے۔ چاہا ہے محبت کی آخری حدوں تک۔" اپنے وجود کو مٹا کر۔"

خاموش آنسو اس کے لفظ لفظ کا پیچھا کرتے رہے۔ "مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ تم سے محبت کرتا ہو۔"

"نہیں مہرین! اسے صرف وقتی لگاؤ پیدا ہوا تھا۔ میری بے تحاشا محبت' بے انتہا توجہ' بے انتہا آسائشات دیکھ کر وہ محبت کے جذبے سے نا آشنا تھا نا آشنا ہے۔"

لفظ ختم ہو گئے تھے۔

جب کسی انسان کے اندر لالچ' حسد آ جاتا ہے تو انسان سے محبت کھسکنے لگتی ہے۔ غرض کی پٹی آنکھوں پہ بندھ جاتی ہے۔

✿ ✿ ✿

"میں نے آپ کے لیے شاہی کباب بنائے ہیں۔ حمید ماموں بتا رہے تھے۔ آپ کو بے حد پسند ہیں۔"

آفس سے لنچ ٹائم پر گھر آیا تو ماہم نے خوش ہو کر بتایا تھا۔

کھانا کھانا اس کے لیے مشکل ہو گیا' اسے حیا کا خیال آیا' وہ اکثر اس کے لیے بناتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے نوالے گلے میں اٹک گیا۔

"آئندہ میرے لیے مت بنانا۔" اس نے پلیٹ اپنے آگے سے ہٹائی۔

"ارے کیوں بیٹا! اچھے نہیں بنے کیا۔" خورشید گھبرائیں۔

"نہیں خالہ! مجھے شاہی کباب سے اس ذائن کی بھی یاد آ گئی جتنی بار اس نے بنا کر کھلائے ہیں کہ اب لگتا ہے۔ ہر جگہ اس نے ہی بنائے ہوں گے میں ان لوگوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا' ان کی ہر یاد' ہر بات بھلا دینا چاہتا ہوں۔"

"اوہ اچھا' آئندہ میں آپ کے لیے نہیں بناؤں

کہا۔" ماہم نے جلدی سے پلیٹ اس کے سامنے سے ہٹالی۔

"اچھا یہ مچھلی کھاؤ۔ بہت مزے کی بنی ہے۔" حمید ماموں نے فوراً مچھلی اس کے آگے رکھتے ہوئے دل جوئی کی۔

ماہم نے سوچا وہ اب کبھی شامی کباب نہیں بنائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی حیا بھول کر بھی اسے یاد آئے۔

❁ ❁ ❁

"وہ سانپ ہمیں ڈس رہا ہے' ہماری دولت پر عیش کرکے ہمارے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ اور تم حسین رضا! خاموش بیٹھے ہو کوئی کارروائی نہیں کررہے اس کے خلاف۔"

"ہمارے پر کٹ گئے ہیں حمیرا! یہ تم بھول رہی ہو۔"

"تمہیں اس سے ہمدردی ہے' بھائی کا بیٹا ہے۔ ناباپ بیٹی نے سر پر چڑھا دیا۔ وہ چپکے چپکے سب کا نقصان کرتے ہوئے رہ رہا ہے۔ تم سے اتنا نہیں ہوا کہ بینک منیجر سے کہو کہ اتنے بڑے چیک پر دستخط نہ کرے۔ آخر تم دونوں کو ہو کیا گیا ہے؟" وہ جھنجلا رہی تھیں۔

"کیا کروں ہم بھی۔" حسین رضا نے اخبار ٹیبل کے کونے پر پٹخا۔

"تمہارے پاس کوئی چال نہیں۔ کوئی کارڈ نہیں۔ تم اتنے بڑے گیم لوزر ہو سکتے ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ طنز پہ طنز کررہی تھیں۔

"ہم ہار گئے ہیں' یہ تم تسلیم کیوں نہیں کر رہیں۔" انہوں نے سگار کا کش لگایا' تھکے تھکے انداز میں چیئر کی بیک سے ٹیک لگالی۔

"تمہارے جیسا کھلاڑی جو زندگی میں کبھی نہیں ہارا' سب کچھ حاصل کرلیا۔" وہ تلخی میں سر ہلاتی رہیں۔ "یقین نہیں آتا مجھے بالکل بھی یقین نہیں آرہا۔" وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ آبیٹھیں۔

وہ تلخی سے مسکرائے۔

"یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔" انہوں نے خود کلامی کی۔ "میں اتنا مجبور ہو سکتا ہوں؟ ہمارا ضمیر ہمیں لے ڈوبا۔" ان کے لہجے میں تھکن ہی تھکن تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو' میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ مضطرب ہو کر ٹہلنے لگیں۔

"حسین رضا! مجھ سے یہ ہار' یہ دکھ برداشت نہیں ہورہا' دل کررہا ہے' قتل کردوں اسے۔" انہوں نے مٹھیاں بھینچیں۔

"اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے ماردوں' اپنی نسل ختم کردوں' باپ دادا کی پیڑھی ناس کردوں' گناہ پر گناہ' جرم پر جرم' یہ نہیں ہوگا اب مجھ سے حمیرا بیگم! دنیا ٹھیک کہتی ہے' شکر کرو کہ خدا نے ہمیں وہ بیٹی دی ہے جو ہماری غلطیوں کا کفارہ دے رہی ہے' ہمیں غلط فیصلوں سے بچا رہی ہے' اب توبہ کا وقت ہے' تم بھی توبہ کرلو تو بہتر ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

باتیں ان کے دل کو بھی لگ رہی تھیں' وہ خاموش رہ گئیں۔

"تم کہاں جارہے ہیں؟"

"وضو کرنے' دو رکعت نفل توبہ ادا کرنا ہے۔"

حمیرا نے سر جھکالیا۔

❁ ❁ ❁

وہ اٹھتا تو گڈ مارننگ کا میسج ملتا' سوتا تو گڈ نائٹ کا' اور پہروں میں چھوٹے چھوٹے محبت بھرے جملے' اشعار آتے رہتے۔ یہ حیا کا معمول تھا۔

اور اب وہ اتنا عادی ہوچکا تھا کہ لاشعوری طور پر منتظر رہتا۔ وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ کس جذبے سے مجبور ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے میسجز پڑھتا تھا۔ البتہ جواب کبھی نہیں دیا تھا۔

ماہم کو اس کے یہ میسجز کھٹکتے' اس نے چپکے سے منتظر کا سیل اٹھایا اور جواب ٹائپ کرنے لگی۔

"آخر تم میسجز کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں' تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ میرا اب تم سے کوئی

تعلق نہیں ہے۔ میں تمہیں یاد نہیں کرنا چاہتا' مجھے اپنے ماں باپ کی اذیتیں یاد آتی ہیں' میں تم سے نفرت کرتا ہوں' حیا حسین! میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں' یہ بات مان لو' قاتلہ کی بیٹی قاتلہ۔"

اس نے میسج دو تین بار سینڈ کیا' پھر ڈیلیٹ کر کے سیل اس جگہ پر رکھ دیا۔

"مجھے پتا ہے۔ حیا! تمہارے میسجز ہم دونوں کو ڈسٹرب کر دیتے ہیں۔ میں نے جو بھی لکھا وہ میں نے وقتاً" فوقتاً" مظفر کی زبانی اس سے سنا ہے' دل کو دلاسا دیا۔

* * *

تم بھی بھول بیٹھو تو ہزاروں پہلو
ہم تمہیں بھول کے بیٹھیں تو کسے یاد کریں

وہ روتی رہی اس کے اس نفرت انگیز میسج پر اس کو نیند نہیں آرہی تھی' درد رگ رگ میں سرایت کر رہا تھا' وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ اس درد سے' وہ خود نجات حاصل کرنا چاہ رہی تھی' ان میسجز سے' شکر گزار جانے کیوں جائے پناہ تھی۔

وہ گھبرا کر باہر نکلی' سلمان بیگم آ گئی۔ حمیرا سر جھکائے بیٹھی تھیں' وہ بھیگی پلکوں میں گم تھیں۔ آنسوؤں سے ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا' اس کی ماں یوں رو رہی تھیں' جو کنفرم مشہور تھیں' یقیناً" اس کا دکھ ہی اس کو رلا رہا تھا۔

"کیوں وہ اپنے ماں باپ سے بدلہ لینے پر تلی ہوئی ہے۔" ایک سوچ نے اس کو جکڑا "انہوں نے کیا کیا ناز نہ اٹھائے اس کی خوشیوں کے لیے سب کچھ تج کر بیٹھی تھی کہ مظفر کو بھی اپنا لیا اور وہ اس سب کا صلہ نفرت' بے اعتنائی' بے رخی کی صورت دے رہی ہے ان کو۔" دل مجرم بنا' ماں باپ کی محبت نے دل میں انگڑائی لی' اس کے احسان یاد آ گئے' اپنے رویے پر انتہائی شرمندگی ہوئی۔

بالغرض ان کے ماضی کی یہ سب باتیں سچ بھی ہوں تو بھی مجھے کیا حق پہنچتا ہے' بازپرس کا۔

"میری زندگی تو ان ہی کی وجہ سے تلخ ہوئی۔" اندر کی خود غرضی عود کر نکل پڑی۔

"اور انہوں نے جو اپنی دولت' محبت' شفقت کے خزانے تم پر لٹا دیے۔ وہ کس کھاتے میں ڈالو گی حیا حسین! کوئی ایک حق بھی ادا کیا تم نے؟" ضمیر نے آئینہ دکھایا۔

وہ تھکی تھکی سی الٹے پاؤں واپس اپنے کمرے میں آئی۔

"ٹھیک ہے' انہوں نے جو بھی کیا' برا کیا۔ وہ اپنے اعمال کے لیے خود ہی جواب دہ ہیں۔ بحیثیت اولاد میں ان سے کس جرم کا انتقام لے رہی ہوں' کیوں؟ کیا میں ان سے اتنی دور ہو گئی' میرا رویہ اتنا خراب کیوں ہے؟"

اندر سے بیک وقت ابھرنے والی آوازوں نے اسے بوکھلا دیا۔

"کیا اللہ مجھے اس بات کی اجازت دیتا ہے؟" اسے خود اپنی سوچ پر حیرت ہوئی۔ اللہ کے احکام کا خیال زندگی بھر نہ کسی نے دلایا' نہ ہی آیا تھا' پھر یہ روشنی کہاں سے آرہی تھی؟ اس نے بلا ارادہ بے اختیار ہو کر سر اوپر اٹھایا' کمرے میں لگا فانوس بھی پاس کے اوپر تھا' مگر یہ روشنی اس کی نہ تھی' یہ تو اندر سے پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں بھینچ لیں۔

"یا اللہ مجھے معاف کر' میری غلطیوں سے درگزر فرما۔"

"یا اللہ مجھے معاف کر' اندھیروں سے نکال۔ روشنی دے۔ اندھیروں سے نکال' ظلمت سے بچا۔"

دعا مانگتے مانگتے اسے نیند آ گئی' ایسا سکون جو کبھی سکون آور گولیوں سے بھی نہ ملا تھا۔

* * *

صبح اٹھی تو فریش تھی' اس نے پڑھنے اسکول کی

طرح اٹھ کر غسل کیا ٹھیک آٹھ بجے وہ ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھی۔

حمیرا اور حسین رضا نے ایک دوسرے کو خوش گوار حیرت سے دیکھا۔

"السلام علیکم!" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی طبیعت ہے بیٹا؟" حسین رضا نے پہل کی۔

"پہلے سے کافی بہتر ہوں۔" اس نے باپ کو دیکھ کر کہا۔ پھر مسکرا کر ماں کو دیکھا ماں کی آنکھوں میں آئی خوشی کی نمی کو دیکھ کر اسے اور ندامت ہوئی۔

"آپ کے پاس کتنی دولت ہے؟" اس نے ماں کا دودھ کا کپ تھامتے باپ سے سوال کیا۔

"کیوں بیٹا! کتنی چاہیے آپ کو؟" حسین رضا خوش دلی سے مسکرائے۔

"نہیں ایسے ہی پوچھ رہی ہوں اندازاً" کتنی ہے؟" اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"آپ کے اندازوں سے بڑھ کر بہت زیادہ۔"

"پاپا! آپ ایسی جگہ سرمایہ کاری کیوں نہیں کرتے جس میں آپ کو دس فیصد منافع یقیناً حاصل ہو جائے اور سو فیصد سیو ہو جائے۔"

"بالکل لگانے کو تیار ہوں! کس بینک کی پالیسی ہے؟" وہ بے اختیار ہنس دیے۔

حیا مسکرا اٹھی۔ "جنت بینک"

"میں نے تو نہیں سنا نیا کھلا ہے۔"

حیا بے اختیار کھلکھلا اٹھی۔

"بیٹا! جتنا چاہو سرمایہ لگاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" حمیرا اس کا نقطہ نظر سمجھتے ہوئے خوش دلی سے بولیں "ہم تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں! میں دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اور تھر میں پانی کی فراہمی کے لیے کچھ کنویں وغیرہ کھدوانے کا کام بھی کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ کا جس طرح دل چاہے کریں! پیسے کا مسئلہ نہیں بیٹا! بس آپ خوش رہیں میں آج ہی آپ کے اکاؤنٹ میں بھاری رقم ٹرانسفر کروا دیتا ہوں۔"

حسین رضا نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومی۔

"یہ سب کچھ تمہارا ہے بیٹا! جیسے چاہو خرچ کرو اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری بچی کو نیک کام کی توفیق دی۔"

حمیرا کی تشکر بھری آواز ابھری۔ وہ دونوں خوش تھے کہ حیا نہ صرف زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے۔ بلکہ دوسروں کی زندگی میں خوشیاں بانٹنے کو بھی تیار ہے۔

۞ ۞ ۞

"وہ میرے مقدر میں ہے" اس لحاظ سے میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ میں اس کی ہو کر صرف اس کی دوری کو محسوس کر کے جی رہی ہوں۔

میرا بازار محبت میں بے مول بک گئی اور وہ کیسا بیوپاری ہے جو نہ دل نہ حسن نہ پیار کسی کا بھی سودا نہیں کرتا۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا ہے۔ اور میں بچانا چاہتی ہوں اسے "اس آگ سے" اس انتقام سے" میں جانتی ہوں اسے کچھ نہیں ملے گا وہ صرف اپنا دامن جلائے گا اگر وہ اس انتقام سے مجھ سے نفرت کر کے خوش رہ سکتا تو مجھے اس کی نفرت بھی قبول ہوتی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ میسج ٹائپ کرنے لگے۔

"میں تیری سوہنی محبت کی ماری تیرا من اگر مجھے انتقام کی آگ میں جلا کر خوش ہوتا ہے تو مجھے جلا کر خاکستر کر دے بھسم کر دے راکھ بنا دے آگ لگا دے آگ۔"

میسج سینڈ کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

۞ ۞ ۞

اس کے خیال خانہ بدوشوں کی طرح مسلسل مسافرت کا عذاب جھیلتے کبھی دل کے کوچے میں ٹھہرتے کبھی ذہن کے قریے میں خیمے لگاتے کبھی غم جاناں میں کھو جاتے کبھی فکر دوراں میں جا رکتے چلتے رکتے گھٹتے بڑھنے کا سلسلہ بدستور جاری رہتا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسیوں کے گہرے سمندر — موجزن رہتے۔ اس سانولی رنگت میں عجیب سی کشش پیدا ہو گئی تھی دیکھنے والے اک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری نگاہ ڈالنے سے خود کو روک نہ پاتے۔

"آج گھر پر رہنا چیک سائن کروانا ہے۔ اس دن بھی تیا تو تم نہیں تھیں۔" منتظر نے میسج کیا۔

وہ تیا تو اس کو پہلے سے بھی جواب "ظفر کا یقینا" بہت خوش تھا۔ اس کی شکست اس کو وہ خوشی نہ دے سکی جو ماہم کے ساتھ نے دی تھی۔ دل میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"چائے پئیں گے؟" شاید کچھ دیر بیٹھ کر دو باتیں کر سکے۔ وہ گھڑی کے لیے رک جائے۔ دل نے راہ دکھائی۔ وہ مجبور ہو گئی۔

"نہیں—" اس نے رکھائی سے انکار کیا۔ اسے اسی جواب کی امید تھی۔

"کیوں زہر پینا ہے؟" لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ وہ حسب عادت کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔

وہ اس کے اس طنز کو بھی حسب معمول ہونٹوں کے تبسم سے پی گئی۔

"اللہ آپ کو زندگی بھر ہمیشہ خوش رکھے۔" دعائیہ الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے۔

"خوش تو میں ہوں بہت زیادہ" ماہم سے شادی کے بعد مجھے حقیقی خوشیوں کا احساس ہوا ہے۔ بہت خیال رکھتی ہے وہ میرا۔ میں بھی ٹوٹ کر چاہتا ہوں اسے۔"

وہ اسے کیا باور کرانا چاہتا ہے' وہ سمجھ گئی۔ وہ اسے جلانا چاہتا ہے' ماہم کا ذکر کر کے وہ پر سکون سامع بنی رہی۔

"تم کیا جانو منتظر حسنین اسے حسد کی آگ کیا جلائے گی' جو محبت کے ہجر میں جلے ہجر کی تپش میں تڑپے۔"

وہ اک لمحے کو اس جواب اور وہ بھی غیر متوقع پر چپ رہ گیا۔ منتظر پھر سے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں کود پڑا۔

"اوہ تمہیں برا لگ رہا ہے ماہم کا ذکر۔ سچ ہے بھئی برا تو لگے گا' آخر ایک کی کمین تمہارے باپ کے قیدی کی بیٹی' تمہارے برابر آ گئی۔ اوہ برابر نہیں۔ تم سے اونچی مسند پر جا بیٹھی' میرے دل کی حکمران گھر کی ملکہ' وجود کی مالکن۔"

وہ اپنے تئیں تاک تاک کر نشانے باندھ رہا تھا۔ اسے زخمی کرنے کا یہ نادر موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

"میں مانتی ہوں منتظر حسنین! محبت میں رقابت کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔" وہ اس کے لہجے پر بے حد خوش ہوا کہ اس کا تیر نشانے پر لگا۔ مگر وہ اس کی بات کے جواب میں ماہم نہیں ہو سکی۔

"لیکن تم تو میرے کچھ ہی نہیں' کوئی امید' کوئی وابستگی' کوئی وابستگی کا شائبہ تک نہ تھا' دامن دل خالی تھا۔ میں نے تو یک طرفہ محبت کی۔ اور یہ محبت میرے لیے زندگی یا گلزار میرا نصیب' کسی کا اس سے کیا تعلق۔"

اس کے نپے تلے انداز نے اسے لاجواب کر دیا۔ اس نے چیک بک آگے بڑھائی۔

حیا نے حسب معمول خاموشی سے دستخط کر دیے۔

"تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں نے اتنی بھاری رقم کا چیک کیوں سائن کروایا ہے' تو سنو' میں بار بار تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا اس لیے۔"

"آئندہ چیک بھیج دینا' میں نہیں چاہتی' تم اس اذیت سے بار بار گزرو۔" اس نے ٹوٹے وجود کو مضبوط لہجے سے سنبھالا دیا۔

جواب پھر غیر متوقع' آج وہ اسے لاجواب کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی شاید اس کے سارے نشانے چوک رہے تھے۔

"شکریہ تمہارا۔" لہجہ طنزیہ ضرور تھا' مگر آگے وہ کچھ بھی بول نہ پایا۔ چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ وہ اٹھا اور جانے لگا۔

"اللہ کی امان میں' منتظر حسنین!"

وہ ٹھٹکا' رکا' مڑ کر اسے دیکھا' اس کی نظروں میں ناسمجھ میں آنے والی حیرت تھی۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

حیا نے آنکھیں موند کر تھکے ہارے ہوئے انداز میں سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آیا تو حمید ماموں نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ ڈالا۔

"بہت مبارک ہو بیٹا!"

"کس بات کی ماموں؟"

"ارے ملکوں کی پیڑھی آگے بڑھنے والی ہے' تیرا وارث پیدا ہونے والا ہے پتر!" وہ ہاتھ اٹھا کر ناچنے لگا۔

"خیر مبارک ماموں! آپ کو بھی مبارک ہو۔"

وہ صبح آفس گیا تو ماہم کو ہلکی سی حرارت تھی' اس نے ناشتا بھی نہیں کیا' متلی ہو رہی تھی۔

"میں آؤں گا تب تک شام ہو جائے گی۔ گاڑی بھیج دیتا ہوں' خالہ کے ساتھ جا کر ابھی چیک اپ کروا لو۔" اس نے جاتے ہوئے تاکید کی تھی۔

وہ خوش ہو کر کمرے میں آیا۔

"مبارک ہو میرے بچے کی اماں جان!" اس نے چھیڑا۔

ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔ "آپ کو بھی میرے بچے کے ابا جان کو بھی مبارک ہو۔"

"ڈاکٹر نے پھر کتنے دنوں بعد چیک اپ کروانے کو کہا ہے۔"

"ہر ماہ وزٹ ہو گی۔"

"نہیں یار! ہم ہر پندرہ دن بعد وزٹ کریں گے میں چاہتا ہوں میرا بچہ خوب صحت مند ہو۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

وہ اپنی اس خوشی میں ایسا مگن ہوا کہ بھول کر بھی حیا اسے یاد نہ آئی' نفرت سے ہی سہی۔ ماہم کا چیک اپ' کھانے کا خیال' ماہم سے روایتوں کا خیال' اتنی محبت' توجہ پا کر ماہم فضاؤں میں اڑتا محسوس کرتی خود کو۔

جیسے جیسے ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے' وہ ڈر رہی تھی۔

وہ اس کی ڈھارس بندھاتا۔ "سب خیریت سے ہو جائے گا' تم پریشان نہ ہو۔"

خالہ اور اماں ہمت دلاتیں۔ "ارے بیٹا! کیوں اتنا ڈر رہی ہو' کچھ نہیں ہو گا۔ یہ دنیا کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا' اک تم ہی تو اکیلی نہیں۔" وہ اس پر جتنیں سے پھونک مارتیں دعائیں دیتیں۔

"اللہ تسلی دے گا۔"

یہ نو ماہ ان کے اتنے محبت بھرے اور مصروف گزرے کہ بھول کر بھی ان لوگوں کا ذکر ان کی زبان پر نہ آتا۔

☼ ☼ ☼

ساتھی پیا کو جو لیں نہ دیکھوں۔
دیکھیے آئیں اندھیری رتیاں

اس محل شاہانہ حسین' جہاں دل تو' دلبری کی دلبری کی امیدیں باندھنی تھیں' وہاں یہ کیسی بے تحاشا ناقدری کر آئی' وہ اس آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی۔

رات تیسرے پہر میں داخل ہوئی' جب عنصر کا نام موبائل اسکرین پر جگمگانے لگا' اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔

"میرے دشمنوں کو خبر ہو کہ اللہ نے مجھے بیٹی سے نوازا ہے۔"

اس نے فوراً جواب دیا۔

"اس رحمت کے لیے آپ کو ڈھیروں مبارک باد۔"

"اس نے اس قابل تو سمجھا کہ اپنی خوشیوں میں شریک کیا۔" دل نے خوشی محسوس کی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے دل جلے میسج نے اس تاثر کو زائل کر دیا۔

"ہاہا! بہت دکھ ہوا ہو گا تمہیں' میری وارث پیدا ہو گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ قاتل کی اولاد کے بطن سے نہیں' محسن کی اولاد کے بطن سے۔ ماہم سے جو میری جان ہے۔"

اس کے ہاتھ تیزی سے جواب ٹائپ کرنے لگے۔
"محبت نفع و نقصان کی جمع تفریق نہیں دیکھتی۔ بے غرض ہوتی ہے۔ دل کرائے کا گھر نہیں صاحب! اس کے مکین بار بار نہیں بدلتے۔"
اس کے آنسو موبائل اسکرین پر گرے۔ اس نے پیغام ارسال کر دیا۔
محبت ایسی ہی ہے۔ جنون بن کر نازل ہونے والی۔ صبر بن کر رسنے والی، ہجر کا قہر بن کر جانے والی۔ دراصل وہ جس کو محبوب کی گلی سمجھی تھی۔ وہ محبوب بھی اک ازلی و فانی انسان اور وہ گلی بھی بھول بھلیاں، جس میں وہ گم ہو گئی۔ اسے ادراک ہوا کہ اس نے غلط راستے پر قدم رکھا تھا۔
"اے رب! مجھے اپنا راستہ دکھا دے۔ مجھے انسان کے پیچھے دوڑنے کی رسوائی سے بچا۔ میں فون کرتی ہوں وہ نہیں اٹھاتا، وہ میری پکار کا جواب نہیں دیتا۔ تُو کسی طرح تو مایوس نہیں کرتا، ہر پکار سننے والے کو جواب دیتا ہے، مدد کرتا ہے، جو تجھے چھوڑ جاتے ہیں انہیں بھی اپنا لیتا ہے۔ مجھے فانی کے عشق سے بچا لے، اپنا بنا لے، باقی کا عشق عطا کر۔"
صرف وہی نہیں سسک رہی تھی، رات بھی ساتھ ساتھ سلگتی تھی، آسمان کا پلو بھیگ گیا۔ یہ پہلی بار ہوا کہ وہ رب صمد جو بے نیاز ہے، اس سے تعلق اہم کام تھی۔ جب بے بس ہوئی تو اس بے نیاز رب کو پکارنے لگی جس سے تعلق سبھی کا بے نیاز ہو جائے۔ وہ پکارنے والے کی پکار سنتا ہے۔
اسے یہ ادراک بہت دیر میں ہوا کہ محبوب ہمیشہ بے نیاز ہوتا ہے۔ مگر رب صمد ایسا بے نیاز ہے کہ جس کے سامنے اک بار نیاز سے عاجزی سے بندہ جھک جائے تو وہ کہتا ہے "تم ایک قدم بڑھاؤ میں دس قدم بڑھاؤں گا۔"
اس کے دل پر آہستہ آہستہ سکون اترنے لگا۔ اس کا دل بارگاہ ایزدی میں جھکنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کے کمرے میں وہ سب خوش تھے۔ ماہم کو ہوش آ گیا تھا۔
سب اس کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اس کا خیال رکھ رہے تھے۔
"جس گھر میں پہلوٹی کی اولاد بیٹی ہو، اس گھر میں فرشتے مبارک باد دینے آتے ہیں۔" خالہ نے اس کی پیشانی چومتے کہا۔
"ہم اس کا نام مریم فاطمہ رکھیں گے، مرحومہ زبیدہ بہن کو بڑا پسند تھا۔ مظفر کی باری بھی کہا تھا کہ اگر بیٹی ہوئی تو مریم ہی نام رکھوں گی۔" حمید ماموں، بہن کو یاد کر کے بولے۔
"اگر اماں کو یہ نام پسند تھا تو میں یہی رکھوں گا۔" مظفر نے بچی کو سینے سے لگا کر کہا۔
"ہاں بیٹا ضرور بیٹا! کیوں نہیں۔" ساس نے خوش ہو کر کہا۔
دروازے پر دستک ہوئی۔
"میں دیکھتا ہوں، کوئی ڈاکٹر یا نرس ہی ہوگی۔" بخشش نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ "جی یہ مظفر صاحب کے لیے۔" وارڈ بوائے باہر سے ہی تھما کر واپس چلا گیا۔
"ارے بیٹا! یہ تمہارے نام کوئی دے گیا ہے۔" پھولوں کا گلدستہ، مٹھائی کا ٹوکرا۔ اس کے اوپر رکھا کارڈ۔"
"کس نے بھیجا ہے؟" حمید نے اس سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے استفسار کیا۔
"یہ پوچھنے کا اس آدمی نے موقع ہی نہیں دیا۔ بس مظفر میاں کا پوچھا، میں نے کہا اندر ہیں۔ یہ تھمایا اور یہ جا وہ جا۔"
"ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" مظفر نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔
بے حد مبارک باد کے ساتھ بیٹی کے جنم پر میری طرف سے یہ تحفہ امید ہے پسند آئے گا۔
تمہاری حیا مظفر حسنین۔
اس نے بلند آواز سے پڑھا۔
ماہم کو اچانک سب چہروں نے آن گھیرا، دل زور زور

سے دھڑکنے لگا۔

"تحفہ یہ مٹھائی ہے۔" مختشل استہزائیہ ہنسا۔ "تمہیں پلور تک 'مارکی' مل میں اپنا حصہ بھی میرے نام کروانا ہے۔" لیٹر ہاتھ میں پکڑ کر لیا۔

مظفر کے چہرے پر حیرت تھی۔ جو اس کے لہجے سے بھی جھلکتی تھی۔ نہ رات میں نے طعنہ دیا تھا۔ شاید وہ اس طعنے کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہے۔ مکار' سمجھتی ہے مجھے جیت لے گی۔ اپنے ان ہتھکنڈوں سے۔"

"ارے بیٹا! اس نے جو بھی کیا' تمہارے حق میں تو اچھا ہی ہوا۔ اب تمہیں چیک سائن کروانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سمجھو' مالک ہو اب تم۔" حمید نے کہہ کر شانہ تھپتھپایا۔

"ارے ہماری ننھی پری بھاگوان ثابت ہوئی ہے۔ آتے ہی رحمت کے دروازے کھول دیے ہیں۔" مختشل نے چہک کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل۔" سب تائید کرنے لگے۔

"خالہ! یہ مٹھائی اسپتال کے عملے کو دے دینا۔" مظفر نے ٹوکرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

سالحہ خاتون نے تسبیح پڑھتے ہوئے صرف اثبات میں سر کو جنبش دی۔

ماہم کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ یہ اس کا فیصلہ اب تو اس کا قلعہ اولاد سے اور بھی مضبوط بنا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

محبت کی علامات ہر ذی روح کے احساسات سے مختلف ہیں' انسان دام الفت کا شکار' محبوب کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ چاہے محبوب چاہے یا نہ چاہے۔ مگر محبوب کی دھتکار میں بھی عجب اک پکار پوشیدہ رہتی ہے۔

محبوب کا انکار' اقرار' نفی' اثبات' جھڑکنا' بلانے کے مترادف' دل کے جذبات ذہن کے احساسات پر صرف محبت کا سکہ رائج رہتا ہے اور محبت میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب قربت اور فرقت بے معنی ہو جاتی ہے۔ محبت کرنے والے اک جادو کے اسیر

قید ہو جاتے ہیں۔

عید آنے والی تھی۔ اس نے اپنی اسسٹنٹ کو ان اداروں کی لسٹ بنانے کو کہا' جہاں یتیم بچوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اس نے اس عید پر ان بچوں کو کپڑے' جوتے دینے کا پروگرام بنایا تھا۔

اس کی این جی او کے ساتھ ایک میٹنگ تھی۔ جو غریب' ذہین بچیوں کو اسکالرشپ پروگرام دے رہی تھی۔ ان کے فائنانشل پروگرام کو وہ سپورٹ کر رہی تھی۔

"بیٹا! آپ خود کیوں نہیں این جی او بنا لیتیں۔" اک روز حسین رضا نے اس کو مشورہ دیا۔

"میں۔ تنہا کیسے سنبھال سکتی ہوں بابا!؟" اس نے جھجک سے پوچھا۔

"آپ کاموں کے لیے ورکرز رکھیں گے۔ آپ صرف نگرانی کریں گی' اچھا ہے' اس سے کچھ لوگوں کو روزگار بھی مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا۔ جیسے آپ چاہیں' مگر ایک شرط ہے' جن تنظیموں سے میں وعدہ کر چکی ہوں' فنڈنگ کا وہ میں پورا کروں گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں بیٹا! آپ ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہتی ہیں تو کرتی رہیں؟ یہ کام ہم اسٹارٹ کر لیں گے۔"

کچھ ہی دنوں میں حسین رضا نے نہ صرف حیا فاؤنڈیشن رجسٹر کروائی تھی۔ آفس بھی بنوا لیا اور ساری آسامیوں پر مختلف ورکرز بھی رکھ لیے۔

اس کے لیے کام بہت آسان ہو گیا تھا۔

گوٹھوں' دیہاتوں میں غربت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ اس کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کی مفلوک الحالی اور غربت تنگ دستی دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرنا چاہتی۔

اپنا غم ان کے غموں کے آگے ہلکا پڑ جاتا۔ اپنا درد ان غریبوں کے درد و دکھ کے سامنے بے معنی لگتا۔ وہ وقتی طور پر ہی سہی مگر بہل جاتی۔

☆ ☆ ☆

"آج مریم کے اسکول کا پہلا دن ہے۔" ماہم نے منتظر کو اطلاع دی' جو بیرون ملک دورے سے رات دیر سے آیا تھا۔

"اچھا... ایڈمیشن ہو گیا اس کا؟" اس نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا! بچی روئے گی' آج تم خود بھی جاؤ اس کے ساتھ۔" صالحہ خاتون کوئی دسویں بار یہ کہہ چکی تھیں۔

"خالہ! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ ساری دنیا کے بچے اسکول جاتے ہیں۔ سیٹ ہو جائے گی۔" ماہم نے ہنستے ہوئے دلاسا دیا۔

"ویسے تو تمہارے ساتھ بھی اک ماہ تک خود اسکول گئیں۔ کہیں ماہم کی کوئی بچہ پٹائی نہ کر دے۔" خورشید نے بچپن کی بات بتا کر اس کی پیشانی چومی۔

"خالہ تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہیں اماں' مگر اب آپ بھی بالکل ایسی ہی ہو گئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے والی۔"

"ہاں تو بیٹا... اصل سے سود عزیز ہوتا ہے۔ تمہاری بچی میں تو ہماری جان ہے۔" خورشید بی بی نے تائید سب نے کی۔

"ہاں تو چلی جاؤ نا خالہ۔ بچی کہہ رہی ہے۔ پہلی بار فرسٹ ڈے پر تم ساتھ رہو گی تو نارمل فیل کرے گی۔" منتظر نے بھی تائید کی۔

"او کے... آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟" اس نے استفسار کیا۔

"شیور۔" منتظر مسکرایا۔

مریم والہ اسکول ڈریس پہن کر رانی بنی بیٹھی تھی۔ سب کے درمیان۔

☼ ☼ ☼

بہت دنوں بعد مہرین سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دل کھول کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنے سوشل پروگرامز کے بارے میں بتاتے اس کے چہرے پر انوکھی سی خوشی تھی۔

"میں نے اتنے سالوں میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ ہم اپنے سارے مسائل' غربت' لسانیت' دہشت گردی سب پر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اگر لٹریسی ریٹ بڑھ جائے۔ خواندگی کی شرح بڑھنے کے ساتھ مسائل کسی حد تک کم ہو سکتے ہیں' شعور کی بلوغت لوگوں کو انصاف کرنا سکھائے گی اور حق پر چلنا' اپنے مسائل کو حل کرنا سکھائے گی۔"

وہ روانی سے بول رہی تھی۔ جب اچانک اس نے دانت بھینچے' دونوں ہونٹوں کے درمیان "سی" کی آواز نکلی' چہرے پر اچانک تکلیف کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"کیا ہوا؟" مہرین نے فوراً آئس کریم کپ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے آنکھیں نیم وا کر کے نفی میں سر کو جنبش دی' کھینچ کے لمبی سانس لی۔

"بتاؤ تو سہی' کیا کہیں درد ہے؟" اس نے دیا کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ہمدردی سے تھپتھپایا۔

"درد کا اور میرا رشتہ تو سالوں سے جڑا ہوا ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"اتنی اذیت پسند مت بنو۔" مہرین نے اس کے دوسرے ہاتھ کو دیکھا' جو سینے کی دائیں سائیڈ پر رکھا ہوا تھا۔

مہرین نے اس کے اس ہاتھ کو ہٹایا۔ "یہیں پر درد ہے۔"

"ہاں... کبھی کوئی ٹیس سی اچانک اٹھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے مگر ناقابل برداشت۔ مگر فوراً ہی خود ختم ہو جاتی ہے۔"

"ڈاکٹر کو دکھایا؟" مہرین نے اضطراب سے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں' ٹائم نہیں مل رہا تھا۔"

"حیرت ہے' اتنی لاپروائی کہ ابھی تک سوچ رہی ہو' چلو اٹھو میرے ساتھ' میری دوست ہے' بہت اچھی ڈاکٹر ہے۔"

"ارے یار بعد میں چلیں گے۔"

"دیکھو کوئی اپائنٹمنٹ لینے کی ضرورت نہیں

ہے۔ وہ اسپتال میں نہیں ہوگی تو فون پر فوراً پہنچ جائے گی۔" اس نے پکڑ کر اٹھایا۔

"او کے۔ او کے۔ یہ تمہاری عجلت پسندی۔ ہونہہ!" وہ مسکرا کر نفی میں سر کو جنبش دینے لگی۔

"آنا خان چلو۔" اس نے ذرا ٹھہرتے کہا۔

"کوئی پرانی چوٹ ابھرتی ہے آپ کو؟"

ڈاکٹر بینش نے تفصیلی چیک اپ کے بعد کہا۔ اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا۔ نفی میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ مگر مہرین کی نظروں سے وہ سایہ چھپا نہ رہ سکا۔

"یہ کچھ ٹیسٹ ہیں۔ آپ کروالیں۔ رپورٹس آنے تک ہم حتمی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔"

اسے سخت الجھن ہو رہی تھی ڈاکٹر بینش کے سوالوں سے۔ ٹیسٹ کروا کے وہ جلد از جلد اسپتال کے ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔

دوسرے دن پھر کچھ ٹیسٹ تھے۔ صبح سویرے ہی مہرین نے اسے پک کیا۔

وہ کل کے مقابلے میں کافی فریش تھی۔ بہت سے مشکل ٹیسٹوں سے فارغ ہو کر وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔

چیک کرنے کے بعد کولڈ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے مہرین نے اچانک سوال داغا۔

"یہ چوٹ تمہیں مظفر کی لگائی ہوئی ہے نا؟"

اس نے اضطراب سے مہرین کو دیکھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں تمہیں اچھی طرح سے جانتی ہوں ڈیئر۔ تم کھلی کتاب ہو۔ محبت کرنے والے دوغلے نہیں ہوتے وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے اندر ویسے باہر۔" مہرین کے باریک تجزیے پر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ جسم کی تو ایک چوٹ ہے۔ میری روح تو ایسی سینکڑوں چوٹوں سے بھری پڑی ہے۔" اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

"دل کرتا ہے قتل کردوں اس کو جس نے تمہیں اتنا رلایا ہے۔" مہرین نے غصے سے کہا۔

"چھوڑو مہرین! کیوں جان جلاتی ہو۔ جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ہر کوئی اپنے حصے کا رونا خود ہی روتا ہے۔"

✿ ✿ ✿

اک دنیا بھول بھلیاں سی
اک گونگا بہرا اندھا حال

آج دل کو پھر قرار نہ تھا۔ سارے جسم و جان میں بے چینی کروٹیں لے کر بیدار ہوگئی تھی۔ وہ کہیں سے آجائے "اک بار اسے دیکھ لوں، یا نہ سہی اس کی آواز ہی سن لوں۔"

اس نے فون ملایا۔ اس کا نمبر ملا کر کاٹ دیا۔ کیا فائدہ۔ وہ کبھی نہیں اٹھائے گا۔ میں مسلسل کال کر رہی ہوں۔ وہ جھنجلا کر فون ہی بند کر دیتا ہے۔

بے بسی سی بے بسی ہے۔ بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آنسو پونچھ کر پھر فون ملایا۔

"یا اللہ۔۔۔ اس کے دل میں ڈال دے میرا فون اٹھالے۔" اس کے صرف لفظوں سے ہی نہیں پورے وجود سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

ناقابل یقین جب فون سے اس کی ہیلو کی آواز ابھری۔

"مظفر! تم کیسے ہو مظفر؟" بے تابی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ٹھیک ہوں، تمہارے بغیر بہت خوش، اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ بہت مطمئن بہت آسودہ۔"

وہ ایک ایک لفظ اسے جتلا رہا تھا۔ باور کرا رہا تھا۔

اس نے کال کاٹ دی۔

وہ اور شدت سے رونے لگی۔ کیا ملا اس کی آواز سن کر بات کر کے۔

میں نے ایک انسان کی پرستش کی۔ اس کی سزا یہ ملی ہے کہ وہ کبھی بھی میرا ہو ہی نہیں سکا۔ پرستش تو صرف اس ذات یکتا کی جچتی ہے جو صرف دینا جانتا ہے بیٹے سے بے نیاز بے پرواہ اور بیری

وقوفی، جوانی تو دیکھو کہ میں بھاگتی رہی اس کے پیچھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

انسان بہت بھٹکتا ہے۔ مٹی کی مورتیوں کے پیچھے، وہ مٹی ہی نکلتی ہیں۔ مٹی جو بکھر جاتی ہے۔ کچ جائے تو ٹوٹ جاتی ہے۔ جو بار بار فنا ہوتی ہے۔ اس کی خاطر اس نے اپنی انا کو فنا کیا۔ خواہشات کو فنا کیا۔ اس کی خوشی کی خاطر غموں کو گلے لگایا۔ بس جس پلت میں وہ خوش، جس طرح وہ خوش۔

وہ اگر اس کو چھوڑ کر خوش ہے تو وہ وصال سے دست بردار ہوگئی۔ اس کی فون کالز اس کے لیے باعث جھنجلاہٹ ہیں تو اس نے فون کرنا چھوڑ دیا۔ میسجز وہ بغیر پڑھے ڈیلیٹ کر دیتا ہے۔ اس نے میسجز کرنا بند کر دیے۔ اپنی ہر خوشی کا قتل کیا۔ محض اس کی خوشی کی خاطر۔ پھر بھی وہ راضی نہیں۔ مطمئن نہیں۔

"بندہ کبھی کچھ صلہ نہیں دیتا۔ بندہ تو صرف اپنی ذات کو 'اپنی انا کو خوش رکھتا ہے۔ پھر بے وقوفی ہی ہے کہ وہ اپنے جیسے لوگوں کو اعلا تر بنا دیتا ہے اور محبوب حقیقی کو چھوڑ دیتا ہے۔ دور ہو جاتا ہے۔ انسان جاہل ہے کہ لوگوں کو اعلا، اکم تر کو برتر اور اپنی ریاضت محبت کو بہتر و معتبر جانتا ہے۔ اس غلط فہمی، خوش فہمی میں اللہ اسے پھر کسی بندے کے ہاتھوں ذلیل کر دیتا ہے۔ وہ بھٹکتا ہے 'اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔ میں بھگت رہی ہوں' میرے مالک تھک رہی ہوں سزا میرے دل کو بدل دے 'بدل دے۔"

ندامت کے آنسوؤں سے پورا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ وہ جھکتی چلی گئی۔ نیچے کارپٹ پر سجدے میں پڑے پڑے اسے کتنی ہی دیر ہو گئی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کے دل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ بے غم ہو کر سو گئی۔ اپنے سارے غم رب صمد کو سنا کر بتا کر بوجھ ہلکا ہو گیا۔

✱ ✱ ✱

پاکستان ٹیلسٹائل انڈسٹری کی نمائش لگی ہوئی

تھی۔ اس نے تین اسٹالز لگائے تھے۔ ان اسٹالز کو چیک کر کے وہ باہر نکلنے کو مڑا۔ جب حسین رضا سے اس کا سامنا ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر حسین رضا کا ہاتھ اس کے شانے پر تھم گیا۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

اس نے حسین رضا کے سوال کا جواب استہزائیہ مسکراہٹ سے دیا۔

"پتا نہیں تمہاری بدگمانی کب ختم ہو گی بیٹا؟"

"کبھی بھی نہیں 'کیونکہ میں اپنے باپ کے قاتل کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔"

"یقین کرو بیٹا! میں نے اسے مارنے کی نیت سے انجکشن نہیں دیے تھے۔ وہ معمولی نشے کے انجکشن تھے۔ تاکہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول سکے۔ ایسے ان انجکشن نے نہیں بلکہ اس کو غیرت مند آدمی تھا۔ غیرت کے صدمے نے مار دیا۔"

اس نے اپنے شانے پر رکھے حسین رضا کے ہاتھ کو جھٹکا۔

"اور کتنا جھوٹ بولیں گے اب تو باز آجائیں۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ گئے دنوں کی باتیں جو وقت کی دھول سے اٹ گئیں۔ وہ پھر صاف ستھری ہو کر اس کے سامنے آ کھڑی ہو گئیں۔

پتا نہیں کیوں اک گمان سا دل میں آ ٹھہرا کیا حسین رضا سچ کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بے اختیار سوچ رہا تھا۔ وہ سمندر پر آ گیا۔

✱ ✱ ✱

وہ اپنی رپورٹس خود لینے گئی تھی۔

"آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے مسز حیا!"

"مجھے اندازا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"آپ اتنی ذہین 'پڑھی لکھی ہیں پھر بھی اپنا خیال نہ رکھ سکیں۔ اپنے آپ سے اتنی بے خبر ہیں۔" انہوں نے فائل اس کی طرف بڑھائی۔

"جو سنانا چاہتی ہیں 'بے دھڑک سنا دیں۔" وہ مسکرائی۔

اس نے رپورٹ پڑھ کر فائل بند کر دی۔ اسے کوئی دھچکا نہیں لگا تھا۔ جیسے وہ پہلے ہی جانتی تھی۔

"لمبا علاج ہے۔ آپ ذہنی طور پر تیار رہیں۔ پہلے آپریشن کروانا ہوگا۔"

ڈاکٹر نے اسے کچھ اور ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے۔

وہ وہاں سے اٹھ کر ساحل سمندر پر چلی آئی۔

اسے یاد تھا۔ وہ ظالم لمحہ جب مظفر نے اسے دھکا دیا تھا۔ ٹیبل کا کونا اس کے سینے میں لگا۔ مگر سینے کے اندر دل کا درد اتنا شدید تھا کہ اس نے خیال ہی نہ کیا۔

زخم کینسر میں بدل گیا تھا اور ہڈیوں تک جا پہنچا تھا۔

وہ سمندر کے کنارے چلتی رہی۔

"تو حیا حسین! اس محبت نے تمہیں یہاں تک پہنچا دیا۔ کچھ لوگوں کو محبت جلا بخشتی ہے اور کچھ کو جلا بخشتی ہے۔ تمہیں اس نے خاک کر دیا۔"

سمندر کی تنہائی سے گھبرا کر مڑی۔ اس کے عین سامنے مظفر کھڑا تھا۔ وہ پتھر کی ہو گئی۔ یہی حالت اس کی بھی تھی۔ دونوں کو دھچکا لگا تھا۔ اتفاقی ملاقات کیا یوں بھی دو ایک دوسرے کو سر راہ مل جائیں گے۔

ان دونوں نے تو ان راہوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ جن پر ایک دوسرے کے ملنے کا امکان بھی ہوتا تھا۔

حیرت، سکون، خاموشی، درد، وہ جیسے ساکت و مبہوت ہو گئے تھے۔

"کیسی ہو؟"

"مظفر حسین! میں تمہارے بغیر کیسی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

اس نے دونوں ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھے، سسکی ابھری۔

وہ دونوں اپنی بے ساختگی پر حیران تھے۔

وہ خاموش تھا۔ حیا نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا، مڑی اور تیزی سے چلی گئی۔

بعض دفعہ انسان اپنے محسوسات سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ اس کے پیچھے جائے، روکے ہمیشہ کی طرح اپنی راہ لے۔

☼ ☼ ☼

یہ خبر بجلی بن کر اس کے والدین پر گری تھی۔ سارا سرمایہ ایک دم ڈوب جائے تو کیا حالت ہوتی۔ وہ پاگل سے ہو گئے تھے۔ رو رو کے حیرا کی آنکھیں دھنسنے لگیں۔

حسین رضا نے دنیا کے مشہور ہاسپٹلز سے رابطہ کیا تھا۔ اس کی رپورٹس امریکہ اور برطانیہ کے بڑے ہاسپٹلز کو بھیجی گئی تھیں۔ شاید کہیں سے کوئی مثبت جواب مل جائے۔

امید اور اگر لفظوں جس اپنی سہارے کی بنیاد ورد لینا چاہتا... تیاریاں کرنے لگے۔ اتنے کم زندگی اتنی کم اسے وقت نہیں مل رہی تھی۔ کیا کچھ نہ کرنا تھا اور موت کی دستک سنائی دینے لگی تھی۔ نہیں، زندگی میں کیا پایا کچھ بھی نہیں۔

موت اور محبت میں کتنی مماثلت ہے۔ آئے دل خالی، دامن خالی، ہاتھ خالی۔

نہ دنیا میں کچھ کمایا، نہ ہی آخرت کے لیے۔ تیری مخلوق کی خدمت میں دل لگایا۔ وہ بھی پورا نہ ہو پایا۔

ایک بندے کے عشق میں عمر تمام کی کیا ملا؟ صرف انتظار۔

بندے کا ارادہ تو کچھ نہیں، بندے کا اختیار بھی کچھ نہیں۔ پھر انسان زندگی کو اپنے اختیار، اپنی مرضی سے ہی کیوں گزارنا چاہتا ہے؟

یہ سوال بار بار اس کے سامنے سر اٹھاتا اور ہر بار اس کا سر اس رب صمد کے حضور جھک جاتا۔ جس کے پاس سارے اختیار، جس کا ارادہ صرف محتاج کن، جس کا حکم ہر حکم سے ماورا، جو زندہ ہے زندہ صرف زندہ۔ موت سے پاک، اونگھ سے، نیند سے ماورا، ماوراالماورا۔ زندگی میں اس نے کبھی اس محبوب حقیقی کا حق ادا نہیں کیا۔ جو بے نیاز ہے، بھٹکا ہوا اس کے پاس آئے تو وہ دھتکارتا نہیں۔ تھام لیتا ہے، سنبھال لیتا ہے۔ یہی تو فرق ہے۔ حقیقی اور مجازی

محبوب میں۔
میں یہ ذلت سہہ چکی۔ بس اب مجھے پناہ دے۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! یہ قومی تعلیم کا روز پڑا ہے۔ چند دن سے تمہارے کام کا تو نہیں؟" خورشید نے جو اپنی نگرانی میں ماسی سے صفائی کروا رہی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھی صالحہ خاتون سے باتیں کرتی ماہم سے پوچھا۔

ماہم نے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔

"اماں! یہ تقریب تو پرسوں ہو چکی ہے۔ اب یہ بے کار ہے۔"

اسے پتا تھا کہ اماں سارے اخبارات "کا روز" پھینکنے نہیں دیتی ہیں۔ ان میں قرآن کا ترجمہ لکھا ہوتا ہے۔ پھینکنے سے بے ادبی ہوتی ہے۔ وہ لفظ کی حرمت برقرار رکھنے کی سخت قائل تھیں۔

"تم اس تقریب کا بتا رہی تھیں نا بیٹا! جہاں حیا آئی ہوئی تھی۔"

"جی خالہ! وہ مہمان خصوصی تھی۔"

"تمہارا اس سے سامنا ہوا؟"

"نہیں خالہ! میں تو اسے دیکھ کر آخری رو میں جا کر بیٹھ گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری دوست کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہو جائے۔"

"مگر وہ آئی کیوں تھی بیٹا؟" خورشید نے سادگی سے پوچھا۔

"اماں۔۔۔ وہ این جی اوز کے مختلف پروجیکٹ کو اسپانسر کرتی ہے۔ اس لیے آئی تھی۔ ان لڑکیوں کو سرٹیفکیٹ دینے، جن کے تعلیمی سلسلے کو اس نے سپورٹ کیا تھا۔"

"سنا ہے دل کھول کر لوگوں کی مدد کرتی ہے۔" خورشید دبے لہجے میں بولیں۔

"جی اماں! بہت سی این جی اوز کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ اس نے خود بھی اپنی فاؤنڈیشن بنا رکھی ہے۔"

"ارے بیٹا! حسین رضا نے اتنی حرام کی دولت کمائی ہے۔ آخر کیا کرے گا؟ اچھا ہے، کچھ غریبوں کا بھلا ہو رہا ہے۔" بھخضل ہنسا۔

"بس بیٹا! نبیوں کے گھر کافر، کافروں کے گھر نبی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہ تو پھر بھی گناہ گار ماں باپ کی اولاد، مگر ہے نیک۔"

اندر آتا ملتفران کی باتوں پہ کچھ لمحے کے لیے باہر ہی رک گیا۔

"ہاں اماں! میری دوست بتا رہی تھی کہ تقریب اتنی جلدی اس لیے ارینج کی کہ اسی رات حیا کی فلائٹ تھی۔ لندن جا رہی ہے والدین کے ساتھ۔"

"اب یہ بھی بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔"

"ہم بھی اب بڑے لوگ ہیں، اب ہم بھی جا سکتے ہیں۔" بھخضل اتر کے بولا۔

"ہاں بیٹا! کیوں نہیں۔ اب کے چھٹیوں میں ہم چلیں گے۔"

"تو بتاؤ مر بیٹا بھی آ گیا۔" بھخضل نے خوش ہو کر کہا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ماہم نے اس کو دیکھ کر دانستہ موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہ کہیں بھی جائے، اب اس کا علاج ممکن نہیں۔" مرن کو بار بار ڈاکٹر بینش کی بات یاد آ رہی تھی۔

اسے رہ رہ کے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ کیوں میاں کے ساتھ دبئی شاپنگ فیسٹیول چلی گئی۔ جب واپس لوٹی تو حیا، میرا اور پھپھو انکل لندن چلے گئے تھے۔

اس نے فون کر کے حیا سے رپورٹس کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے "سب کلیئر ہے" کا بتایا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

ایک ماہ بعد اس کا میسج آیا تھا کہ وہ یورپ کے تفریحی دورے پر جا رہی ہے۔ وہ سال میں ایک بار بیرون ملک فیملی کے ساتھ جاتی تھی۔ یہ کون سی نئی بات نہ تھی۔ جس پر وہ چونک جاتی۔

اور آج جب بینش سے ملاقات ہوئی تھی تو بینش

نے حیا کے بارے میں پوچھا تھا۔
"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آج کل محترمہ یورپ گئی ہوئی ہیں۔"
"تم نہیں بھی جانتے' اب اس کا علاج ممکن نہیں۔ وہ اب لاسٹ اسٹیج پر ہے مرین!" ڈاکٹر پیٹش نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی تھی۔
پیٹش کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازا ہوا کہ وہ شاکڈ رہ گئی ہے۔
"لگتا ہے' تم لاعلم ہو۔ اس کی بیماری سے۔"
"یہ بات اس نے مجھ سے کیوں چھپائی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔
"تمہارے ٹرپ کو بدمزا کرنا نہیں چاہتی ہوگی۔ ایک اچھے دوست کی یہی نشانی ہوتی ہے مرین۔" مگر آگر بھی وہ پریشان رہی۔
چاہنے کے باوجود وہ فون نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کیا کہے گی حیا سے' بار بار آنکھیں بھر آتیں' خود میں بات کرنے کا یارا نہ رہا تو اسے میسج کیا۔
"اب کیسی ہو حیا؟"
چند گھنٹوں بعد جواب آیا تھا۔
"پہلے" سے بہتر ہوں۔"
اس نے سکون کی سانس بھری۔ وہ اس کے "اب" سے بات سمجھ گئی اور وہ اس کے "پہلے" سے۔
کچھ لوگ کہی ہوئی بھی نہیں سمجھتے اور کچھ ان کہی بھی سمجھ جاتے ہیں۔ جو ان کہی سمجھ لیں ان کا شمار بہترین دوستوں میں ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

حیا نے اپنی غیر موجودگی میں حیا فاؤنڈیشن کی عارضی ذمہ داریاں مرین کو سونپ دی تھیں۔ اس عرصے میں حسین رضا دوبار پاکستان آئے تھے۔ بزنس ڈیلنگ کے سلسلے میں مگر یہ حقیقت تھی کہ اب ان کا بزنس میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ دونوں ہمہ وقت حیا کے ساتھ ہوتے۔ ان تینوں فریقوں کو اس بات کا اچھی

طرح اندازا تھا کہ جو وقت گزر رہا ہے' وہ پھر نہیں آئے گا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کی کوئی گھڑی ضائع نہیں کرتے تھے۔
وہ خود ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس کی ماں گھنٹوں اس کو تکتی رہتیں۔ پھر اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ باپ کا دکھ وہ سمجھ سکتی تھی۔ جو اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔
اسے لگتا کہ صرف وہی نہیں اس کے ساتھ وہ دونوں بھی اس بیماری کو جھیل رہے ہیں۔ اس کے پاس اب بہت تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا اور اسے پاکستان میں بہت سے اہم اور قانونی فیصلے کرنے تھے۔
"میں پاکستان واپس جانا چاہتی ہوں۔"
"جیسے آپ کی مرضی بیٹا!" حسین رضا نے اختلاف نہیں کیا۔
"اور بابا پہلے عمرہ کریں گے۔" اس نے حتمی فیصلہ سنایا۔ ان تینوں نے جوش و خروش سے عمرہ کی تیاری کی۔
"بابا! اگر حج تک مجھے مہلت ملی تو ہم حج بھی کریں گے' ورنہ آپ دونوں تو حج ضرور کرنا۔"
وہ لرز اٹھے "کانپ گئے۔
"کیسی باتیں کرتی ہے میری جان!" حمیرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔
"میں نے راتیں جاگ جاگ کر اللہ سے تیری زندگی مانگی ہے' تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"
وہ ماں کو گلے لگا کر تھپتھپاتی رہی۔ اپنے وجود سے دلاسا دیتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ سفید احرام میں بہت مشکل سے خانہ کعبہ کے غلاف تک پہنچی تھی۔ وہ اپنی ایڑیاں اوپر اٹھا کر غلاف تک پہنچنا چاہ رہی تھی۔ پاؤں کی انگلیوں اور انگوٹھوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر ہر حالت میں غلاف کعبہ کو پکڑنا چاہ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ غلاف سے مس ہو رہا تھا۔ اس

کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"تو وہ خدا ہے، جس کو اسّی سال تک بت کی پوجا کرتے بت پرست نے بھول کر یاصنم سے یاصمد کہا تھا اور تو نے فوراً جواب دیا تھا۔

"لبیک یا عبد، میں حاضر ہوں میرے بندے!" اور ملائکہ نے کہا۔ "مولا! اس نے اسی سال تک یاصنم کہا ہے۔ بوڑھا ہو گیا ہے، اونگھ آگئی ہے۔ تب ہی غلطی سے یاصمد پکار بیٹھا ہے، تجھے نہیں پکارا۔ غلطی سے کہہ بیٹھا ہے۔ تو پھر بھی جواب دے رہا ہے اور تو نے فرشتوں کو کہا تھا۔ "پھر مجھ میں اور اس بت میں کیا فرق رہ جائے گا۔ جس نے اسّی سال تک اسے جواب نہیں دیا۔"

میں اکیسویں صدی کی ذہنی بت پرست ہوں مالک یاصنم کہنے والی، سالوں تک صنم صنم کرتے، عمر کی ساری پونجی لٹا کر اب صنم سے سر یاد آیا ہے اور صمد اتنا مہربان، اتنا رحیم، اتنا کریم، شکوہ نہیں کرتا، طعنہ نہیں دیتا، دھتکارتا نہیں۔

اپنے در سے لوٹاتا نہیں۔ فوراً جواب بلکہ تھام لیتا ہے۔

بے شک یہی تیری شان ہے۔
یہی تیرا ظرف ہے۔
کوئی پلٹے تو تیری جانب
اور میں حیا حسین پلٹ آئی ہوں تیری جانب
مجھے اپنا لے
مجھے سکون دے
مجھے راحت دے اپنے ذکر میں۔
مجھے معروف کر اپنی فکر میں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ با آواز بلند دعا مانگ رہی تھی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

اس کے دل پر سکون کا نزول ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو رب کعبہ کو سونپ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر لیٹ آیا تھا۔ چینج کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔ بیٹی کے کمرے میں گیا۔ اس کو پیار کر کے چادر ٹھیک سے اوڑھائی، اپنے کمرے میں گیا تو ماہم سو چکی تھی۔

کتنی پرسکون نیند تھی۔ زندگی کتنی مطمئن اور پرسکون ہے اس کی سنگت میں۔ اسے ماہم پر پیار آرہا تھا۔

وہ چادر چینج کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا جب میسج ٹون بجی، اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جمائی لیتے ہوئے موبائل اٹھایا۔

حیا کا نام اسکرین پر دیکھ کر ناگواری تو ضرور ہوئی مگر کافی عرصے بعد اس کا میسج آیا تھا۔ پڑھے بغیر رہ نہیں پایا۔

سارے جھگڑے تھے، زندگانی کے انہیں
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا
"زندگی جو میری آنکھوں میں بستی تھی آنکھوں میں ہی ہے۔ اب آخری بار ملنے کے لیے آجاؤ، نہیں حسرت دیدار رہ جائے گی۔"

"مکرو فریب تو تم لوگوں کی ذات سے منسلک ہے۔ پھر کوئی نیا ڈرامہ کیا ہے؟"

اس نے جواب دے کر فون رکھا تھا کہ اس کا میسج پھر آیا سو وہ پڑھنے سے رہ نہیں پایا۔

"محبت ہم جیسوں کے لیے روح کی تکمیل ہوتی ہے۔ تمہیں کیا پتا منتظر حسنین! تم کیا جانو، ہم کو تو گریباں نے جہلتا معلوم کے خزانے سے کیسے نیسے موتی چنے اور محبت کے خزینے پائے۔ اب محبت مجھے تہجد پڑھنے والے کی طرح اطمینان قلب مہیا کرتی ہے۔"

اس کے پاس اس کے میسج کا کوئی جواب نہ تھا۔ دل ہی دل میں خود کو کوسا، جو اس کے میسج کا جواب دے دیا۔ شاید یہی وہ چاہتی ہے۔ نیند آئی تو بڑی مشکل سے۔

اس کے دوسرے میسج کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ سو ایک گھنٹے تک بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔

سر شدید درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ تھکن ہاتھوں' ٹانگوں پورے وجود میں اتر گئی۔ وہ بیڈ سے اٹھی' چین کھلی اور وہیں کمرے میں ٹہلنے لگی۔

دس سال اتنی لمبی' اتنی کڑی ریاضت۔ کیا پایا' وہ آج بھی وہیں کھڑی تھی۔ اسے لگا' یہ دس سال کا سفر پاتال کا سفر تھا۔ عروج کا نہیں زوال کا سفر' جہاں وہ غروب ہو گئی۔

جتنا اس کی چاہت کی دلدل سے اٹھنا چاہا' اتنا ہی دھنستی چلی گئی۔

تھکاوٹ اس کی رگوں سے گزر کر دل کے اندر پہنچ گئی۔ اس نے کئی بار سوچا' عشق طلب سے ماورا ہے۔ محبت میں لین دین کا کوئی سلسلہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ محبت تو دین ہی دین ہے۔ مگر اب تھک گئی تھی۔ دس سال اس نے صرف دیا تھا۔ لیا کچھ نہیں' اس کا پیالہ چھوٹی محرومیوں' نفرت اور دھتکار سے بھری ہوئی تھی۔

وہ اس اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر سے پھسلتے چلے گئے۔ بخار کم ہو گیا ضرور تھا۔ مگر وہ گھبرائی' بے چینی سے اٹھ کر اسے کسی پل چین و قرار نہیں تھا۔ اپنے بیڈ روم میں چکراتی رہی۔

منظر جاند پر بیٹھا تھا اور اصیل گیلا۔ ناقابل تغیر تھا۔ وہ چکور کی طرح چکراتی رہی چکور سے لگ رہا تھا۔ وہ اس کے گرد چکرا چکرا کر مر جائے گی۔

وہ رات کے صبح بھول چکا تھا۔ ناشتہ کر کے آفس پہنچا۔ ایک اہم کاروباری وفد سے ملاقات تھی۔ اس معاہدے کو حتمی شکل دے کر میٹنگ روم سے آفس میں آیا تو بیرسٹر وقار احمد کو موجود پایا' مصافحہ کر کے انہوں نے اس کے سامنے ایک فائل رکھی۔

"حیا بی بی بیمار ہو کر ہاسپٹلائز ہو گئی ہیں۔ یہ وصیت نامہ ہے ان کا۔ انہوں نے اپنے حصے کی جائیداد کا کچھ حصہ آپ کی بیٹی مریم فاطمہ کے نام کر دیا ہے اور اکاؤنٹ میں ان کے حصے کی جو رقم بچتی ہے حیا فاؤنڈیشن کو ڈونیٹ کی ہے۔ ایک اور اہم بات' جب تک ان کے والدین حیات رہیں گے تب تک وہ حیا فاؤنڈیشن کے چیئرمین رہیں گے۔ ان کی وفات کے بعد بورڈ آف گورنرز کی سربراہی مریم فاطمہ کریں گی اگر وہ بالغ ہو گئیں' ورنہ ان کی بلوغت و تعلیم مکمل ہونے تک یہ ذمہ داری آپ نبھائیں گے۔

اور سب سے اہم اور خاص بات حسین رضا اور حیا حسین کے نام باقی جو جائیداد ہے۔ وہ حیا فاؤنڈیشن کو ڈونیٹ کرا دی گئی ہے۔"

بیرسٹر صاحب اور کیا کچھ کہتے رہے۔ اس کی سوئی ان کے اس جملے پر اٹک گئی تھی۔ "حیا بیمار ہو کر ہاسپٹلائز ہو گئی ہے۔"

اس سے آگے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں کب وقار صاحب گئے۔

دل میں ایک انوکھی سی کسک نے سر اٹھایا تھا۔

"میں تو اس سے محبت نہیں نفرت کرتا تھا پھر کیوں اس کی بیماری نے پریشان کر دیا؟"

وہ حسب معمول گھر گیا ماہم کے ساتھ شام کی چائے پی۔ لان میں مریم کو کھیلتے دیکھتا رہا۔ ماہم سے باتیں کر کے اپنا دھیان بٹانا چاہا۔

"آپ کی طبیعت تو صحیح ہے؟" ماہم نے اس کی بے ربط' بے دھیان سی گفتگو سے اندازہ لگایا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ریسٹ کر لیں۔ کام کی اتنی ٹینشن لیتے ہیں تاکہ اپنا خیال رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" وہ خاموش رہا۔ مگر اندر اندر "حیا ہاسپٹلائز ہو گئی ہے۔" کی گونج جاری تھی۔ ماہم نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے لاؤنج سے اٹھایا اور بیڈ روم میں لے گئی۔

"پلیز۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔" اور وہ اس کے کہنے پر بچوں کی طرح آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ ماہم آہستہ سے دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئی۔ اس نے چٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے دل کے اندر دھڑکنوں سے بھی ایک ہی آواز آ رہی تھی' حیا بیمار ہو گئی ہے۔

ہر طرف یہی شور تھا۔

حیا بیمار ہو گئی ہے۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ یہ اچانک کیسی بے چینی نے اسے آن گھیرا تھا۔ اس کے دل سے آواز اٹھی اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اسے حیا کے پاس ہونا چاہیے۔ وہ اپنی اس خواہش پر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا' وہاں نفرت نہیں۔ اس کی جگہ ہمدردی مقیم ہو گئی تھی۔ وہ اس ہمدردی کو محبت کا نام دینے سے ڈر رہا تھا۔ میں بھلا کیسے اس سے محبت کر سکتا ہوں۔ وہ میرے والدین کے قاتلوں کی اولاد ہے۔ مگر وہ حیران رہ گیا۔ جب دل نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ دل تو اس وقت کچھ بھی نہیں سوچنا چاہ رہا تھا۔ اس وقت اسے صرف حیا حسین یاد تھی۔ جس نے اسے چاہا۔ اس سے ٹوٹ کر محبت کی۔ اتنی ٹوٹ کر کہ وہ خود ٹوٹ گئی۔ اس نے سیل فون اٹھایا۔ حیا کے نمبر پر کال کی۔ فون پر جواب موصول نہیں ہوا۔ اس نے ہیر سروقار سے فون پر اسپتال کا نام پوچھا۔

گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ناظم نے پوچھا۔ وہ اسے حیران ہی چھوڑ کر چلا آیا۔ اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' کسی سے کوئی بات کرنے کو۔

☆ ☆ ☆

"کوئی مجھ سے یہ ساری جائیداد' ساری دولت لے جائے' مجھے میری بچی کی زندگی دے دے۔ میں سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔" حسین رضا کسی سے کہہ رہے تھے۔ اس نے اک نظر اس ٹوٹے ہوئے شخص کو دیکھا۔

انہوں نے اسے روکا نہیں' نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہیں سال تک انتقام لیتے لیتے نفرت کا جذبہ کہیں سرد ہو گیا تھا۔ ایک انسان بھلا کتنی نفرت کر سکتا ہے۔ جبکہ یہاں تو بندہ محبت سے بھی تھک جاتا ہے۔ وہ بھی نفرت کرتے تھک گیا تھا اور وہ کیسی لڑکی تھی۔ جو نفرت پا کر بھی نہ تھکی' وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ جب حیرین باہر نکلی۔ وہ عین دروازے کے بیچ کھڑی تھی اور غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ بیماری دینے والے بھی آپ ہی ہیں۔ یاد ہے اپنا وہ ستم' دھکا دے کر نیل کے کونے پر گرایا تھا۔ تب تو صرف درد دل ہوا تھا' پھر یہ ناسور بن گیا۔ اس کی جان کل۔"

اس کے پیروں تلے سے زمین سرک رہی تھی۔ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ اتنی اک چھوٹی سی غلطی' اتنا بڑا ناسور' میں بھی قاتلوں کی صف میں آ کھڑا ہوا۔ ہوا میں معلق ہو رہا تھا۔

"سب سے بڑے قاتل تم ہو ظالم انسان!" حیرین کا غصہ اسے غصہ نہیں دلا رہا تھا وہ اسے حق بجانب تصور کر رہا تھا۔ اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو ایک لفظ بھی نہ تھا۔

حسین رضا نے بڑھ کر حیرین کو بازو سے پکڑ کر آگے سے ہٹایا۔ اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ سامنے بیڈ پر لیٹی تھی۔ بہت کمزور' نحیف' وہ جب آخری بار سمندر پر ملا تھا۔ تب تو وہ ٹھیک تھی اچانک ان دو سالوں میں کیا ہو گیا تھا۔

اس نے چپل کی آواز پر اس طرف دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ کسی مجرم کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اس کے قریب آیا۔

"مجھے یقین تھا منتظر حسین! تم ضرور آؤ گے۔"

اس کی آواز لرز رہی تھی۔ خوشی سے یا غم سے' وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ بمشکل ایک جملہ بول پایا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ منتظر حسین کا عکس دھندلا پڑا تھا۔

"دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی' مدھم آواز میں شگفتگی جھلکتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی ہمت مجتمع کرنے میں دقت ہو گی۔

"تم۔۔۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

سب سر بسر فریب ہیں' کیا ان کا اعتبار
حسن و عشق جوانی محبتیں
اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ صرف موت ہے۔" اس کے لبوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ ابھری۔

وہ بیڈ پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس پر جھکا۔

"تم تو سراپا محبت ہو اور محبت حیات کی نوید ہے۔"

حیا حسنین چند لمحوں تک اپنے اوپر جھکے خضر حسنین کی آنکھوں میں اپنا مرجھایا ہوا عکس دیکھتی رہی۔

موت کیا ہے؟ اک لفظ بے معنی
جس کو مارا' زندگی نے مارا

لبوں نے جنبش کی اور خضر حسنین کے پیروں تلے سے ایک بار پھر زمین سرک گئی۔ وہ ڈھارس دینے میں ناکام ہو گیا۔ اس کی سانسوں پر محیط تڑپتی دھتکاریں' بھوت بن کر اس کے اردگرد ناچنے لگیں۔

حیا کی موندی ہوئی آنکھوں کے کونے سے ایک بے آسرا آنسو نکل کر تکیے میں گم ہوا۔ خضر حسنین کے گرد پچھتاووں کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔

❁ ❁ ❁

"وہ گل اپنا نصیب نہیں ہار گیا ہے گا اس کے ساتھ۔" مہرین تڑپ رہی تھی۔

"کچھ نہیں کرے گا وہ۔ میں نے آج اس کے اٹھتے قدموں سے جان لیا ہے۔ آج وہ جیتا ہوا نہیں' جتنی بڑی ہار ہارا ہوا لگ رہا ہے۔"

اسی وقت وہ باہر نکلا تھا۔ مہرین فوراً" کمرے کے اندر گئی۔

حیا اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

"دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ وہ ہار جائے گا میری محبت سے۔" سوال کا جواب تھا اور آیا۔

"اسے ہارنا ہی تھا۔ نفرت محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہار جاتی ہے۔" اس نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

"السلام مہرین!" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔ "رات میں نے پہلی بار اسے بھول کر اللہ کو پکارا تھا اور اللہ نے اسے سارے کا سارا میری طرف پھیر دیا۔ اللہ کتنا کریم ہے نا۔"

"ہاں بے شک اللہ بہت بڑا کریم ہے۔" مہرین نے بھیگی آواز میں جواب دیا۔

"مہرین!" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔ حیرانگی' تجسس اور خوشی۔ "میں نے پہلی بار اس محبت کو محسوس کیا ہے جو اللہ کو اپنے بندے سے ہے۔" اللہ کتنا کریم ہے نا۔"

ان کا چہرہ مسکرا رہا تھا اس کی آنکھوں میں اس محبت کی عجیب روشنی چمک رہی تھی۔ "آج میں نے اس کی آنکھوں میں وہ محبت دیکھی جو دس سال سے خود بخود پنپ رہی ہو۔"

"تمہیں یقین نہیں آ رہا کیا؟" اس نے مہرین کو بے یقینی سے ضبط کرتے دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے یقین ہے۔" مہرین نے اپنے بے اختیار بہنے والے آنسوؤں کو فوراً" ہاتھ کی پشت سے پونچھا۔

"میں نے سمجھ لیا نہیں۔" اس نے فوراً" نفی میں سر کو جنبش دی۔ "تمہیں۔ میں نے نہیں سمجھا اس نے اپنے فضل سے مجھے سمجھایا' میرے دل پر الہام کیا کہ سب "اس" کے ہو جاتے ہیں جو صرف "اس" کا ہو جاتا ہے۔"

حیا نے "اس کا" پر ہاتھ کی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی تھی۔

"اس کی محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

جو دنیا کی طرف دوڑا' وہ ناکام' جو خدا کی طرف دوڑا وہ کامیاب دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

❁ ❁ ❁

وہاں کاریڈور میں سب تھے سوائے عمیرا کے اس کی ہمت نہیں پڑی پوچھنے کی شاید دل یہ برداشت نہیں کر سکتی۔

"کیوں بیٹھے ہیں آپ یہاں' ہمارے ضبط کا امتحان

لینے؟" میرین ایک بار پھر آئینہ بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ میری بیوی ہے۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

"اور یہ بات دس سال بعد آپ کو یاد آئی ہے؟" طنزیہ لہجے پر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وہ اٹھ کر باہر آیا' مگر اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ گھر جائے' پارکنگ ایریا میں اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔

ماہم کے فون پر فون آرہے تھے۔ اس نے جھنجلا کر سیل آف کر دیا۔ سر کار کی سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ اسے کسی پل چین نہ تھا' بار بار آنکھیں بھیگ جاتیں' اس کی نیند' بھوک سب اڑ چکی تھی' ندامت سی ندامت تھی۔

"تم نے تو اس بے گناہ سے معافی بھی نہیں مانگی غضنفر حسین!"

ضمیر نے ملامت کی' اس کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی' وہ فوراً" باہر نکلا۔ گاڑی کو لاک بھی نہیں کیا' سیل بھی نہیں اٹھایا' تیز تیز قدم اٹھا کر اندر آیا۔ اس کے بیڈ کے گرد ڈاکٹرز کھڑے تھے۔

"پلیز۔ آپ باہر جائیں۔" ڈاکٹر نے اس سے درخواست کی۔

"پلیز ایک منٹ!" اس نے ڈاکٹر سے منت میں اجازت چاہی۔ وہ اس پر جھکا' اس وقت اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ سانس بہت تیز تیز چل رہی تھی۔

"حیا! مجھے معاف کر دو' اللہ کے لیے مجھے معاف کر دو۔" وہ رو پڑا۔

ڈاکٹر نے اسے بیڈ سے دور کیا۔ اس نے دیکھا' وہ سب وہاں موجود تھے مگر کوئی آنسو بہا رہے تھے۔

ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ غضنفر کے دل میں اس کے لیے محبت کا سمندر موجزن ہو رہا تھا' اس کی اکھڑتی سانسیں اس کے دل کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔

وہ اپنے اس احساس کو مرنے والی سے ہمدردی کا نام قطعی نہیں دے سکتا تھا۔

"یہ ہمدردی نہیں ہے۔" اس کے دل کی ہر دھڑکن اعتراف کر رہی تھی۔ اس کی بے پناہ چاہت کا۔

وقت کی پرواز بہت تیز تھی۔ اور غضنفر کے ہاتھ میں ناپید ایسا جال' ڈور ناپید جس سے وہ وقت کو باندھتا' روکتا۔

ایسے طلسم و سحر و وظیفے سے بھی یکسر ناواقف تھا' وہ اس لیے خود کو بے تحاشا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

انسان کتنا مجبور و لاچار ہے' کسی بھی بات' وقت' حالات حتیٰ کہ اپنے دل' احساسات اور آنسوؤں پر بھی اس کا بس نہیں چلتا' اس سے اس نے جانا' انسان کی بذات خود کوئی وقعت' حیثیت' حاکمیت نہیں' وہ صرف مجبور محض ہے۔

اس سے تو اپنے دل پر بھی کنٹرول نہیں ہے۔ تب اس نے اس کی سانسوں کے ساتھ اپنے ڈوبتے دل کو اتھاہ تاریکیوں میں محسوس کیا۔

رات اس کے ہاتھ سے پھسلتی تھی' اور وہ رات کے ساتھ' حیا کو بھی پکڑنے میں ناکام ثابت ہوا۔ وہ دور نکل گئی۔

جان ہی دے دی' جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

"تمہارے ہاتھوں کا کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ حیا جب اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے' تو میں ہر نوالے کے ساتھ اس کا ہاتھ چومتی ہوں۔ اللہ نے پتا نہیں ہماری کس نیکی کا صلہ دیا ہے' ایسی اچھی بیٹی دے کر۔ اللہ کرے وہ ٹھیک ہو جائے' رات فون پر بات ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی' اماں بہت جلد سری لنکا سے آنکھیں ڈونیٹ ہوں گی۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے۔ آپ کے آپریشن کے لیے۔ میں نے کہا' جب آنکھوں کا آپریشن ہوگا' تو سب سے پہلے تمہیں دیکھوں گی۔ میری بچی تو وہ ہے' اللہ اسے صحت و تندرستی سے نوازے۔ بڑی دعائیں ہیں غریبوں کی اسے۔ تم سن رہی ہو سکینہ!"

"جی سی۔ بیگم صاحبہ!" سکینہ نے ہچکی روکتے

ہوئے کہا۔

"ناشتا کرلیں جی! پھر دوائی بھی لینی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر دوائی کھانے کے بعد حیا کا نمبر ملا کر دینا' پتا نہیں کیوں رات سے دل ڈوب رہا ہے' تو اس کی آواز سنوں گی تو قرار آئے گا' ماں ہوں نا' آخر اس کو کچھ ہوتا ہے' طبیعت بگڑتی ہے تو میرا دل خود بخود ڈوبنے لگتا ہے۔

سکینہ! تمہیں پتا ہے نا' سن رہی ہو نا میری باتیں۔"

"جی جی بیگم صاحب!" سکینہ نے اپنے خاموش آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آج پتا نہیں کیا بات ہے۔ حلق میں نوالے پھنس رہے ہیں۔ شاید اندرونی بخار ہے' یاد ہے اور صبح حسین سے بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے "حیا سوئی ہے تم ناشتا کرلو' پھر بات کرواؤں گا' اب دیکھو کیسے شرارتیں باندھتے ہیں' یہ باپ بیٹی۔" وہ حیا کا تصور کر کے ہنسیں۔

"پتا ہے سکینہ' یہ ان باپ بیٹی کی عادت ہے' حیا جب چھوٹی ہوتی تھی مجھے اگر بخار ہو جاتا اور کھانا اچھا نہ لگتا' تو یہ دونوں بھی کھانا نہیں کھاتے' کہتے تم کھاؤ گی تو ہم بھی کھائیں گے' ورنہ نہیں اور حیا باپ کی ان میں ہاں ملاتی' بدتمیز آج بھی مجھے تنگ کرتا' اچھا نہیں لگ رہا' اگر حسین سے وعدہ کرچکی ہوں کیا کروں۔" وہ چند نوالے کھا کر رک گئیں۔

"بس اب اور نہیں۔" اس نے ٹرالی کو اپنے آگے سے ہٹایا۔

"بیگم صاحب ٹیبلٹ!" اس نے ان کے ہاتھ پر ٹیبلٹ رکھ کر دوسرے میں پانی کا گلاس تھمایا۔

"یہ تمہاری آواز کو کیا ہوگیا ہے گلا خراب ہے کیا؟"

اسی وقت ایمبولینس آکر رکی۔ سکینہ زور زور سے رونے لگی۔

باہر ٹینٹ لگ چکے تھے مہمان آرہے تھے۔

"کیا ہوا سکینہ؟" ان کا دل ہول گیا۔

"حیا بی بی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔" سکینہ نے ہچکیوں کے درمیان بات مکمل کی۔

"نہیں۔ نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے' حیا مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ نہیں نہیں حیا نہیں مرسکتی۔"

سکینہ ان کی وہیل چیئر دھکیل کر ہال میں لے آئی۔

"حیا مرگئی۔"

الٹتی سسکیوں نے اسے یقین دلادیا۔

وہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھیں اس کے ہاتھ حیا کے مردہ چہرے کا لمس محسوس کررہے تھے۔

"حیا! اٹھو بیٹا! مجھے زندہ درگور تو نہ کرو' حیا کچھ تو بولو میری جان! مجھے تمہارے ہاتھ کے سوا کھانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

حیا ان کی کسی پکار و سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی' وہ اپنا سر پکڑ کر رونے لگیں۔

"پاپا! یہ کیا ہوگیا؟"

"آنٹی پلیز جان! صبر کریں۔ صبر کریں۔" عمرین اس کو پکار زار و قطار رونے لگی۔ اس نے تڑپ کر عمرین کے ہاتھ پکڑے۔

"حیا نہیں مرسکتی' حیا نہیں مرسکتی۔" وہ بھول گئی تھیں کہ حیا تو اس دن مرگئی تھی۔ جب ان کے دیدوں کا پانی مرگیا' سوکھ گیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے شوہر کو مار دیا تھا۔ ان کی اندھی آنکھیں حیا کا آخری دیدار کرنے سے قاصر تھیں۔ اس نادیار خنجر سمیت سب کو رحم آرہا تھا۔ مگر ان کی مدد کرنے سے لاچار و مجبور سب بے بس ان کی ساری کوتاہیوں کی نشانیاں بن کے ان کے جسم پر رینگنے لگے۔ ان کے کیے ظلم اس کے سامنے ایستادہ تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگے' اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی نازوں پلی بیٹی کو مٹی میں دفن کیا تھا۔

ہم اپنے نفس کی نگہبانی نہ کرسکے۔ اب دریدہ دامن لیے حسرت و ندامت کا ہاتھ ملتے ہیں۔

مجھے سے ذائقہ گیا' دولت سے مسرت گئی

وحشت ہے۔ جو آنکھوں پر پھیرے رہتی ہے کب زندگی کے باقی ماندہ دن گزر گئے۔ کب آنسو خاک ہوں گے یا وہاں بھی آنسو ہماری منتظر ہوں گی۔ ہم اندھا دھند جائز و ناجائز، حرام و حلال کی تفریق کیے بغیر اپنی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے رہے۔

ہماری اندھی خواہشوں کے اندھے راستوں نے ہمارے گھر کی اکلوتی شمع کو بجھا دیا۔

کاش۔ کاش اس دن میں اپنے بھائی سے جائیداد کا حصہ لینے نہ جاتا۔ اتنی دولت نے کون سی خوشی دے دی۔ انسان بھلا کتنا کھا سکتا ہے۔ کتنا لٹا سکتا ہے۔ یہ بہت زیادہ تھی۔ میرے لیے میری بیٹی، بیوی ساری عمر عیش کرتی رہتی تب بھی کم نہ پڑتی اور اب تو بیٹی بھی نہیں۔

ہم نے روایات کے چکر میں مذہب کو بھلا دیا۔ اسی لیے اسلام نے دیور بھابھی کا بھی پردہ کروا دیا۔ نامحرم کے ساتھ تنہائی کو منع کیا۔

یہ کتنا آسان تھا اگر ہمارا معاشرہ رسم و رواج اور روایتوں کی زنجیر میں نہ جکڑا ہوتا۔

اگر شادی سے پہلے حمیرا سے رضامندی پوچھ لی جاتی۔

اگر معاشرہ اسے طلاق لے کر پسند کی شادی کرنے کی اجازت دیتا۔

نہ وہ ڈرامہ کرتی نہ وہ قاتل ٹھہرتی۔ اپنی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لیے اسے ایسے گھناؤنے کام نہ کرنے پڑتے۔

طلاق کو ناپسندیدہ فعل ہونے کے باوجود جائز قرار دیا گیا ہے ایسے ہی ناپاک گناہوں کو دور کرنے کی خاطر۔

چور دروازے بند کرنے کی خاطر اسلام نے ہر جائز دروازہ فطرت انسان کی کمزوری کی بنا پر کھلا رکھا ہے اس لیے یہ محض رسم و رواج کا مذہب نہیں۔

پورا ضابطہ حیات اور دین فطرت ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ تو صرف مجھ سے ہی نہیں، مگر میری خوشبو میری پرچھائیوں سے بھی محبت کرتی تھی، وہ میرے انتقام کی

بھینٹ چڑھ گئی۔

جو گفارہ بنی کسی گناہ کا، وہ مجھے گناہ گار کر گئی۔

وہ جس کا وجود آنکھوں کی لالی، سوہنا سراپا سب محبت تھی۔

میں نے اس کو الٹ دیا۔

لبوں کی لالی کو آنکھوں کی لالی میں بدل دیا۔

دل کو مسلا اس کے سراپے پر نفرت کا داغ لگا۔ مگر اس کے باوجود وہ خوب صورت ہی رہی۔ کملا مرجھا کر بھی۔

بس میں ہی کور چشم رہا۔

وہ کس سے محبت کرتا اپنے دل سے جو ماتم زدہ تھا۔

اپنے ان شفیق رشتوں سے جنہوں نے ماضی کا کوئی شائبہ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا ہمیشہ محبت و شفقت سے پیش آئے۔

وہ چار دن بعد گھر آیا تھا، وہاں اس کی خبر دیر سے ملی نے کہرام مچایا ہوا تھا۔

"غضب خدا کا، وہ اس کے سوگ میں حسین رضا کے ہاں بیٹھا ہوا ہے۔" حمید کا غصہ تو کسی طور کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔

وہ آیا تو وہ پھر کھانا میز پر لگ چکا تھا۔

"آیئے کھانا کھا لیں۔" گو کہ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور حلیہ دیکھ کر ان کو دھچکا ضرور لگا تھا مگر اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم اس کا غم منا رہے ہو بیٹا! جو تمہارے والدین کے قاتلوں کی بیٹی تھی ہم پہنچا ہوا جو حسین رضا اور حمیرا کو اپنی زندگی میں کیے کی سزا مل گئی تھی کم جہاں پاک۔"

آخری بات نے اس کو بے حد طیش دلا دیا، وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بس کریں ماموں! بہت ہو چکا۔ حمیرا کو سزا مل گئی حسین رضا نے بھی سزا بھگت لی۔ لیکن خضر حسین نے جو کیا ایک بے گناہ کو سزا دی۔ اس کا حساب بھی کہیں درج ہو رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کے بار بار

ذلالت پر بگڑ گئے پر اس سے انتقام لیتا رہا جس کا کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ جو صرف محبت کرنا جانتی تھی ان لوگوں نے جو بھی زندگی کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر جو کیا اس کی تلافی کرنا چاہتی تھی مجھ سے معافی مانگ لی۔ مگر جو میں نے ایک بے گناہ کے ساتھ کیا اس کی کیا تلافی ہے؟ میں کس سے معافی مانگوں یہ سمجھا دیں۔

اصولاً تو میں آپ لوگوں کا خیال رکھ سکتا تھا۔ الگ گھر میں بھی رکھ سکتا تھا۔ آپ کو محبت و عزت سے اور رخشندہ کو بھی بھاری رقم دے سکتا تھا۔ اس کی اور اس کی بیٹی کی زندگی سنوارنے کے لیے اور خود حیا کے ساتھ مطمئن زندگی گزار سکتا تھا۔ اس محبت سے بڑی لڑکی کا کیا قصور تھا۔ جس کو آپ لوگوں کے عیش دلانے پر میں نے ہر طرح سے انتقام کا نشانہ بنایا۔ میں بھی اپنے باپ کی طرح گالوں کا تجاری نکلا۔

آپ دونوں تو اپنا ذاتی انتقام بھی میرے ذریعے لیتے رہے تھے اور مجھے یہ بات سمجھنے میں اتنے سال لگ گئے۔ جب کچھ بھی باقی نہ بچا۔"

وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ طلب آغا ملک بن کر وہاں اس وقت ہوئے۔ ان سب کی لگ رہے تھے۔

"آپ لوگوں نے ماہم کو آگے بڑھایا۔ اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حمیرا نے حسین رضا کو پانے کے لیے جال بچھایا تھا۔ ماہم نے حیا کی دولت اس کے شوہر کو پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اپنی اداؤں سے مجھے محبت کا اسیر کیا۔

حمیرا اور حسین رضا کی سزا پر خوشی منانے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ ماہم اور میری بھی ایک بیٹی ہے اور ایک بے گناہ کو میں بھی قتل کرنے کا مرتکب ہوا ہوں۔ اور اس میں ماہم کی کوشش بھی شامل رہی ہے۔ ہمارے گناہوں کی سزا کس کو ملے گی؟"

ماہم کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ وہ آسمان سے فرش پر آگری۔ وہ جیت کر بھی ہار گئی تھی اور حیا ہار کر بھی جیت گئی تھی۔

اسے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں حیا کی محبت کرم نوازیاں آغا طلحہ خضر کو اس سے چھین نہ لے۔

ایسا ہی ہوا۔ وہ اس کا تھا مگر اب لگتا ہے کہ ایسا تو کبھی بھی نہیں تھا۔ اسے اپنی کم حیثیتی کا ہو نہ ہو ادراک تھا۔ وہ آج کھل کر سامنے آگیا تھا۔ ماہم کو اپنی کم ظرفی کا احساس ہوا تھا اور حیا بہت بلندی پر نظر آئی تھی۔

"کچھ لوگ زندگی میں ہی مر جاتے ہیں اور کچھ لوگ مر کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ حیا مر کر خضر کے دل میں زندہ ہو گئی۔ اور میں اس کی زندگی میں ہو کر بھی اب نہیں رہی ہوں۔"

ماہم نے چپکے سے آنسو پونچھے۔

خضر نے چونکا ان سب کو آئینے میں ان کے چہرے دکھا دیے۔

☼ ☼ ☼

وہ ان سب پر بھڑ آیا تھا ان کے پاس بیٹھا تھا۔

وہ ان کی بیٹی کا قاتل تھا اور وہ اس کے باپ کے قاتل دونوں حساب میں برابر تھے۔

دونوں کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ ایسے مواقع پر دیے بھی ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ نشانی تھی اس بات کی کہ وہ اب ان کے ساتھ رابطہ رکھنے کا خواہش مند ہے اور جو اس کے ساتھ رابطہ رکھنے کی خواہش مند تھی وہ اپنی خواہشوں کے ساتھ منوں مٹی تلے جا سوئی۔

حسین رضا اب بہت کم آفس جاتے ان کی بزنس ڈیلنگز مینیجرز کرتے فائلیں دستخط کے لیے گھر لے آتے۔

ان کا معمول تھا روزانہ کچھ وقت حیا کے کمرے میں گزارتے۔

کچھ دن سے روز اپنی نگرانی میں صفائی کرواتے۔ حیا کے لکھے ہوئے اقتباس پڑھتے روتے اور اللہ سے اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کرتے۔

حیا نے ایک جگہ ڈائری میں لکھا تھا۔

"میں ایک مٹی کے بت کی پوجا کرتی رہی اور خالی ہاتھ رہی۔ واقعی بت کسی کو کچھ نہیں دیتے جیسے ابوجہل اور ابولہب مقصور ٹھہرے۔

محبوب تو مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ میں اس کو منا نہیں پائی مگر میں نہیں چاہتی یااللہ تجھ سے روٹھ جاؤں۔"

وہ لفظ لفظ پڑھتے' روتے۔

کاش میری بیٹی صنم سے صمد تک آجاتی تو اسے اپنی ریاضتوں کا صلہ بارگاہ الٰہی سے لبیک کی صورت ملتا۔

ہائے انسان! ہائے انسان... انا کا مارا ہوا۔

فنا کی طرف جو ٹنے والا سو روتے رہتے۔

"یااللہ تو میری بیٹی پر رحم کر۔ اس کی روح کو شاد رکھ۔ اسے اپنی رحمت سے نواز۔"

وہ حمیرا کی تیمارداری اور دل جوئی کے بعد اپنا زیادہ تر وقت حیا فاؤنڈیشن کے کاموں کی نگرانی میں گزارتے۔ مختلف فلاحی کام کرتے۔

لوگ کہتے کتنے رحم دل ہیں۔ فرشتہ ہیں فرشتہ۔

وہ سن کر شرمندہ ہوجاتے۔ اندر ہی اندر احساس ندامت مار ڈالتا۔ وہ تو ٹھوکر کھا کر سیدھی راہ پر آئے تھے۔ بیٹی کے گناہ کا داغ سینے پر پیوست تھا۔

"یااللہ مجھے معاف کر دے۔ یہ لوگ نہیں جانتے میرا گناہ، پر تو تو ہر گناہ کو جانتا ہے۔ میرے گناہوں سے درگزر فرما۔"

☼ ☼ ☼

وہ اکثر بے قراری سے سمندر کے کنارے آتا۔ بے چینیاں اسے کھینچ کے لے آتیں۔

ماہم کی محبت بے لوث ہوتی تو شاید اسے واپس لے آتی مگر اس کے پیچھے تو دولت حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ بیٹی پر نظر پڑتی تو اپنے گناہ یاد آجاتے۔ ماہم کی طرف بڑھتا تو حیا کا سراپا اس کے سامنے آجاتا۔ یہ ماہم ہی تھی جس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اپنے حسن کی پٹی باندھ دی تھی۔

اس نے اس دن کے بعد ان کو کسی لوز بات کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ لیکن ان سے بہت دور ہوگیا تھا بلکہ خود سے بھی دور ہوگیا۔

وہ اپنی ذات میں بہت تنہا ہوگیا تھا۔ حیا کی باتیں' یادیں پل پل اس کے ساتھ تھیں۔

میں بیں سے گزروں' وہ مجھے یاد آتی ہے

میں کہیں رکوں' وہ مجھے یاد آتی ہے۔

اک لفظ سے اللہ نے کائنات بنائی۔

محبت بھی اک لفظ ہی ہے۔

جس کا نزول کسی بھی قلب پر کائنات باطن سجا دیتا ہے۔

خوشیوں کے گل بوٹے غم کے بھر یاباں ہجر کے صحرا وصل کے دریا بسا دیتی ہے۔

وہ حیا کے سامنے آجاتی ہنستی کھکھلاتی۔

"زندگی میں جو لوگ ایک بار ٹوٹ کر محبت کرلیں' پھر ان کو دوسری محبت کی ضرورت نہیں رہتی۔"

بنی مہلن کا خوش گوار لمحہ اس کے تصور کی اسکرین پر آموجود ہوا۔ مختشم حسنین کی اب سمجھ میں آیا کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تھی ورنہ محبت اس طرح ٹھکرائے جانے والی چیز تو نہیں تھی۔

مجھے چین کیوں نہیں آتا

ایک ہی شخص تھا' جہاں میں کیا

اس کی جدائی کے بعد اس کے بالوں کا رنگ سرمئی ہوگیا۔ اور کنپٹیوں پر سفیدی اگ آئی تھی۔

عمر کی فصل پک چکی اور محبت کے کھیت اجڑ چکے تو وہ عقل کے میدانوں کا شہسوار بنا۔ عقل اسے زمان و مکان کے بیچ لٹکائے رکھتی۔

وہ کبھی محبت کے زمانے میں سانس لیتا۔

کبھی اپنے لٹے پٹے مکان میں قرستار رہتا۔

وہ جو مختشم حسنین تھا۔ مختصر رہ گیا۔

اس کی گھنی گانی پلکوں تلے اداسیوں کے ڈیرے جم گئے۔

"ایک دن آئے گا' جب تم میری محبت سے ہار

جاؤ گے۔"

یاد نے آنکھیں بھگو دیں۔

"وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" اس نے نفرت سے ہنکارا بھرا تھا۔

اس کے کہے لفظ اس کا منہ چڑا رہے تھے' وہ دن آ گئے تھے۔ وہ پورے کا پورا خود کو ہار بیٹھا تھا۔

وہ ہر وقت صرف اس کی محبت کے زمانے میں سانس لے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بظاہر زندگی جاری ہے۔

مگر میری زندگی تو اس کے ساتھ جا سوئی ہے۔

میں اس کے بعد ہنسا۔ مگر دل سے نہیں۔ کھایا پیا بچوں بیوی کے ساتھ آؤٹنگ 'میل ملاپ' بزنس سرکل میں اٹھا بیٹھا۔

سب ہو رہا ہے' مگر صرف دنیا کو یقین دلانے کو کہ میں زندہ ہوں۔ میری موت سے صرف میں ہی واقف ہوں۔ میرے اندر بسا اک اندھیرا جہان ہے' جس میں اندھوں کی طرح بھٹکنا میرا مقدر ہے۔

محبت سے منہ موڑنے اور کسی اور کو قصور وار قرار دے کر سزا دینے کی سزا بھگت رہا ہوں۔

اندھیرے غاروں میں بھٹک رہا ہوں

تجھے یاد تو ولائیں

تجھے یاد بھی تو آئیں

کبھی عہد جو کیے تھے

ہمیں قول جو دیے تھے

کبھی کانپتے لبوں سے

کبھی اشک کی زباں میں

کبھی کنج گلستاں میں

کسی کوئے رہرواں میں

کسی دوست کے مکاں میں

تو کہاں چلی گئی تھی

سمندر کی موجیں ابھر کر ساحل کی طرف آتیں پھر واپس تھا پلٹ کر چلی جاتیں۔

منچلے موجوں سے چھیڑ خانی کرتے پھر خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔

تو کہاں چلی گئی تھی۔

تیرا بے قرار انشا

تیری جستجو میں حیراں

تیری یاد میں سلگتا

کبھی بستیوں بنوں میں

کبھی سوئے کوہ صحرا

کبھی شور شیع کرتا

کبھی بے کس و تنہا

لیے دل میں تمنا

یا آرزو سراپا

تجھے ہر جگہ پکارا

تجھے ہر جگہ ڈھونڈ ہارا

تو کہ میری زندگی تھی

تو کہاں چلی گئی تھی

انشا جی کی نظم اسے رلاتی رہی۔ اس نے تھکے ماندے مسافر کی طرح واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے تھے' نہیں۔ وہ بھی ضم سے عدم تک سفر کر پائے گا یا نہیں۔

☼



بی حسن ملک

جھومر والوں

"رضوان۔ تمہاری اور حسنہ کی شادی طے کر دیتے ہیں ہم لوگ۔"

تو یہ خبر تھی یا بم جو میرے سر پر پھٹا تھا۔ دل چاہا "فوراً" جواب دے دوں۔ لیکن کیا کروں اپنی فارن ڈگریوں کا لحاظ کرنا پڑا۔ کیونکہ ابا میاں "فوراً" سے پیشتر الماری سے میرے کاغذات نکلواتے اور جلانے کا حکم صادر فرما دیتے۔ ویسے بھی جب سے میں لندن سے واپس آیا تھا وہ گاہے بگاہے اپنے نادر خیالات مجھ تک پہنچاتے رہتے تھے۔

"بھئی۔ وہ اور لوگ ہوں گے جنہیں اولاد سے زیادہ دھن دولت چاہیے ہوگی۔ ہمیں تو ادب و احترام ہونا چاہیے۔ نافرمان اولاد کو دھکے دے کر گھر سے نکال دینا چاہیے۔ ہاں ان کی ڈگریاں بھی ان کے منہ پر دے مارنی چاہئیں۔ آخر ماں باپ کی محنت اور پیسے سے پڑھے لکھے ہیں۔ جب ان کی عزت نہیں کی جاتی تو ان کی محنت کی ڈگریوں پر بھی کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔"

بھلا ابا میاں کو کیا پتا کہ مجھ سے لائق فائق طالب علم محنتی معنی کتابیں پڑھ کر رات دن ایک کر کے گھر سے دور رہ کر یہ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں تو بھلا اس میں ماں باپ کی محنت کہاں سے آ گئی۔

خیر ابا میاں کو میں یہ سب تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ البتہ اماں کے سامنے اپنا رونا ضرور رو سکتا تھا اور میں رو بھی چکا ہوں۔ جو اماں نے روایتی فلمی ماؤں کی طرح مجھے گلے سے لگایا ہو یا پچکارا ہو نا تھا چاہا ہو۔ اس کے برعکس اماں نے ٹھیک ٹھاک کھری کھری سنا ڈالیں۔ انہیں بھی یہ سب میری ڈگریوں کا فتور لگ رہا تھا۔ ان کے مطابق مغرب کے نافرمان معاشرے کا رنگ چڑھا ہوا تھا مجھ پر۔ سوچ سوچ کر میرا دل ہول رہا تھا۔ اصل میں حسنہ میری اماں کی بھانجی ہے۔ ہوگی کوئی بیس اکیس سال کی۔ دیکھے ہوئے تو اسے اک عرصہ گزر گیا۔ سو شکل و صورت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن حسنہ کے تصور سے ذہن کے پردے پر ایک چودہ پندرہ سال کی موٹی سی لڑکی۔ جس کے ایک ہاتھ میں آلو کا پراٹھا، میرا مطلب ہے کلفی جو اس وقت ایک روپے کی ملتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں رومال سے ملتی جلتی کوئی چیز ہمہ وقت ناک پونچھنے کے لیے ہوتی تھی۔ کی شبیہ لہراتی تھی۔ وہ گلا پھاڑ کر چلاتی تھی کہ الامان۔ بال اس کے چڑیا کے گھونسلے جیسے تھے۔ باقی اس کے بارے میں کچھ خاص یاد نہیں۔

میں نے اماں سے اس ناانصافی کی وجہ پوچھی تھی کہ اتنا پڑھا لکھا کر اگر قربانی ہی کرنی تھی تو پانچ دس سال پہلے بتا دیتے۔ لندن میں دو چار گوریوں سے عشق لڑا کر میں بھی عرف عام میں خوش ہو جاتا۔ خیر وہ وقت تو گیا۔ اماں کا کہنا تھا بچپن سب کا ویسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اماں نے میرے بچپنے کی تعریف میں چند ایک ٹھیک ٹھاک کلمات کہے تھے جو بوجہ شرم و شرمندگی لکھنے سے قاصر ہوں۔ بچپن سے مجھے ثمرہ یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی میری کزن ہی تھی۔ خالہ زاد ثمرہ مجھے شروع سے پسند تھی۔ گورنمنٹ اسکولوں کی ٹھسڑوں سی ٹیچرز کی طرح ناک چڑھی اور مغرور نہ مٹی میں گھسیٹتی تھی نہ کھانے کے اوقات کے علاوہ کھاتی تھی۔ صاف ستھری اور نفیس طبیعت والی۔

اماں سے دبے لفظوں کہا بھی تھا کہ نمونہ سمجھی کی۔ لیکن لڑکی کم از کم اس کے جیسی عادات و اطوار والی دیکھیں ہیں۔ لیکن اماں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا۔

"اگر یہی کام میں کروں تو نالائق' نافرمان اور پتا نہیں کیا کیا کہوں۔ کتنے دوغلے ہوتے ہیں نا یہ اصول بھی۔"

آج کل اماں اور ابا میاں نے میری زندگی برباد کرنے کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے۔ اس پر عمل درآمد کروانے کے لیے ماموں کے گھر جانے کا سوچ رہے ہیں۔ تاکہ ضابطہ کارروائی عمل میں لا سکیں۔

کیا تھا اگر میں پاکستان میں ہی رہتا۔ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا احساس تو کم ہوتا کہ چلو جی میری اوقات ہی یہی ہے۔ لیکن اب۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ لڑکیاں اکثر روتی کیوں رہتی ہیں۔ ہر معاملے میں جب دل مارنا پڑے تو پھر رونا ہی آتا ہے نا۔

"رضوان یہ قلی کے لونے سے جو آپ نے پہن رکھا ہو اور لعنت تو لے آؤ زرک"

"اماں۔" میری احتجاجی آواز اتنی زور دار تھی کہ مجھے لگا میں نے کچھ زیادہ ہی کہہ دیا ہو جیسے۔

"پہلے یہ سلمان مجھ سے بات کرتا ہے بدزبان۔" اماں نے سر سے پاؤں تک مجھے گھورا۔ جیسے مجھے لگا میری شرٹ پتلون پھٹی ہے۔ جس سے جو اماں کے تاثرات ایسے ہو رہے ہیں۔ "انگریز آکر ڈھنگ کے کپڑے پہن لیتا تیرے ماموں آرہے ہیں۔" اماں کے لہجے کی مٹھاس نے میرے حلق میں کونین انڈیل دی تھی۔ مرتے مرتے قدموں سے میں بیٹے کے کمرے میں آگیا۔

ایک تو سزائے موت کی سزا سنا دی۔ دوسرا بیس دن نے کا بھی وقت نہیں دیتے۔ لندن میں جاتے ہیں جیتے بھی رہا۔ لیکن سوچتا تھا واپس پاکستان جاؤں گا تو طرح طرح کی اسٹائلش شرٹس' ٹراؤزرز' جینز پہنوں گا۔ لوگوں کو پتا چلے کہ آخر لڑکا لندن سے پڑھ کر آیا ہے۔ لیکن یہاں آکر تو سب کچھ الٹا ہو گیا۔ جن چیزوں کے شوق ہوتے ہیں ان سے اکثر وہ اماں نے تھی۔ وہ میرے لیے ملنے کا راستہ اختیار کر چکی تھیں۔ میرے کپڑوں پر اماں سے زیادہ ابا میاں کو اعتراض تھا۔ جنہوں نے ایک بیٹے سے کم از کم بیس ہزار بار "فرنگیوں کا لباس یہودیوں کا پہناوا" کہہ کہہ کر میری بے عزتی کر چکے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنی بے عزتی کے بعد بھی انہیں مجھ سے محبت کا دعویٰ کیسے تھا؟

گلی میں لوگوں کا تانتا بندھ ہوتا تو میں بھی روز تک گھر اٹھنے تک وہی صاحب قدم رنجہ فرما کر میری خوشیوں پر کھولتا پانی انڈیلنے لگتے تھے۔

"شکر ہے آپ کو بچپن میں آرہا ہے۔ ورنہ مسئلہ پھر تھے جب آیا تھا بالکل ہی چھوٹا سا منہ ہو رہا تھا۔" گویا ماموں نے بڑی محبت سے گلے لگا کر یہ ارشاد فرمایا۔ نجانے کیوں مجھے ان کی ہنسی طنزیہ لگی۔ یوں جیسے میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ کون تھا یہاں جو میرا دکھ سمجھتا؟ آج بڑی شدت سے زندگی میں دوستوں کی کمی کا



احساس ہو رہا تھا۔ کوئی دوست ہوتا کوئی غم گسار ہوتا تو میں بھی اپنا حالِ دل کہہ لیتا۔ حالِ دل سے مجھے حالی یاد آگیا۔

مولانا حالی نہیں۔ میر الدین کا دوست حالی۔

دوست ہی ہے۔ وہ میرے خیال سے ورنہ دشمنی تو اس نے ہزار بار دکھائی ہے۔ کرایہ ادا کرنے کے دنوں میں سرے سے ہی غائب ہو جاتا۔ کھانے کا بل دینے کی باری پر اس کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا اور پھر وہ ایسا تو نکلتا جاتا کہ تلیث پر ہی اس سے ملاقات ہوتی۔

کہتے ہیں پتھر بھی پاس رکھا ہو تو کام آجاتا ہے یہ تو پھر انسان تھا۔ پہلی فرصت میں۔ میں نے حالی کو کال ملائی۔ انٹرنیشنل کال تھی۔ اس لیے مختصر لفظوں میں حالتِ زار سنا کر مشورہ مانگا۔

"لڑکیوں میں پہلے عقل کی کمی ہو عزتِ نفس کی کمی نہیں ہوتی' کسی طرح اپنا انکار اس تک پہنچا دے۔ وہ خود ہی انکار کر دے گی۔"

"کمینے۔ اب تو دشمنی سے باز آجا۔ اگر اس عقل کی اندھی نے ابا میاں تک یہ بات پہنچا دی تو لینے کی جگہ جان کا سوال ہو جائے گا میرا۔" میں نے جتایا تھا کہ یہ دشمن نما دوست ہے۔

"لو جی۔" اس نے فوراً بدلہ چکایا۔ "انکار اس طرح کر کہ بعد میں کہ دونوں کے سامنے تم سرخرو اور اگر بالفرض تمہاری اس سے شادی ہوگئی تو تم اس کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دو گے وغیرہ وغیرہ۔" میرا دل عش عش کر اٹھا میری صحبت کا اثر رنگ لے ہی آیا کہ حالی عقل مندانہ باتیں کرنے لگا تھا۔

اب میں اس تاک میں تھا کہ کہیں سے ان محترمہ کا فون نمبر مل جائے اور میں اپنے دل کی بھڑاس نکالوں۔ برا ہو اس وقت کا جب میرے ماں' باپ ان پڑھ رہ گئے۔ انہوں نے سب کے نمبر انگلش کے حرفوں سے محفوظ کیے تھے۔ آصفہ آنٹی کا "اے" سے عظمیٰ بھابھی کا "یو" سے اور اسی طرح زیڈ تک نمبر محفوظ تھے۔ ایسے میں بھلا اس کا نمبر کہاں سے ڈھونڈتا کر نز سارے ہی سنجیدہ' بردبار' وقت سے پہلے بوڑھے تھے۔

ان سے پوچھنا عبث تھا۔ اتوار کو اماں اور ابا میاں نے بات ڈالنے جانا تھا اور اب صرف دو دن باقی تھے۔

پہلے کی نسبت میں اب کم پریشان تھا۔ اب میں نے مردانہ وار جا کر آمنے سامنے بات کرنے کی ٹھانی۔ ابھی تک ماموں کے گھر بات نہیں پہنچی تھی۔ سو مجھے "خوش آمدید" کہنا ان کی مجبوری تھی۔ صبح ہی صبح میں نے نہا دھو کر کلف لگا شلوار قمیص پہنا۔ جیل سے بال سیٹ کیے۔ بائیک جو کہ ابا میاں کی ملکیت تھی دھو دھلا کر باہر نکالی اور ایک فرضی دوست سے ملاقات کے بہانے گھر سے نکل آیا۔

لب پہ نئی نئی بولیاں کم ہوتی نہیں ابا میاں کی بائیک کا قصور۔ میں ابھی آدھے رستے ماموں کے گھر کی طرف موڑنے ہی والا تھا کہ کہیں اور جا نکلتی مجھے لگ رہا تھا یہ بائیک نہیں بلکہ ابا میاں کا سدھایا ہوا اڑیل گھوڑا ہے۔ تین گھنٹے شہر کی گلیوں اور بازاروں کی خاک پھانک کر آخر کار میں ماموں کے گھر پہنچ ہی گیا۔ ویسے اگر گھر پتا چلے کہ میں ادھر آیا ہوں تو میری کیا درگت بنے؟ فی الحال اس خوف کو تسلی کی چادر اوڑھا کر سلاتے ہوئے میں بائیک سے نیچے اترا۔ کچی چوڑی سڑک کی بائیں جانب بالوہے کا بڑا گیٹ حسبِ سابق کھلا ہوا تھا۔ چھوٹا سا باغ نما حصہ پار کر کے میں مرکزی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔

دل زور' زور سے چلا رہا تھا۔ اسے ڈپٹ کر چپ کرواتے میں نے گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ' سات' سوا سات' ساڑھے سات' پونے آٹھ' آٹھ' پھر آٹھ' پھر آٹھ' پورے آٹھ' سکے آٹھ۔

اصل میں دل ہی دل میں میں نے سوچ رکھا تھا کہ دس تک گنتی پوری ہوتے ہی میں ادھر سے بھاگ جاؤں گا اور اہلِ خانہ اسے محلے کے کسی بچے کی شرارت گردانیں گے۔ میرے مستقبل کا مسئلہ نہ ہوتا تو کون بیوقوف ادھر کا رخ کرتا۔

"جی کون؟" ایک سریلی سی مترنم۔ آواز مجھے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔

"جی میں رضوان۔"

"کون رضوان؟" اک لمحے کی تاخیر سے جواب آیا تھا۔

"آپ دروازہ تو کھولیں۔"

"اجنبی لوگوں کے لیے اس گھر کے دروازے نہیں کھلا کرتے۔ تعارف کروایئے اپنا۔" اس کے لہجے میں عجیب سی کھنک تھی۔ ہائے! ہو نہیں سکتیں اور سے اور حسنہ؟

"آپ غالباً" حسنہ ہیں۔۔۔ میں آپ کا ہونے والا منگیتر۔ رضوان۔۔۔" اندر مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ویسے منگیتر کی جگہ میں "بکرا" کہنے والا تھا۔

"گھر پر کوئی موجود نہیں۔ آپ کسی اور وقت تشریف لایئے گا۔" اب کی بار آواز کچھ اور دھیمی ہوئی تھی۔

"دیکھیں میں آپ ہی سے بات کرنے آیا ہوں۔ آپ پلیز دروازہ کھولیں۔" اس کی مترنم آواز بھی مجھے میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اپنے تیئں لگا دل کو میں ہر بات ہر دس سیکنڈ بعد بتا رہا تھا۔

"میرا دروازہ کھولنا مناسب نہیں۔" آواز سے لگا تھا کہ ڈرا ہوا جا رہا تھا۔

"شریعت بھی ایک بار آمنے سامنے ہونے کی اجازت دیتی ہے اور پھر یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔" میں کہنے والا تھا دل کا معاملہ ہے رخِ زیبا کی زیارت بخش کر میرا نصیب فروزاں فرمائیں۔ لیکن بروقت زبان پر قابو پالیا۔

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد چوبی منقش دروازہ چرچرا کر کھلا۔۔۔ اس کے ساتھ ہی میرا منہ اور آنکھیں بھی۔۔۔

"واللہ۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی تشبیہ دن رات مجھے خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔

اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں زمین سے چپکی ہوئی تھیں۔ اس کی لرزتی پلکوں پر میرا دل لرزنے لگا تھا۔ ستواں ناک میں نازک سی لونگ چمک رہی تھی۔ اس کے کٹاؤ دار خوب صورت ہونٹوں پر دل کٹ مرنے کو

تیار تھا۔ متناسب سراپا اور خوش قامت۔ اس کی مرمریں گردن شاخِ گل کی طرح جھکی ہوئی تھی۔

"اب آپ جائیں۔۔۔ کسی نے آپ کو ادھر دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔" اس کی آواز میں گویا سات جھرنوں کی ساز تھا۔ میں بالکل ساکت و صامت کھڑا تھا۔ وہ شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن مجھے تو ہوش بھولا ہوا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی یہ نظر میرے انکار کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ کشمیر کی کانچ جیسی شفاف گہری آنکھیں۔۔۔ دل چاہا اماں اور ابا میاں کا مرید ہو جاؤں۔۔۔ میری خاموشی پر سٹپٹا کر وہ اندر چلی گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں ہوش میں آگیا۔ گویا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اک پری کی طرح آئی اور مجھے مسحور کر گئی۔ ابا کی رفرف پر اڑتا ہوا میں گھر پہنچا تھا۔ میرے دل و دماغ پر کامنی کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔

تیرا دن جب ابا میاں اور اماں جا کر بات پکی کر آئے اور کب منگنی کا دن طے۔ انہیں یہ لگ رہا تھا کہ ان کی ضد کے آگے تھک ہار کر میں نے سمجھوتا کر لیا ہے۔ سو میری دلجوئی کے لیے ابا میاں طرح طرح کے وعدے کر رہے تھے۔ سرفہرست میری پسندیدہ گاڑی دلوانے کا وعدہ تھا۔ میں بھی میسنی عورتوں کی طرح دل میں پھوٹتے لڈوؤں کو چھپا کر چہرے پر مظلومیت طاری کیے بیٹھا تھا۔ سب سے مزے کی بات یہ ہوئی کہ ابا میاں فخر سے ہر ایک کو میری ڈگریوں کی تفصیل معہ سعادت مندی فراہم کر رہے تھے۔۔۔

دوسری بار یہ کہ مجھے حسنہ کو یہ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی کہ وہ کسی سے میری آمد کا ذکر نہ کرے۔ کیونکہ وہ بے چاری خود از حد ڈری ہوئی تھی۔

نبیلہ عزیز

مارہ مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں۔ مارہ ایک خوددار اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ نانی کا اس کی حمایت کرتی ہیں۔

فارہ اپنی تمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ وہ سال [illegible] سے بہت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطع تعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منصور خیم اپنی بہن تمینہ خالہ سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً انہیں اکیلا جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کے رویے سے [illegible] ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

مدو، تمینہ اور نیوی کے بھائی رضا حیدر کے دو بیٹے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر [illegible] ہے اور بے حد شاندار شخصیت کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا [illegible] ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان انڈرسٹینڈنگ کمال کی ہے۔ تیمور کے بیٹے سے فارہ کی [illegible] ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں لہو [illegible] ہوتے دیکھ کر اپنے ہوش کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر دور کونے میں لے جاتا ہے۔ پھر اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ مختصر سی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں لے لیتی ہے۔ [illegible] عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور [illegible] چپ چپ رہنے لگتی ہے۔ ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے۔ [illegible] ولید کا ایمان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ تمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ تمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔



اشتیاق یزدانی آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے مگر دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت تیمور کے موبائل سے وڈیو کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو جمد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کرتی ہے۔ ماورا بابی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بابی گل یہ سن کر ششدر رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ ہر بار اسے ناکام کر دیتا۔ تیمور ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات قیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق آدھی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکیج پر جاب کی آفر کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل حجت کرنے کے بعد قبول کر لیتی ہے۔

— ۱۲ —
بارہویں قسط

کراچی ریلوے اسٹیشن پہ بے حد رش تھا۔
طرح طرح کی آوازیں اور طرح طرح کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔
لیکن اس بہت زیادہ رش اور افراتفری کے باوجود عافیہ بیگم چوبیس سال پیچھے چلی گئی تھیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے چوبیس سال پہلے کا وہ کرب ناک منظر تازہ ہو گیا تھا جب بابی گل نے خٹ کھٹ کے روتی عافیہ بیگم کو بڑی مشکلوں سے سہارا دے کر ٹرین میں سوار کیا تھا اور عافیہ بیگم کراچی شہر کی سرزمین سے جدا ہوتے ہوئے تڑپ گئی تھیں۔ اور وہ یونہی روتے ہوئے ٹرین کی چھک چھک کی آواز کے ساتھ اس شہر سے چلی گئی تھیں اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر سے دور ہو گئیں۔
اور آج ایک طویل عرصے بعد عافیہ بیگم کراچی شہر کی سرزمین پہ پاؤں نکالتے ہوئے حوصلہ مجتمع نہیں کر پا رہی تھیں۔
"بہن جی۔ ذرا راستہ دیجیے۔" ٹرین کے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی عافیہ بیگم کو ایک آدمی نے متوجہ کیا تھا۔ وہ چونک کر ایک طرف ہو گئیں۔
"امی پلیز۔ کب تک کھڑی رہیں گی۔ لوگ ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔ پلیز نیچے آئیے۔" ماورا نے ذرا خفگی سے کہتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑا۔ انہوں نے آہستگی سے گردن موڑ کر بابی گل کی سمت دیکھا۔ اس وقت بابی گل کے علاوہ کوئی ان کے جذبات نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ان کی سگی بیٹی بھی نہیں۔
اسی لیے بابی گل نے اس بار بھی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں اسی پرانے مضبوط سہارے کا سا احساس دلایا تو عافیہ بیگم قدرے سنبھل گئیں۔

"امی۔۔۔!" ان کا دوسرا مضبوط سہارا بھی ان کے ساتھ ہی تھا جب ہی انہوں نے اپنی آنکھوں کے نم گوشے پونچھتے ہوئے اپنے پاؤں ٹرین سے نیچے اتارے۔

"وصی مرتضیٰ۔۔۔!" ان کے دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی اور یوں لگا جیسے پورے شہر میں پھیل گئی ہو۔

"ماورا۔۔۔!" اک بہت ہی پرجوش سی پکار تھی جو اتنے زیادہ شور کو چیرتی ہوئی ان تک پہنچی تھی۔ ان تینوں نے بیک وقت چونک کر اس جانب دیکھا۔

فارہ اور آفاق اتنے ہجوم میں رستہ بناتے ہوئے ان ہی کی طرف آ رہے تھے۔

"ماورا۔۔۔!" فارہ قریب آتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ ماورا نے بھی اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"کیسی ہو۔۔۔؟" ماورا نے بہت اپنائیت سے پوچھا اور فارہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"میں جیسی بھی تھی مگر اب بالکل ٹھیک ہوں اور بہت خوش بھی ہوں کیوں کہ تم یہاں آ گئی ہو۔ آج تمہارا نہیں میرا خواب پورا ہو گیا ہے۔" فارہ چہکتے ہوئے بولی۔

"سیم ہیئر۔۔۔! میری فیلنگز بھی کچھ ایسی ہی ہیں۔ اچھا اب۔۔۔ السلام علیکم آفاق بھائی۔۔۔!" ماورا ذرا ہٹ کے کھڑے آفاق کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟" آفاق بھی فارہ کی خوشی میں خوش تھا۔

"اسلام علیکم آنٹی۔ السلام علیکم بی کل۔۔۔! کیسے ہیں آپ لوگ۔۔۔ سفر کیسا رہا؟" فارہ عافیہ بیگم کے مزاج کے پیش نظر ذرا جھجکتے ہوئے ہی ان سے مخاطب ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" عافیہ بیگم مختصر سا جواب دے کر چپ ہو گئیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ جیتی رہو خوش رہو اللہ سدا سہاگن رکھے۔۔۔! ہم بھی اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہیں اور سفر بھی الحمدللہ بہت اچھا گزرا ہے۔" جواب سلام کی کمی بی کل نے پوری کر دی تھی اور فارہ سر جھکا کے رہ گئی۔

"لائیے آنٹی۔۔۔ سامان مجھے دیجئے میں گاڑی میں رکھواتا ہوں آپ لوگ چلیے گاڑی میں بیٹھیے۔" آفاق نے آگے بڑھ کر عافیہ بیگم کے ہاتھ میں پکڑا بیگ تھاما۔

"آئیے بی کل۔" فارہ انہیں ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن کے خارجی دروازے کی طرف بڑھی۔ سامان کا باقی سامان آفاق نے ڈرائیور اور قلی سے گاڑی میں رکھوایا۔

فارہ انہیں اپنے ساتھ لے کر چلی آئی تھی اور آفاق ان کے پیچھے ان کا سامان دوسری گاڑی میں لے کر آیا تھا۔

فلیٹ کی چابی فارہ کے پاس تھی۔

فلیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی بی کل اور عافیہ بیگم کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

انتہائی وسیع و عریض اور لگژری فلیٹ ماورا مرتضیٰ کی توقع کے عین مطابق تھا۔ البتہ بی کل اور عافیہ بیگم کی توقعات سے بہت بڑھ کے تھا جس کی وجہ سے عافیہ بیگم کے دل میں اعتراض کا ابال اٹھا تھا مگر وقتی طور پر اس ابال کو دل میں ہی دبا گئی تھیں۔ کیوں کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا اب اس طرح کے چھوٹے چھوٹے اعتراض کرنے اور نکتے اٹھانے سے کیا حاصل تھا۔ سو انہوں نے خاموشی بہتر جانی۔

"ٹھیک ہے فارہ۔۔۔! میں چلتا ہوں تم ڈرائیور کے ساتھ آ جانا۔" آفاق دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ دونوں سہیلیاں بہت عرصے بعد ملی ہیں اس لیے ان کی باتوں کو ابھی کچھ وقت لگے گا۔

"ہوں کے ٹھیک ہے... میں آجاؤں گی۔" فارہ جیسے آفاق کے اتنا کہہ دینے پہ اندر سے بہت خوش ہوئی تھی۔

"تھینک یو آفاق صاحب! آپ نے ہمارے لیے اتنا ٹائم نکالا! مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اپنی بیوی کی فرینڈ کا اتنا خیال کر سکتے ہیں تو آپ اپنی بیوی کا بھی اسی طرح خیال رکھتے ہوں گے۔"

ماورا اسے دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی تھی اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کرید بھی گئی تھی۔

آفاق جاتے جاتے ٹھہر گیا تھا۔

"ابھی تو مجھے اس کا خیال رکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ ہر وقت اسی کے خیال میں رہتا ہوں۔" آفاق کے لہجے میں محبت تھی۔

"اچھا... تو وقت کب ملے گا؟" وہ آفاق کا چہرہ کھوج رہی تھی۔

"وقت ملا تو بتاؤں گا آپ کو۔ سردست فی الحال اجازت چاہتا ہوں۔" آفاق آہستگی سے مسکرایا اور ماورا خدا حافظ کہہ کر اسے رخصت کرکے اندر آئی۔

تھوڑی دیر بعد ان لوگوں نے مل کر کھانا کھایا تھا اور کھانے کے آخری مرحلے پہ ماورا نے عافیہ بیگم کے کلیجے پہ ہاتھ ڈال دیا۔

"میں قبرستان جا رہی ہوں... بابا کی قبر پہ۔" وہ پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی بڑے اطمینان سے "لیکن عافیہ بیگم کے حلق میں پانی اٹک گیا۔ لی گل نے بھی بری طرح چونکے۔ فارہ نے بہت دیکھا تھا سو کرسی دھکیل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔

"ماورا...!" لی گل کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"لی گل... میں اس شہر میں پہلی بار آئی ہوں اور اپنے بابا سے بھی پہلی بار ہی ملوں گی۔ مجھے ان سے ملے بغیر رات کو نیند نہیں آئے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں فارہ کے ساتھ ہی چلی جاؤں۔ بعد میں کس کے ساتھ جاؤں گی...؟" اس کی لاپروائی اور اطمینان ہنوز تھا۔

"لیکن تمہیں قبر کا پتا ہے؟"

"میرے پاس آپ کی ڈائری ہے نا... ساری معلومات مل جائیں گی۔" وہ سکون سے کہتی پلٹ گئی۔

"لیکن ماورا...!" عافیہ بیگم کے آنسو چھلک پڑے۔ وہ ٹھہر گئی۔

"امی... مجھے جانے دیں پلیز۔ پھر انہیں تو ان کا ہی کچھ خیال کر لیں۔ اتنے سال بیت گئے ہیں کوئی ان کی قبر پہ نہیں گیا ہوگا۔ اور اب آپ... آپ مجھے بھی روک رہی ہیں۔ پلیز! ایسا مت کریں۔ مجھے جانے دیں۔ کل میں آپ کو اور لی گل کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

ماورا کا لہجہ روہانسا سا ہو گیا تھا اور فارہ کے ساتھ ساتھ لی گل اور عافیہ بیگم نے بھی اسے اس روپ اور اس کیفیت میں پہلی بار دیکھا تھا ورنہ انہوں نے آج تک اس کی آنکھ نم نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کی آواز کبھی بھیگی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ عافیہ بیگم نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ماورا ان کی تسلی کے لیے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر فارہ کے ساتھ فلیٹ سے باہر نکل گئی۔

⁂ ⁂ ⁂

کراچی کی سڑکوں پہ بھاگتی دوڑتی گاڑی اور پیچھے کی طرف رواں مناظر ماورا مرتضیٰ کے لیے بے شک نئے تھے لیکن انجانے پھر بھی نہیں تھے۔

یہ سڑکیں' یہ گاڑیاں' یہاں کے لوگ اور یہاں کی طرز زندگی سب کچھ اسے بہت جانا پہچانا اور اپنا اپنا سا لگ رہا تھا اور ایک عجیب سا سکون تھا جو اس کی رگ و پے میں اترتا محسوس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ادھوری زندگی آج مکمل ہو گئی ہو۔

آج وہ پرائے شہر سے اپنے شہر میں آ بسی تھی' آج اس کا اعتماد اور زیادہ بڑھ گیا تھا اور اس کے ارادے اور بھی پختہ ہو گئے تھے کیوں کہ آج وہ اپنی منزل کے راستے پہ پہلا قدم رکھ چکی تھی۔

"کیا فیل کر رہی ہو؟" ماورا کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی' جب فارہ کے سوال پہ اسے فارہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔

"آج میری کچھ ایسی فیلنگز ہیں' جنہیں میں شاید کبھی بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔" ماورا کی کیفیت آج واقعی بہت عجیب سی ہو رہی تھی اور آج واقعی اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہوں۔ آئی کین انڈراسٹینڈ۔" فارہ نے آہستگی سے سر ہلایا۔

"تیمور بھائی کا کوئی فون وغیرہ آیا تمہارے پاس؟" فارہ نے موضوع بدلا۔

"نہیں۔" اس کا ایک لفظی جواب اس کے موڈ کی عکاسی کر رہا تھا۔

"تو کیا تم نے بھی نہیں بتایا کہ تم کراچی پہنچ گئی ہو؟" فارہ جان بوجھ کر اسی موضوع پہ بات کرنا چاہتی تھی۔

"اگر تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو' تو سیدھے طریقے سے پوچھ لو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اس طرح پہیلیاں بجھوانے کی اور بات کو گھمانے پھرانے کی کیا ضرورت ہے؟" ماورا بے زاری سے لہجے میں بولی تھی کیوں کہ وہ فارہ کی بات کا مقصد سمجھ چکی تھی۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہوں جو کہ مجھے مل ہی نہیں رہے۔" فارہ بھی لائن پہ آ ہی گئی تھی۔

"میں سوچتی ہوں لوگ پتا نہیں کیوں مناسب وقت اور مناسب الفاظ کی تلاش میں رہتے ہیں؟ جو وقت ان کے پاس موجود ہوتا ہے اور جو الفاظ انہیں میسر ہوتے ہیں وہ انہیں مناسب کیوں نہیں بنا لیتے۔" ماورا تلخ ہوئی تھی۔

"تم اس چیز کو نہیں سمجھ سکتیں کیوں کہ تم اپنا ایک الگ مزاج اور الگ نظریہ رکھتی ہو جبکہ ہم اس دنیا میں رہ کر اس دنیا کے ساتھ چلنے والے لوگ ہیں' ہمیں مناسب اور غیر مناسب کا فرق دیکھنا ہی پڑتا ہے۔" فارہ نے اپنی سوچ بیان کی۔

"پھر بھی مجھ سے زیادہ آپ لوگ پریشان رہتے ہو۔ مناسب اور غیر مناسب کا فرق دیکھنے کے باوجود بھی۔" اس نے طنز کیا۔

"ایسی ہی تو زندگی ہے۔" فارہ نے کندھے اچکائے۔

"لیکن میری نظر میں یہ زندگی کوئی زندگی نہیں ہے۔ انسان کو اپنی ذات اور اپنی سوچ کے ساتھ چلنا چاہیے۔ دنیا تو دو دھاری تلوار ہے۔ نجانے کب کس طرف سے وار کر جائے' دنیا کو رنگ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس سے بہتر ہے کہ اپنی ذات کو رنگ لو جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا تمہاری پہچان بن کے۔"

ماورا کا فلسفہ اور دلیلیں ہمیشہ ہی ایسی ہوتی تھیں کہ فارہ کو چپ ہونا ہی پڑتا تھا یا پھر یہ کہنا بھی ٹھیک رہے گا کہ فارہ کو قائل ہونا ہی پڑتا تھا۔

"خیر چھوڑو۔ تم اپنی بات مکمل کرو۔" ماورا نے بات کرنے کے لیے اس کا حوصلہ بڑھایا اور فارہ اپنے آپ کو کمپوز کرنے لگی۔

"میں تیمور بھائی کے متعلق بات کرنا چاہ رہی تھی۔" اس نے الفاظ مناسب کر ہی لیے تھے۔

"ہوں۔ آگے بات۔ سن رہی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے متوجہ ہوئی۔

"تمہیں پتا تو ہوگا کہ تیمور بھائی تمہارے لیے کیا فیلنگز رکھتے ہیں اور یہ سب وہ کیوں کر رہے ہیں؟"

فارہ پہلے ہی سب کچھ واضح کر دینا چاہتی تھی کیوں کہ اسے ناورا کے مزاج کا بخوبی علم تھا' اسی لیے اس کے ذہن میں کھٹکا سا تھا کہ ناورا تیمور حیدر کے لیے وہ جذبات ہرگز نہیں رکھتی جو وہ اس کے لیے رکھ رہا ہے۔

"ہاں۔ !" پتا ہے کہ وہ کیا فیلنگز رکھتا ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔" اس نے ڈنکے کی چوٹ پہ اعتراف کیا تھا۔

"پھر۔ ؟" فارہ تذبذب کا شکار ہونے لگی۔

"پھر کیا۔ جو کہنا ہے کھل کے کہو۔" ناورا بہت پرسکون تھی۔

"پھر یہ کہ تمہاری کیا فیلنگز ہیں ان کی فیلنگز کے متعلق؟" اس نے پوچھ ہی ڈالا تھا۔

"سچ سننا چاہتی ہو؟" ناورا کا لہجہ دوٹوک اور بے دھڑک تھا۔

"ظاہر ہے۔ جھوٹ سننے کا خواہش مند تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔" فارہ نے کندھے اچکائے۔

"ہوتے ہیں تیمور حیدر جیسے کچھ لوگ۔ وقتی خوشی کے لیے جھوٹ سننے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔" ناورا نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"کیا مطلب۔ ؟" وہ ہر سوال اور ہر جواب کے بعد الجھتی ہی جا رہی تھی۔

"فارہ۔ ! تیمور حیدر مجھ میں انٹرسٹڈ ہے لیکن میرا سچ یہ ہے کہ میں تیمور حیدر میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی ہو سکتی ہوں۔" ناورا نے اپنے ازلی دوٹوک انداز میں جواب دے کر فارہ کو تڑپا دیا تھا۔

"کیوں۔ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" فارہ کی تڑپ اس کے لہجے سے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیوں کہ مجھے معلوم ہے۔ میرے اندر کبھی بھی اس تیمور کے لیے کوئی جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔" اس کا لہجہ اور انداز ہنوز تھے دوٹوک مضبوط اور بے لچک۔

"دیکھو ناورا۔ ! تم بہت ہوشیار سہی لیکن تھوڑی بہت عقل تو اللہ نے ہمیں بھی دے ہی رکھی ہے اور ہماری عقل اور ہمارا مشاہدہ تو یہی کہتا ہے کہ ہم کبھی کسی چیز کا اور کسی بات کا دعوا عمر بھر کے لیے نہیں کرنا چاہیے تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارے اندر کبھی بھی تیمور بھائی کے لیے کوئی جذبات پیدا نہیں ہو سکتے؟ زندگی میں انسان بہا نہیں کیا کیا دعوے کرتا ہے لیکن جب اللہ انہیں پورا نہیں کرنا چاہتا تو سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ تم کہاں تھیں۔ فیصل آباد میں اور تیمور بھائی کہاں تھے کراچی میں۔ کیسے تم لوگوں کی ملاقات ہوئی۔ کیسے رابطہ بڑھا اور تم آج اسی تیمور حیدر کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہو۔ اگر سوچو تو یہ سب بھی تو اللہ کی ہی کرم نوازیاں ہیں ناورا ورنہ تم وہی لڑکی ہو جس نے آج تک کسی لڑکے سے بات تک نہیں کی' کسی سے مراسم نہیں رکھے' کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا' لیکن تیمور حیدر کو نمبر بھی دے دیا' بات بھی کر لی اور مراسم بھی بڑھا لیے' اسی طرح رفتہ رفتہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے' جذبات پیدا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اس کی مثال بھی ہمارے سامنے ہی ہے۔ تیمور بھائی کو آج تک لڑکیوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں رہا' لیکن جب انٹرسٹ ہوا ہے تو اپنی زندگی کے ہر مقام' ہر معیار اور ہر اصول کو ہی بھول گئے ہیں' لگتا ہی نہیں کہ وہ وہی تیمور حیدر ہیں جو اپنے کام سے کام رکھتے تھے' جن کے لیے ان کا بزنس ہی سب کچھ تھا اور آج۔"

فارہ کہتے کہتے چپ ہو گئی تھی۔ اور چپ تو ناورا بھی تھی' لیکن اس کی چپ کے پیچھے بہت سے جواب مچل رہے تھے جن کو وہ بڑی مشکل سے قابو کیے ہوئے تھی۔

"اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ اپنے پہلو میں دھڑکتے پتھر کو ذرا نرم رکھو' تاکہ اس کے چاہنے والوں کو اس کے

ساتھ ۔۔۔ ٹکرا ٹکرا کر سر نہ پھوڑنا پڑے۔" آج فارہ اسے شعور دے رہی تھی۔

"فارہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تیمور حیدر کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی۔" ماورا کے اس قدر بے مہر جواب پہ فارہ ایک بار پھر تڑپی تھی اور اس نے چونک کر ماورا کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"میری تیمور حیدر سے ملاقات ہوئی' یہ ایک اتفاق تھا۔ میری اس سے بات ہوئی' وجہ تم تھیں' کیوں کہ وہ تمہارا کزن تھا۔ رابطہ کیوں بڑھا۔۔۔ اس کے پیچھے میری ایک سوچ تھی اس نے مراسم بڑھائے' اور میں نے اپنا مقصد بڑھا لیا' اس نے میرے قریب رہنے کے لیے مجھے جاب آفر کی میں نے اس سے دور رہنے کے لیے سرسری سا انکار کر دیا' اس نے مجھے فورس کیا' میں مان گئی' وہ مجھے یہاں دیکھنا چاہتا تھا' میں آ گئی' وہ مجھے نہیں جانتا' لیکن تم تو مجھے جانتی ہو نا۔۔۔؟

اور جب تم مجھے جانتی ہی ہو تو یہ بات تمہاری عقل میں کیوں نہیں آ رہی کہ تمہاری دوست ماورا مرتضیٰ جو کبھی کسی کے ساتھ فری نہیں ہوئی' جس نے کبھی کسی کے ساتھ بات تک نہیں کی' جس نے کبھی کسی کو نمبر نہیں دیا' جس نے کبھی کسی کے ساتھ مراسم نہیں بڑھائے' اور جو کبھی اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹی' وہ اگر ایسا کر رہی ہے تو کیوں کر رہی ہے؟ محبت میں کر رہی ہے یا اپنے مفاد میں کر رہی ہے؟"

ماورا کہتے کہتے حد سے زیادہ تلخ ہو گئی تھی' جب کہ فارہ اس کی بات کے آخری جملے پہ گنگ سی رہ گئی تھی۔

"ہونہہ! تمہیں تیمور حیدر کی محبت تو نظر آ گئی' لیکن میرا مفاد نظر نہیں آیا۔" ماورا نے سر جھٹکا۔

"بی گل کہتی ہیں کہ جب ایک انسان کے ذہن میں محبت' اخلاق سے یا مفاد سما جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ اور یہ بات جب میں نے تیمور حیدر اور ماورا مرتضیٰ پہ منطبق کر کے سوچی ہے تو مجھے سو فیصد سچ لگی ہے' میں واقعی تیمور حیدر کے اصرار یا اس کی محبت سے مجبور ہو کر یہاں نہیں آئی' میں اپنے مقصد' اپنے مطلب اور اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر یہاں آئی ہوں۔"

ماورا نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا جس کو سمجھنا فارہ کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا' وہ الجھی ہوئی اور نا سمجھی سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی' اسے آج اپنے سامنے وہی ماورا نظر آ رہی تھی' ضدی' اٹل اور پتھریلی چٹان سی مضبوط۔۔۔!

"مفاد۔۔۔؟ کیسا مفاد ماورا۔۔۔؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔؟" فارہ کا سوال بھی الجھا ہوا سا تھا۔

"تیمور حیدر بہت اچھا لڑکا ہے' صاف ستھرا اور سچا کھرا' کردار بھی مضبوط ہے اور پرسنالٹی بھی ایک آئیڈیل پرسنالٹی ہے۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے' کوئی بھی لڑکی اس پہ بڑی آسانی سے فدا ہو سکتی ہے' کیوں کہ وہ ہے ہی ایسا۔۔۔ لیکن معذرت کے ساتھ کہ وہ لڑکی ماورا مرتضیٰ نہیں ہو سکتی۔" اس نے بہت آہستگی اور بہت تحمل سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"لیکن ماورا۔۔۔!" فارہ بوکھلا سی ہو چکی تھی اسی لیے اس کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور وہ کیا سن رہی ہے؟

"دیکھو فارہ! میں نے مانا تیمور حیدر بہت اچھا لڑکا ہے' میں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اسے سیڑھی نہیں بنانا چاہتی تھی' میں اپنے بل بوتے پہ سب کچھ کرنا۔۔۔ چاہتی تھی' اپنے پیروں پہ خود کھڑا ہونا چاہتی تھی مگر میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ باز نہیں آیا' تو میں نے نہیں بنایا وہ خود میرے لیے سیڑھی بن گیا' یہ صحیح ہے کہ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا' آسانیاں کس کو اچھی نہیں لگتیں' سو میرا اور اس کا ساتھ جڑ گیا ہے اس سفر میں۔۔۔ البتہ سفر ختم ہونے کے بعد اور منزل تک پہنچنے کے بعد اس سیڑھی کا' اس راہ اور اس منزل کا کیا انجام ہوگا' یہ تو اب وقت آنے پہ ہی پتا چلے گا۔۔۔ ہاں تم چاہو تو اس سیڑھی کو کھینچ بھی سکتی ہو۔" ماورا کی مبہم سی باتیں فارہ کو پاگل

لیے اسے روائی تھیں۔

"مجھ سے...؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تم سے۔ کیوں کہ تمہارا اور اس سیڑھی کا تعلق بھی تو بہت گہرا ہے۔"

"او رواپلیز! خدا کے لیے مجھے صاف صاف بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ اصل وجہ کیا ہے اس قصے کی؟" قارہ بے چاری جھنجلائی۔

"بتاؤں...؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں...!" اس نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔

"چلو تو...بتاتی ہوں تمہیں اور دیکھتی ہوں کہ تمہارا تعلق کس کے ساتھ زیادہ گہرا ہے؟ سیڑھی کے ساتھ؟ بڑوں کے ساتھ؟ یا منزل کے ساتھ...؟ اور ہاں یہ بھی یاد رکھنا کہ یہ سب میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں تمہیں اپنی بہت اچھی اور بہت گہری دوست سمجھتی ہوں اور دوستی میں، میں اپنی دوست کو دھوکا نہیں دینا چاہتی اور نہ ہی آئندہ کبھی دوں گی۔"

ملورا انتہائی سخت لہجے میں کہتی ہوئی قارہ کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اتر آئی تھی کیوں کہ ڈرائیور قبرستان کے باہر گاڑی پارک کر چکا تھا۔

اور ملورا قبرستان کے پہرے دار سے کچھ بات چیت...کرنے کے بعد اور تھوڑی بہت انفارمیشن لینے کے بعد قارہ کو ساتھ لیے اندر آگئی تھی۔

٭ ٭ ٭

اس نے بہت دنوں سے اپنے لیے بوتیک سے کچھ شرٹس اور کرتوں کا آرڈر دے رکھا تھا۔ اور آج وہ آرڈر تیار ہو چکا تھا اس لیے وہ زاننو کی کال پہ پہنچی تھی...فری ہوتے ہی بوتیک چلی آئی تھی۔ وہ اپنے تمام ڈریسز ٹرائی کر کے دیکھ ہی رہی تھی جب اچانک ایک لڑکے کے ساتھ مونس مرزا بوتیک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

اور جہاں وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی وہیں وہ بھی اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کرتا عزت نے اس سے منہ موڑ کر زاننو کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"یہ سارے پیک کر دیں...ذرا جلدی۔" اس نے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور اپنے بیگ سے بل نکال کر ادائیگی کرنے لگی۔

"ایکسکیوزمی مس عزت...!" وہ بیگ لے کر بوتیک سے نکلی ہی تھی کہ مونس مرزا بھی اس کے پیچھے لپکا۔

"سوری...! میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے...مجھے جلدی ہے۔" وہ رکی نہیں تھی۔

"یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں، میرے پاس بھی زیادہ ٹائم نہیں ہے...مجھے بھی جلدی ہے۔" وہ کہتے ہوئے یک دم اس کے سامنے...آگیا تھا اور عزت کو ایک دم رک جانا پڑا۔

"کیا مطلب...؟"

"مطلب کہ میں اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیج رہا ہوں۔" مونس مرزا نے مارکیٹ میں کھڑے کھڑے اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا...وہ اچھل کے رہ گئی تھی۔

"کیا...؟" عزت کی آواز خاصی بلند تھی۔

"جی...! ان فیکٹ میں کسی بھی معاملے کو یا کسی بھی سلسلے کو زیادہ طول دینے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں ہر کام بس منٹوں میں ہو جائے اور اس معاملے میں تو مجھ سے ویسے ہی صبر نہیں ہو رہا۔" وہ ہمیشہ کی طرح آخر

میں اور تنی بات کہہ گیا تھا۔

"آپ جیسے مسٹر مونس مرزا... معاملے کو طول دینے کی عادت تو مجھے بھی نہیں ہے اس لیے آپ کو پہلے سے ہی سمجھا رہی ہوں کہ اپنے پیرنٹس کو میرے گھر بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ورنہ ان کو جو جواب میں دوں گی وہ آپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔"

عزت نے اسے اپنے انداز منہ پھٹ طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہوں... جواب کیوں دیں گی آپ؟ کوئی خاص ریزن؟" اس نے عزت کو سر تا پا بڑے غور سے دیکھا اور کھوجنا چاہا تھا۔

"یہی سمجھ لیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"ہوں... لیکن میں ریزن ختم کرنا بھی جانتا ہوں۔" مونس مرزا نے دھمکی دینے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور عزت کے گال پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"جسٹ اسٹاپ اٹ... میں اس طرح کی بکواس سننے کی عادی نہیں ہوں بہتر ہے آپ اپنی لسٹ میں ہی رہیں اور آئندہ میرے بارے میں سوچیں بھی مت... کیوں کہ میں آپ مرزی کسی اور کے بارے میں سوچتی ہوں... مجھے آپ...؟" وہ غصے سے... پاؤں پٹخ کر کہتی وہاں سے ہٹ گئی اور مونس مرزا وہیں کھڑا اس کی پشت گھورتا رہ گیا تھا۔

"کون تھی یہ لڑکی؟" مونس مرزا کی گرل فرینڈ بوتیک سے نکل کر اس کے قریب آئی۔

"عزت حیدر۔" مونس مرزا نے اپنی سوچ کی گرہ کھولی... بے دھیانی میں آتے ہوئے بتایا۔

"اوہ... تو یہ ہے تمہاری عزت حیدر...؟" وہ بھی گرل فرینڈ سے غائبانہ تعارف سن چکی تھی۔

"ہاں... یہ ہے میری عزت حیدر... میری ہونے والی منگیتر ہو سکتی ہے۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور پلٹ کر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شاپنگ مال کی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا لیکن دھیان ابھی بھی عزت کی طرف ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماورا...!" فارہ نے اسے پکارا تھا۔

"تمہارا جو بھی فیصلہ ہو مجھے بتا رہنا... میں تمہاری دوستی کو کسی آزمائش کے ترازو میں نہیں تولنا چاہتی۔ باقی جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ میرا اللہ میرے ساتھ ہے میں ہمت نہیں ہاروں گی۔"

قبرستان سے واپسی پہ ماورا اپنا فیصلہ اسے سناتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر اتر گئی تھی اور فارہ اس کے پیچھے جانے کی ہمت کر ہی نہ پائی۔

جب ماورا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی مضبوط اور متوازن قدم اٹھاتی بلڈنگ کے اندرونی حصے کی طرف غائب ہو گئی تھی... اس کے جانے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی تھی اور پھر گھر آ کر ہی بریک لگائے تھے۔

"بی بی جی... ہم گھر آ گئے ہیں۔" ڈرائیور نے اسے ذہنی طور پہ غیر حاضر دیکھ کر خود ہی دروازہ کھولتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

"ہوں..." وہ بھی بوجھل سی گاڑی سے اتر گئی تھی۔

"ارے فارہ... آ گئی ہو بیٹا۔ ملاقات ہو گئی اپنی فرینڈ سے۔" ثمینہ یزدانی کہیں جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھیں... فارہ کو دیکھ کر وہیں گاڑی کے پاس ہی رک گئیں۔

"جی... ہو گئی ملاقات۔" وہ آہستگی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ ثمینہ یزدانی اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر

سیں لیو تھا۔ پیچ بھرے جا رہے تھے وہ سن کر وہ بے حد خوش ہی۔

"اسے کیا ہوا ہے غفور؟" انہوں نے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"مجھے کچھ خاص پتا تو نہیں ہے بیگم صاحب۔ بس اتنا علم ہے کہ بی بی جی اپنی دوست کے ساتھ قبرستان گئی تھیں ان کے والد صاحب کی قبر پہ۔" ڈرائیور بے چارے کو جتنا علم تھا اس نے بتا دیا تھا اور ثمینہ یزدانی سر ہلا کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

آفاق ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب اس کی نظر تیسری مرتبہ بھی فارہ کی سمت اٹھی تو اسے تیسری مرتبہ بھی ایک ہی پوزیشن میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے گم صم سے انداز میں بیٹھے ہوئے دیکھا اب کی بار وہ رہ نہیں سکا تھا اور اپنی آستین کے بٹن بند کرتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ کے اس کے قریب آگیا تھا اور اپنی پینٹ کو گھٹنوں سے پکڑ کے ذرا سا اوپر کھینچتے ہوئے اس کے پاس بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

"ہیلو۔" اس نے فارہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ ابھی بستر پہ ہی تھی مگر سوچوں کا گھوڑا نہ جانے کہاں سے کہاں دوڑ رہا تھا۔

"ہوں۔؟" وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"کیا بات ہے۔ تم جب سے مادرا سے مل کر آئی ہو بہت چپ چپ اور گم صم سی ہو؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟ اگر کوئی مسئلہ ہے، کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے شیئر بھی کر سکتی ہو۔" آفاق اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کے نرم سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اور فارہ اس کے ایسے استفسار پہ بے ساختہ مزید ہی ہو بیٹھی تھی۔

"نہیں۔ ایسی پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی۔ دراصل کل ہم لوگ مادرا کے بابا کی قبر پہ چلے گئے تھے۔ مادرا بہت اداس تھی اور رو بھی رہی تھی۔ اس لیے میں بھی اس کے دکھ پہ بہت دکھی ہوئی تھی۔

کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی بار مادرا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ ورنہ وہ ایسی اسٹرانگ لڑکی ہے کہ چھوٹی موٹی بات کا تو نوٹس ہی نہیں لیتی۔"

فارہ نے رسانیت سے آفاق کی تسلی کروا دی تھی اور وہ واقعی کسی نہ کسی حد تک مطمئن ہو بھی گیا تھا۔

"کیا واقعی یہی بات ہے؟" اس نے مزید استفسار کیا۔

"جی۔ یہی بات ہے۔" فارہ وہی کہہ گئی۔

"اوکے۔ تو پھر جلدی سے اٹھو اور فریش ہو جاؤ۔ میں آفس جاتے ہوئے تمہیں مادرا کی طرف ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آج کا دن اس کے ساتھ رہو اور اس کو بھی فریش کرنے کی کوشش کرو۔ آج اس شہر میں اس کا پہلا دن ہے۔" آفاق اس کا ہاتھ تھپکتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ میں اس کی طرف نہیں جا سکتی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیوں۔؟" آفاق پھر ٹھٹکا۔

"کیونکہ مادرا گھر پہ نہیں ہوگی۔ اس نے آج آفس جوائن کرنا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ارے۔ اتنی جلدی۔ تھوڑا سے تھوڑا ٹائم تو دیتا۔" آفاق کو عجیب لگا تھا۔

"وہ تو کام کرنے کو تیار تھے لیکن مادرا ہی ٹائم نہیں لینا چاہتی تھی۔" فارہ بھی عجیب سے لہجے میں کہتی ہوئی بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر آفاق کے جانے کے فوراً" بعد اس نے فون اٹھا کر مادرا کا نمبر ڈائل کیا اور اپنا فیصلہ اس کے حق میں سنا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کا تعلق پاؤں کے ساتھ زیادہ گہرا ہے۔

فارہ کی فون کال سننے کے بعد نجانے کیوں ماورا ایک دم سے جیسے پُرسکون سی ہو گئی تھی اور اپنا سیل فون بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کے تیار ہونے کے لیے چلی گئی کیونکہ اس نے آفس جانا تھا۔

اور جیسے ہی وہ تیار ہو کر باہر نکلی لی گل اور عافیہ بیگم اندر ہی اندر دہل کے رہ گئی تھیں۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔" لی گل نے بے ساختہ اس کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔

"آج میرا پہلا دن ہے لی گل۔۔۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔" وہ لی گل سے کہتی ہوئی عافیہ بیگم کی سمت بڑھی۔ وہ اس کے سامنے سے ہٹنے ہی والی تھیں کہ ماورا نے یک دم ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"میری کامیابی کی طرف آج میرا پہلا قدم اٹھ رہا ہے اور آپ مجھ سے رخ موڑ رہی ہیں۔۔۔ کیا ماں ایسا کرتی ہیں؟ آپ اس طرح کریں گی تو مجھے ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے پلیز۔۔۔ میرے لیے دعا کیجئے۔ میں ہمیشہ کہتی ہوں مجھے آپ کی دعا کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔۔۔ آپ کی دعا میرے ساتھ ہوگی تو میں زندگی کے کسی بھی مقام پر کسی سے بھی شکست نہیں کھاؤں گی۔۔۔"

ماورا کا لہجہ ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ عافیہ بیگم نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں کہ لی گل اور ماورا سے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ کل سے کراچی آئی ہوئی تھیں اور کل سے ہی ان کے اندر آنسوؤں کا اک سیلاب سا رکا ہوا تھا۔

"امی پلیز۔۔۔ سنبھالیں اپنے آپ کو۔۔۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بالکل بھی فکر مت کریں۔۔۔ آپ کو فخر ہو گا اک دن۔۔۔ دیکھ لیجئے گا۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔"

وہ انہیں اپنے ساتھ بھینچے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر تسلی دے رہی تھی اور وہ بھی بے تحاشا رونے دھونے کے بعد ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر سنبھل گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"آیئے میڈم۔" وہ تھوڑا فاصلہ طے کر کے پہنچی آئی ہی تھی کہ ایک باوردی ڈرائیور بڑی مستعدی سے اس کی طرف بڑھا اور گاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ۔۔۔؟" ماورا چونکی۔

"مجھے سر تیمور حیدر نے بھیجا ہے۔ حیدر گروپ آف انڈسٹریز کی طرف سے۔۔۔ جب تک آپ ڈرائیونگ نہیں سیکھ لیتیں۔ آپ کو پک اینڈ ڈراپ دینے کی ڈیوٹی میری ہے۔"

ڈرائیور نے آگے بڑھ کے اپنا تعارف کروایا تھا اور ماورا سر ہلاتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گاڑی کے قریب آگئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور پھر اپنے گھر سے آفس تک وہ تیمور حیدر کے متعلق ہی سوچتی ہوئی آئی تھی اور آفس آ کر اس کی سنجیدگی دس گنا بڑھ گئی تھی۔

آفس کی بلڈنگ دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی تھی اور اس پہ قیامت کہ بلڈنگ کے ماتھے پہ "حیدر" لکھا ہوا تھا۔

"آیئے میڈم۔ آپ رک کیوں گئیں؟" شوفر نے قریب آکر متوجہ کیا تھا اور ماورا بڑی ہمت اور بڑے حوصلے سے ایک گہری سانس خارج کرتی بلڈنگ سے نظریں ہٹا کر اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس حسن نادر سے معتبر ہم
اس خاک زادے کو ہم سفر کرلے

"وعلیکم السلام۔" وہ اپنے ذہن میں کوئی ایک سرسری سا جواب ترتیب دے رہی تھی' جب اچانک اس کے عقب سے ایک سمت ہی پرسکون اور شستہ آواز ابھری تھی۔ وہ ایک سیکنڈ میں پہچان گئی تھی کہ یہ آواز تیمور حیدر کی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی سمت بڑے سکون سے پلٹی تھی۔

"تھینک یو۔" اس نے کہتے ہوئے تیمور حیدر کے ہاتھ میں تھما ہوا بکے تھام لیا تھا۔ بہت ہی خوب صورت پھولوں سے سجا یہ بکے تیمور حیدر کے جذبات کی تازگی اور سرشاری کا اظہار کر رہا تھا۔ اور اسے بھی یہ اظہار قبول کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔

"کیسی ہیں؟" تیمور کی نظریں بے اختیار اس کے چہرے کی سمت اٹھی تھیں اور ایک نظر دیکھ کر ہی دل پہ قرار کی پھوار پڑی تھی۔

"اچھی ہوں۔" ماورا آہستگی سے کہتی پھولوں کا بکے ٹیبل پہ رکھ کر اس میں سے چند کلیاں نکالنے لگی۔

"سفر کیسا رہا؟" وہ اس کے خوب صورت مخروطی ہاتھوں میں پکڑی پھولوں کی کلیوں کو دیکھنے لگا۔

"کامیاب۔" اس کا جواب خاصا عجیب تھا۔

"کامیاب یا اچھا۔۔۔؟" تیمور کو اس کے جواب پر حیرت ہوئی تھی۔

"کامیاب۔ کیونکہ مجھے سفر کے اچھے یا برے ہونے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ میں بخیریت کراچی پہنچ گئی۔ میرے لیے یہی میری کامیابی تھی۔ اس لیے یہی کہنا ٹھیک ہے' کہ سفر کامیاب رہا۔"

ماورا نے ذرا تفصیلی جواب دیا تو تیمور حیدر بھی سر ہلاتے ہوئے مسکرا اٹھا۔

"ہوں۔ ویسے کراچی کیسا لگا؟" اس نے اگلا سوال پوچھا اور ماورا ہاتھ میں پکڑی پھولوں کی کلیوں کو ٹیبل کی سائیڈ پہ رکھے لمبے سے نازک کرسٹل کے گلدان میں سجانے لگی تھی۔ وہ خالی گلدان تین' چار کلیوں سے ہی سج گیا۔

"ابھی تو میں نے یہاں صرف قدم نکالے ہیں۔ ابھی میں نے کراچی دیکھا ہی کب ہے؟" اس نے پلٹ کر تیمور کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دکھا دوں کراچی چلیں میرے ساتھ؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"نو تھینکس۔ میں کراچی خود دیکھوں گی۔ اپنی نظر اور اپنے نظریے سے۔"

"اوہ۔ یعنی میرے ساتھ نہیں دیکھیں گی؟" وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"ہوں۔ یہی سمجھ لیں۔" وہ بےنیازی برت رہی تھی۔

"اوکے۔ اچھی بات ہے' مگر پھر بھی کسی راستے یا کسی موڑ پہ میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔" وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہر بار سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔

"اب آپ کا اگلا سوال یقیناً یہی ہوگا کہ کراچی کو میں کیسی لگی؟" ماورا نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ اور تیمور اس کی اس کوشش پہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"نہیں۔ یہ سوال تو اب میں کراچی والوں سے ہی کروں گا۔ آپ سے نہیں۔" تیمور نے مسکرا کر کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے۔ مجھے بھی بتا دیجئے گا کہ کراچی والوں نے میرے بارے میں کیا جواب دیا آپ کو۔۔۔"

"شیور۔ ضرور بتاؤں گا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"جی۔ ویسے فی الحال آپ مجھے یہ بتا دیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا کام کیا ہوگا؟" ماورا اب اپنے مقصد کی طرف آگئی تھی۔

"آپ نے کیا ارٹ یٹ ہوں۔۔۔ آیئے میرے ساتھ۔۔۔ اور ایک دو لوگوں سے مل لیجئے۔" تیمور چند سیکنڈز سوچتے ہوئے بولا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا کہہ کر اس کے کیبن سے نکل گیا، ماورا اپنا بیگ اور اپنی فائل لے کر اس کے پیچھے اس کے کمرے میں ہی آگئی تھی۔

اس کی پاپا اور اس کے منیجر صاحب بھی وہیں تھے۔ تعارف کے بعد اس کی ان لوگوں کے ساتھ تقریباً" ایک گھنٹہ میٹنگ ہوئی تھی۔ تیمور نے ماورا کے تیار کردہ کئی ڈیزائن دیکھے اور سلیکٹ کیے تھے۔ اس کا کام ایسا تھا کہ تیمور کئی بار متاثر ہوا اور کئی بار اس نے اس کے کام کو سراہا تھا۔

تین سال کے ایگریمنٹ کے بعد ماورا کی جاب اوکے ہو گئی تھی اور ماورا نے اگلے آدھے گھنٹے میں اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ولید اپنے ایک پروگرام کی ریکارڈنگ میں مصروف تھا۔

ایک آخری نیوز چل رہی تھی' جب اس کی نظر شیشے کے دروازے کے پار گئی جہاں ملازم کے پاس کھڑی عزت حیدر یقیناً" اسی کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اسے اس طرح مشہور چینل کے آفس میں یوں اس کے متعلق پوچھتے دیکھ کر ولید کا دماغ گھوم گیا۔

"ولید۔۔۔ ولید۔۔۔ کہاں دیکھ رہے ہو؟ ادھر دیکھو سامنے۔" کیمرا مین نے اسے متوجہ کیا مگر ولید سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جسٹ فائیو منٹس یار۔۔۔ میں ابھی آیا۔" اس نے بے حد عجیب سے انداز میں کہا تھا۔

"لیکن یہ کام۔۔۔" کیمرا مین نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ولید دروازہ کھول کر باہر نکل چکا تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا ہال کمرے کے اطراف سے ہوتا باہر آ گیا جہاں عزت حیدر ابھی بھی ملازم کے ساتھ الجھ رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔ میں یہاں ہوں۔۔۔" ولید نے بڑی سنجیدگی اور بڑی عجلت کے ساتھ اسے متوجہ کیا تھا۔

عزت ولید رحمٰن کی آواز سن کر یکدم اسی کی سمت پلٹی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ عزت نے بھی بڑے سنجیدہ موڈ میں اسے ہیلو کہا تھا۔ جس پہ ولید ایک لمحے کے لیے چونکا بھی کیونکہ عزت حیدر آج تک اسے اس موڈ میں ذرا کم ہی نظر آئی تھی۔

"خیریت۔۔۔؟" اس کے موڈ کے پیش نظر ہی ولید اس سے خیریت پوچھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ کرنے والا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے سیدھی سیدھی بات کی۔

"بات فون پہ بھی ہو سکتی تھی۔" ولید نے نارمل انداز اپنایا۔

"تمہارا فون آف جا رہا تھا۔" عزت نے اس کا یہ اعتراض بھی دور کر دیا۔

"میں بزی تھا۔" ولید نے بے ساختہ اپنے موبائل کی تسلی کرنے کے لیے اپنی پینٹ کی جیبوں کو ٹٹولا۔

"اور اب۔۔۔؟" عزت نے ابھی کا پوچھا۔

"اب بھی بزی ہوں۔۔۔ کام ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔۔۔" اس نے شیشے کے پار اندر کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن اس وقت میری بات آپ کے کام سے زیادہ اہم ہے۔۔۔ اسی لیے پلیز پہلے میری بات سن لیں۔" عزت اسے مخاطب کرنے کے حوالے سے کبھی بھی توازن نہیں رکھ پائی تھی۔ کبھی آپ کہہ لیتی تھی اور کبھی تم تک پہنچ جاتی تھی۔

"بس چند منٹ۔" اس نے وقت مانگا۔

"چند منٹ۔ مطلب چند منٹ۔" عزت نے زور دے کر کہا۔

"اوکے۔ آپ انتظار کریں۔ میں ابھی آیا۔" ولید عجلت میں کہہ کر واپس بھاگا۔ جہاں سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"ولید یہ کیا سلسلہ ہے یار۔؟" وہاں کام پہ موجود سبھی لوگوں نے اعتراض کیا تھا۔ لیکن ولید سنی ان سنی کرکے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

میں نعرہ مستانہ
میں شوخی رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں
پی کر بھی کہاں جانا۔
میں شمع فروزاں ہوں
میں آتش لرزاں ہوں
میں سوزش ہجراں ہوں
میں منزل پروانہ
میں نعرہ مستانہ۔

وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھی کی طرح عابدہ پروین کا نعرہ مستانہ اونچی آواز میں سن رہی تھی۔ جب ولید اپنا کام ختم کرکے تقریباً" پون گھنٹے میں واپس آیا تھا اور اسے باہر پارکنگ میں ہنوز اپنے انتظار میں موجود دیکھ کر ولید کے قدموں میں اور زیادہ تیزی آگئی تھی۔ اس نے قریب آکر گاڑی کی کھڑکی پہ دستک دی تھی۔

"ہیلو۔" اونچی تیز آواز کے باوجود اس نے دستک سن لی اور گاڑی کا دروازہ بھی کھول دیا۔ مگر ولید نے اس کی پیشکش قبول نہ کی۔

وہ اس سے بات کرنے کی غرض سے ڈرائیونگ سائیڈ پر ہی کھڑا رہا تھا۔ جس پہ مجبوراً" عزت کو گاڑی کا شیشہ نیچے کرنا پڑا تھا۔

"میری بات اتنی غیر اہم نہیں ہے کہ یوں سڑک پہ کھڑے کھڑے سنادوں۔" عزت کا لہجہ غصے اور خفگی سے بھر گیا تھا۔

ولید کو مجبوراً" کھلے دروازے کی طرف قدم بڑھانے پڑ گئے اور پھر جیسے ہی وہ گاڑی میں بیٹھا عزت نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

ولید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا تھا۔

عابدہ پروین کا نعرہ مستانہ اب بھی گونج رہا تھا۔ جس کو ولید نے ہاتھ بڑھا کر اپنی طرح خاموش کرا دیا تھا۔

اور یہ خاموشی تب تک قائم رہی جب تک وہ لوگ شہر کے ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں نہ پہنچ گئے تھے۔

وہ گاڑی مقفل کرکے ریسٹورنٹ کی طرف بڑھی ولید کسی سدھائے ہوئے بیل کی طرح چلتا اس کے پیچھے پیچھے اندر گیا تھا۔

ایک الگ کیبن کی شکل اور کرسیوں پہ بیٹھتے ہوئے۔
ولید نے اپنی نظریں عزت حیدر کے چہرے پہ جمادیں۔ جو عین اس کے سامنے چپ چاپ بیٹھی تھی۔
"مجھے پتا ہے تم منتظر ہو۔۔۔" اس نے بہت دیر بعد لب کشائی کی۔
"میں پریشان بھی ہوں۔" ولید نے انتظار کے علاوہ بھی اپنی کیفیت بیان کی۔
"تو پھر اندازہ کرو... جس بات کو سننے سے پہلے ہی تم اتنے پریشان ہو رہے ہو۔ اس بات کو سن کر میری پریشانی کا عالم بھلا کیا ہوگا۔" اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہا۔
"لیکن کچھ پتا بھی تو چلے۔" ولید واقعی اچھا خاصا پریشان اور متجسس ہو گیا تھا۔
"مونس مرزا کو جانتے ہو؟" اس نے بات شروع کی۔
"دیکھا ہے۔ جانتا نہیں ہوں۔" ولید نے مونس مرزا کو تغلق کی شادی میں دیکھا تھا۔ تیمور نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔
"میرے بابا کے ایک بیسٹ فرینڈ کا بیٹا ہے۔" وہ مزید گویا ہوئی۔
"ہمم۔؟" وہ کھٹک گیا۔
"بابا ان لوگوں کے ساتھ بہت کلوز ہیں' بہت پسند کرتے ہیں ان کو۔"
"ہوں۔ مگر اس بات سے میرا کیا تعلق ہے؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنا۔
"تمہارا تعلق یہ ہے کہ تم تیمور حیدر کے بیسٹ فرینڈ ہو۔ اور میں اپنے بابا کے دوست کی فیملی کے بجائے اپنے بھائی کے دوست کی فیملی میں انٹرسٹڈ ہوں۔ مجھے مونس مرزا کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ میری تمام دلچسپیوں کا مرکز ولید رحمن ہے۔ وہ ولید رحمن جو میرے بابا سے بھی بھاگتا پھرتا ہے۔ جس کے لیے میرے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھنا بھی محال۔ جو دنیا سے بھی ڈر رہا ہے اور مجھ سے بھی۔ جو نہ اپنا بن رہا ہے اور نہ میرا۔" عزت کہتے کہتے روہانسی سی ہو گئی تھی اور ولید یک دم غصے سے پھٹ پڑا تھا۔
"تو کیا چاہتی ہو تم۔ سارے ڈر۔ سارے خوف پھینک دوں۔ جینا دشوار کرلوں اپنا بھی اور تمہارا بھی۔ میری نظر میں تم ابھی بچی ہو۔ تمہیں ابھی اپنے سینے کے اندر دھڑکتا خون کا سرخ لوتھڑا نظر آرہا ہے۔ اس دنیا کی سیاہی کا تو تمہیں علم ہی نہیں۔ جب انسانوں کے سرخ لوتھڑے دھڑکنا شروع کرتے ہیں۔ تو یہاں اس دنیا کے ستم ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اور... پیار کرتا ہوں تمہاری معصومیت سے۔ تمہارے جذبات سے۔ تمہاری محبت سے اور محبت کی شدت سے۔ یاد رکھو جہاں یہ معصومیت' جذبات' محبت اور شدت زیادہ ہوتی ہے وہیں آزمائش زیادہ ہوتی ہے اور وہیں شکار بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ تمہارے اور میرے جیسے کئی لیلیٰ مجنوں یہ دنیا بہت پہلے ہی نگل چکی ہے۔ ہم کوئی نئے نہیں ہیں اور میں اسی واسطے چپ ہوں کہ شاید تم بھی چپ ہو جاؤ۔ اور دنیا کا یہ وار خالی چلا جائے۔ مگر تم ہو کہ۔۔۔"
ولید نے کہتے ہوئے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔
"میں کیسے چپ ہو جاؤں۔ کیسے؟ مونس مرزا میرے گھر پرپوزل بھیج رہا ہے۔" عزت بے بسی سے چیخ اٹھی اور ولید پرپوزل کا سن کر یک دم چونک گیا تھا۔
اور پھر اگلے چند سیکنڈ زوہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔
"میں تمہاری طرح چپ نہیں رہ سکتی۔ یہ دنیا مجھے نگلتی ہے تو نگل جائے۔ میری محبت اور میری شدت بس یہی رہے گی۔ ولید رحمن۔ اور صرف ولید رحمن۔"
عزت نے با آواز بلند اپنا فیصلہ سنایا تھا اور ولید اس کے فیصلے پہ چکرا گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید



"امر پریم کا اگر کوئی لاؤ کا نام ہوتا تو وہ "سرمائی دھوپ" ہوتا۔" چمکیلی، روشن، مسحور کر کے، باندھ کے، مسرور کروا کر، بازو پھیلا کر آسمان کی اور اڑا لے جانے والی یہ سرمائی دھوپ۔۔۔

باہر کو اندر سے پرسکون کر دینے والی۔۔۔ اندر کو باہر سے لاتعلق کر دینے والی۔۔۔

سونا سونا ہوتی۔۔۔ سونا سونا پھیلتی۔۔۔ مگن مست بہاراں کر دینے والی سرمائی دھوپ۔

سر سر کم کے سارے گلاس۔۔۔ ابتدا کی طرف۔۔۔ انتہا کی جانب جیسے راج ہنسوں کے غول کے غول جھوم جھوم جاتے ہوں۔۔۔ اور اسی غول میں یک رنگ اور ہزار رنگی۔ سارے جہاں کی تتلیاں آن شامل ہوتی ہوں۔

"سرمائی دھوپ" اگر محبوب کا کوئی لاڈ کا نام ہوتا تو وہ بس یہی ہوتا۔ اور خوب ہوتا۔

ایسی دھوپ میں دالان کے ایک کونے میں بیٹھی بے سدھ کر دینے والی چھتی ہے۔۔۔ کیونکہ اسے منظر تمام ہونے سے ڈر لگتا ہے۔۔۔

منظر کیا ہوتا ہے۔۔۔؟

جو منظر سے ڈرایا جا رہا ہے اور پھر اس کی حیثیت اپنی ہی طرح میں کچھ ایسی ہے جو ہماری ہوتی ہے۔۔۔ ضروری بھی اور۔۔۔ اچھی۔ گندی بھی۔۔۔ ایک طرف

مکمل ناول



تھیں۔ دادی زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اپنے بالوں کا خود ہی مساج کر رہی ہیں۔ انہوں نے دانیہ سے کہا تھا لیکن اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے تو کچھ سنا ہی نہیں ــــ اور وہ کامل توجہ سے "تلن بلی کی بیٹی" پڑھتی رہی ساتھ ساتھ لنچ کی پھانکیں بھی منہ میں ڈالتی رہی۔

اماں فون پر بات کر رہی ہیں ــــ اور حماد کانوں میں ایئر فون لگائے میوزک سے لطف اندوز ہو رہا ہے ــــ کیونکہ اسے چلنے میں خاصی دشواری ہو رہی ہے اور اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں ایسے مڑ مڑ کر لہرا رہے ہیں جیسے خدانخواستہ اسے جھٹکے لگتے مرگی کا دورہ پڑ رہا ہو۔

اور وہ کونوں میں خود کو چھپانے والی موبائل انٹرنیٹ پر مصروف ہے ــــ نہیں نہیں وہ کسی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر نہیں ہے ــــ وہ کسی سے چیٹ بھی نہیں کر رہی ــــ ارے نہیں وہ کوئی مشہور زمانہ مشہور ڈیزائنرز کے کپڑوں کے ڈیزائن بھی نہیں نوٹ کر رہی ــــ وہ تو ــــ وہ تو مانچسٹر یونیورسٹی کے پاکستانی اسٹوڈنٹ سوسائٹی کے گروپ لیڈر کی ای میل پڑھ رہی ہے۔ اور اس کے ہاتھ پیر ایسے کانپ رہے ہیں جیسے ابھی ابھی اسے فریزر سے نکال کر دھوپ میں رکھ دیا گیا ہو ــــ یا جیسے اس کے کان میں کہا گیا ہو کہ جہاں تم بیٹھی ہو ٹھیک وہیں خزانہ دفن ہے ــــ پیچھے سے نکل لو۔ اب وہ یہ خزانہ چھپکے سے ہی نکالے گی ــــ اس سے اپنی چیخ دبائے نہیں دب رہی ــــ اور اس نے ہلکی سی چیخ مار ہی دی۔

سب سے پہلے تو دادی نے ہی اپنا ہاتھ روک کر اسے ناگواری سے دیکھا پھر سوائے دادا کے سب نے اس پر ایک ہلکی سی ناگوار سی نظر ڈالی مگر کسی نے اس سے پوچھا نہیں کہ کیا ہوا؟ کیوں چلائی ہو؟

دادا جو توبتہ النصوح پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اس کے پاس آ گئے۔

"امرحہ ــــ کیا ہوا؟" پیارے دادا صرف وہی پوچھتے تھے۔ دادا کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی ــــ تھوڑی دیر بعد دادا توبتہ النصوح کو سینے سے لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"او لے لیتے ہیں منڈی سے ــــ مجھ سے کہاں اٹھائے جائیں گے اتنے ــــ امرحہ! تم آجاؤ ساتھ۔"

"اسے لیے جا رہے ہو ــــ لٹ گئے بھئی ــــ منڈی بند ہو جائے گی یا آگ لگی ہو گی منڈی میں۔" دادی کی باریک آواز دنلی ہتھوڑے کی طرح بجی۔

"ہم دوسرے شہر کی منڈی میں چلے جائیں گے ــــ اگر وہاں بھی آگ لگی ہوئی تو ہمارا انتظار نہ کرنا۔ ہم شہر شہر منڈی منڈی آگ لگا کر آئیں گے۔"

"شہر شہر کیوں ــــ ملکوں ملکوں کیوں نہیں ــــ؟"

"ہاں بھئی اب تیار رہنا سب ــــ دنیا میں آگ بھڑکنے والی ہے ــــ"

"ارے کیا ــــ کب کی بھڑک چکی۔" دادی نے فوراً تڑکا لگایا۔

"بالکل ہے ــــ ہونا کا سا کی۔"

"چلو چلو میرا دماغ نہ کھاؤ۔"

"بی بی!" امرحہ نے ذرا گھور کر دادی کو دیکھا اور دادی نے اپنا رخ بدل لیا۔

"لو اب یہ مجھے بھسم کرے گی۔" انہوں نے خود پر آیات مبارکہ پڑھ کر پھونکیں۔

امرحہ وہیں کھڑی انہیں گھور رہی تھی اور وہ مزید رخ موڑ کر زیر لب دعائیں پڑھ پڑھ خود پر پھونکنے لگیں ــــ بہت خوفزدہ رہتی تھیں اس کی نظروں سے ــــ سب ہی رہتے تھے ــــ تباہی اور بربادی کی وجہ ــــ

یعنی اس کی پیدائش کے دن بڑے تایا چل بسے ــــ پھوپھی پھوپھا کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا ــــ چھوٹی پھپھو کے گھر شارٹ سرکٹ سے آگ لگی اور سارے ساز و سامان کو نگل گئی ــــ چچا کی بیٹی کی منگنی اس دن ہونا تھی تایا کی وفات سے وہ ملتوی ہوئی۔ بعد ازاں رشتہ ہی ختم ہو گیا ــــ اور تو اور ماموں کی الیکٹرونکس کی دکان میں پورے چار لاکھ کی چوری ہوئی ماموں صدمے سے چار دن ہسپتال رہے۔ امرحہ سے بڑے علی کی چھت سے گر کر بائیں ٹانگ کی ہڈی

ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ پورے دو سال لنگڑا کر چلتا رہا — ساتھ کے گھر کی طاہرہ آنٹی بیوہ ہو گئیں۔ ان کے شوہر کا فرانس میں ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا — ادھر دوسری لین والوں کی بہو کے مردہ بچے کی پیدائش ہوئی۔

یہ سب تو اوپر اوپر کے واقعات تھے — فہرست کافی لمبی تھی اور دن بہ دن لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی — مثلاً "اگر کوئی کہتا۔

"بس اماں جی! اپنے دھیان میں تھی۔ پتا ہی نہ چلا کب منا ہاتھ چھڑا بیٹھا —"

دلوی پوچھتیں کیا دن تھا —؟

"یہی منگل — آج ہی کے دن — بلک بلک کر رویا میرا حاشر — میں بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔"

"اچھا منگل — اور تاریخ کیا تھی —"

"تاریخ کی تیرہ —"

"اچھا — دو اور لو پورے منگل — یہ تیرہ بی بی اور منگل کی دو کو ہمیں یہ دہلیز نصیب ہوا تھا — اس دنیا پہ یہ ایسے عذاب بن کر آئی تھی — ہمارے خاندان پر بارہ ہر تاریخ والے منگل — کیا کریں گناہوں کے عذاب بھی تو بھگتنے ہی پڑتے ہیں نا۔"

اگلی بار منے کے ہاتھ چھٹنے کا قصہ بھی بابا کی نحس جنم پتری میں شامل کر دیا جاتا۔

اماں بھی چڑی رہتیں اس سے — اتفاق سے ہر سال لگ بھگ اسی دن ماموں کی دکان پر تین بار چوری ہو چکی تھی۔ تنگ آ کر ماموں نے دکان ہی بیچ دی اور دوسرا کاروبار کرنے لگے۔ اماں کو بھولتا ہی نہیں تھا کہ کیسے ان کے بھائی کی چمکتی دمکتی شاندار دکان بک گئی اور بھائی کو گلا سا ہو گیا۔

ایک دادا تھے جو پانچ وقت نماز پڑھتے اور صرف اللہ سے ڈرتے — احادیث پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے — جاہلانہ باتوں اور خیالات کو اپنے اندر رتی برابر جگہ نہ دیتے — ورنہ جمعرات کے جمعرات ان کے گھر چراغ جلتے — تین یا پانچ — بس طاق — جفت نہیں — دلوی مرنے والوں کے نام سے چھت کے کونے والے کمرے میں چراغ روشن کرواتیں۔

"کا مذہب ہو سب کے سب — کیا کبھی روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چراغ جلتے دیکھے ہیں — کیوں خلاف مذہب ایسے کام کرتے ہو؟"

دادی ہاتھ سے اشارہ کرتیں کہ جاؤ اپنا کام کرو۔

بابا نے اعظم مارکیٹ میں دکان کی نئے سرے سے آرائش کروائی تو افتتاح کے وقت ناریل پھوڑا — اعظم مارکیٹ کے دوسرے دکان دار ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے رہے — بابا صرف اتنا ہی کہتے رہے کہ وہ فلموں میں دیکھتے تھے تو انہیں بڑا اچھا لگتا تھا —

"کیا ہوا جو لگا لیا تو — تم سب تو کسی کو خوش بھی نہیں دیکھ سکتے — جمعرات کے جمعرات بابا چادر دیکھیں دیتے — دادا نے کہا۔

"کام والی ماسی کی بچی کے کان کا آپریشن ہونا ہے۔ بچپن سے ٹھیک سے سن نہیں پاتی۔ بہت غریب ہیں، تکلیف اللہ سے۔ اور نہیں تو دو تین معراتوں کے پیسے دے دو۔ کچھ میں ڈال دوں گی۔ اس کا آپریشن ہو جائے گا۔"

بہت بحث ہوئی۔ بابا نے دادا کو لادین قرار دے دیا اور دادا نے بابا کو بے حس۔ خیر دادی ٹوکتی رہیں کام والی کی بچی کا جیسے تیسے دادا نے آپریشن کروا دیا۔

تو بس یہ ماحول تھا گھر کا اور یہ منطق تھا گھر والوں کا۔ غلط باتوں کو پکڑ کر بیٹھے رہتے۔ بحث بھی کرتے اور اس پر لڑ مرتے۔ دادا تو بہت بیزار آ گئے کہتا رہتے۔ لیکن کسی پر بس ہی نہیں تھا۔

"نہیں ملے نا اولے۔" جب دونوں خالی ہاتھ گھر آئے تو دادی چمک کر بولیں۔ "منحوس کر گئے تھے دنیا میں آگ بھڑکا کر ہی واپس پلٹیں گے۔ اب ایسے کیسے واپس آ گئے۔ اور امرحہ اتم اتنا بن سنور کر دادا کے ساتھ منڈی گئی تھیں۔" دادا پوتی دونوں خاموشی سے کھسک گئے۔

ایسا نہیں تھا کہ ایک دادی ہی اسے منحوس مانتی تھیں۔ دادی اور اماں کی دیکھا دیکھی بہن بھائی بھی دادی کے سے پرہیز رکھتے تھے اور سب سے زیادہ بابا بھی۔

علی کی پتنگ کٹ جاتی تو چلاتا۔

"کس منحوس نے کہا تھا اوپر آنے کو... کٹ گئی نا میری پتنگ۔" وہ علی کو وہ سنا کر چھپ کر رونے لگتی اور خود کو کوستی جاتی۔

"میں منحوس ماری ہوں... میں منحوس ماری۔" دانیہ چپکے سے اماں سے کہا کرتی۔

"میرے کپڑے لایا کریں تو امرحہ کو نہ دکھایا کریں۔ یہ نہیں کیسا نظر ہے، میرے پہننے سے پہلے وہ دیکھ لیتی ہے تو مجھے زہر لگنے لگتے ہیں۔"

امرحہ غصے میں کپڑوں پر سیاہی، چکنائی کا داغ لگا دیتی اور وہاں لگا... جو دھو دھو کر بھی صاف نہ ہوتا... اور پھر رات کو کہیں چھپی بیٹھی روتی جاتی۔

"میں منحوس ماری... میں منحوس ماری..."

اس منحوس ماری کو دادا نے ذرا سنبھالا... ان ہی کے کمرے میں ایک طرف اس کا بیڈ رکھا تھا... ان ہی کے ساتھ بازار جاتی، سہیلی کے گھر جاتی... ان ہی سے پیسے لیتی... دادا ہی اس کے اماں بابا، بہن بھائی بن گئے۔ ایک رات اس نے بابا کو اماں سے کہتے سن لیا۔

"دکان پر چار لاکھ کا لکڑی کا کام کروا رہا ہوں... کسی کو بتانا نہیں۔ نظر لگ جاتی ہے... خاص کر اپنی امرحہ کو۔"

وہ رات بھر روتی رہی... ہچکیاں لیتی رہی۔ بد دعائیں بھی دیتی رہی کہ وہ مر جائے یا لکڑی کے سارے سامان کو آگ لگ جائے... لیکن نہ وہ مری نہ سامان کو آگ لگی۔ البتہ بابا کے چار لاکھ روپوں میں سے پورے ڈیڑھ لاکھ گم ہو گئے... چھوٹی پھپھو آئیں اور اپنی کوئی مجبوری بتا کر پیسے لے گئیں۔ بابا اماں سے چڑ گئے۔

"کہا تھا نا کسی کو مت بتانا... لو کروا دو دکان کا کام۔"

سارا عذاب امرحہ پر نہ آ جائے، دادا نے اپنے دوست سے لے کر دیے پیسے اور پھر کہیں جا کر بڑی پھوپھو دکان کے آگے۔

تو یہ حیثیت ہے ہماری ہیروئن کی کہ پیدائش سے لے کر بڑے ہونے تک ایسا ہزاروں بار ہوا... وہ بول لیتی... بہن بھائیوں کو مار بھی لیتی لیکن رات رات بھر روتی بھی رہتی... اس کا جی چاہتا کہیں بھاگ جائے، چھپ جائے... گم ہو جائے کہ کسی کو یاد نہ رہے کہ اس کی پیدائش کی خبر سنتے ہی دادی کے دماغ پر چوٹ آ گئی تھی... بعد ازاں اماں کے کمر درد نے بھی اماں کو سکون کا سانس نہ لینے دیا۔

دانیہ، حمنہ، علی کبھی جل کر کبھی مذاقاً اور کبھی صرف اسے روتے دیکھنے کے لیے اسے اس کی نحوست کے قصے سناتے رہتے کہ وہ بھول نہ جائے کہ وہ کون ہے۔ اسکول میں ایک بار ٹیچر کی کرسی کا پایہ جو اس سے ٹوٹ جانے... بیٹھا تھا... کیا ہوا... ہی دھڑام سے نیچے آ گریں تو وہ فوراً "کھڑے ہو کر

رونے لگی اور اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تیمچہ۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ کرسی خود بخود ٹوٹی ہے۔ میں سچ بول رہی ہوں۔"

تیمچہ کبھی سر پہ ہاتھ رکھ کر کہہ دیتیں کہ سر میں درد ہے تو وہ سہم جاتی۔ "میں نے آپ کے سر کو نہیں دیکھا۔ سچ بالکل نہیں دیکھا۔"

خاندان کی تقریبات میں وہ انہی کارناموں کی وجہ سے جانی نہیں تھی جو سارے خاندان میں ایسے مشہور تھے جیسے شالوں میں کشمیری شال اور میووں میں چلغوزہ۔

ایک بار وہ گئی تو بارات جسے دن دو بجے دوسرے شہر سے آنا تھا' آئی ہی نہیں۔ شام سے رات ہو گئی۔ ان کی گاڑیاں موٹروے پر خراب کھڑی تھیں۔ دولہا باراتیوں کے بغیر آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب تک لاہور سے نئی کاریں بھیجی گئیں اور وہ سب ان میں بیٹھ کر آئے' رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سب مہمان جا چکے تھے اور صرف قریبی عزیز ہی موجود تھے۔ وہ بھی دادا کے ساتھ جلدی سے گھر واپس آگئی اور اپنے ڈزائنر ڈریس کو آگ لگا دی۔ اس کے سب عزیز اس کے گرد گھیرا بنائے اس کا ریکارڈ لگانے میں مصروف تھے۔

"نانا! ذرا پوچھے کھانا جل گیا یا بچ گیا۔ امرحہ آئی ہیں نا آج۔ بجلی کے کنکشن بھی چیک کروا لیجیے گا۔ شارٹ سرکٹ سے آگ نہ بھڑک اٹھے۔"

"میں تو دعا کرتی ہوں کہ دولہا بھائی خیریت سے آجائیں۔"

"مجھے تو دلہن کی فکر ستائے جا رہی ہے۔ سنا ہے دولہا کی کار کا پہلے حادثہ ہوا ہے۔"

"لنگا تو بچ گیا لیکن اس کے بیل جل گئے۔ ویسے آئرن مشین جل جاتی تو نہیں۔ مگر خیر۔ یہ بھی ہو سکتا ہے' آج تو۔"

"ہم سب تو مذاق کر رہے تھے امرحہ تو سنجیدہ ہی ہو گئی۔" وہ رونے جیسی ہو جاتی تو کوئی کہہ دیتا۔

کچھ گھنٹے وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے...

"چار پانچ گھنٹے سے پہلے بارات نہیں آئے گی۔ سب امرحہ سے سوری کہو۔ اس نے ہمارا سوری قبول کر لیا تو شاید بارات جلدی آجائے۔"

"شٹ اپ۔" وہ اتنی زور سے چلائی کہ دس بارہ کا گروپ سن سا ہو گیا۔

"میں تمہارا منہ توڑ دوں گی حسان۔"

"منہ تو تمہارا توڑا جانا چاہیے جو اپنی ساری نحوست لے کر میری بہن کی شادی خراب کرنے آگئیں۔"

امرحہ کا جی چاہا' وہ سارے پنڈال میں آگ بھڑکا دے۔ کاش واقعی شارٹ سرکٹ ہو جائے اور سارے روشن قمقمے بجھ جائیں۔ تاکہ اس کے دھاڑیں مار مار کر رونے' تاریک چہرے اور کپکپاتے وجود کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ وہ کب سے سب کے مذاق میں چھپے طنز کو جھیل رہی تھی۔ لیکن حسان تو زندہ نامہ کہہ کر الزام لگانے ہی آگیا تھا۔

"وضو کرنے کے بعد مسجد جانے سے پہلے خود کو آئینے کے سامنے کھڑا کر کے ضرور دیکھنا۔ شاید دوبارہ کبھی مجھے یہ سب کہتے تمہاری زبان لڑکھڑا جائے۔ اور تمہیں یہ بات سمجھ میں آجائے کہ کچھ بھی برباد اور آباد کرنے کی طاقت انسان کے ہاتھ میں ہے نہ اختیار میں۔ حکم کن اور عمل فیکون' رب کی قول ہے اس کے بندوں کی نہیں۔" بمشکل خود کو رونے سے بچاتے اس نے کہا۔

دادا کو لے کر وہ جلدی سے گھر آگئی۔ اس کی سگی خالہ زاد کی شادی تھی اس کے دل میں بھی ارمان تھے شادی کو لے کر۔ اس نے خاص اس شادی کے لیے بہت تیاریاں کی تھیں۔ لیکن سب نہ صرف بے کار گیا بلکہ اسے دکھ دے کر گیا۔ اس نے ایک سفید کاغذ پر "میں کبھی کسی تقریب میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ وعدہ" لکھ کر اپنی الماری کے اندرونی شیلف پر چپکا دیا۔ جب بھی اس کا کہیں جانے کو دل چاہتا' وہ الماری کھول کر اپنے وعدے کو یاد کر لیتی۔

یہ سب وہ کرتی تو تھی' لیکن بہت آگے کبھی ہو لی گئی۔

وہ آسانی سے رو پڑتی ۔۔۔ اسے آسانی سے رلایا جا سکتا۔

جیسے کہ کوئٹہ والے ماموں سال میں کبھی ایک بار آجاتے تو لحاف میں دبک کر کلی کا بڑا کش پیتے ہوئے کہتے۔

"بلاؤ ذرا امرحہ کو ۔۔۔ اسے رلائیں۔"

وہ آ جاتی تو ماموں کھینچ کھانچ کر لے جاتے ۔۔۔ ہنس ہنس کر سب لوٹ پوٹ ہوتے ۔۔۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہوتی اور ماموں اس کی نحوست کا ایک ایک قصہ حوالہ جات کے ساتھ سنائے جاتے۔ اماں اسے ڈانٹتی۔

"مذاق کر رہے ہیں ماموں امرحہ ۔۔۔ کیوں ایسے دھاڑیں مار رہی ہو۔" دادا آتے اسے کو ڈانٹ کر لے جاتے۔

"جاہل لوگ ہیں امرحہ! ان پر توجہ نہ دیا کرو۔"

وہ کون سی عالم تھی جو خود کو اچھی طرح سے سمجھا لیتی ۔۔۔ نو عمر ۔۔۔ نازک دل کی ۔۔۔ بس رو رو بیچ والی لڑکی ہی تو تھی اور پھر ہر بار تو خود کو ایسے مطمئن نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"سب جاہل ہیں۔" "پرسکون ہو جاؤ۔"

"سب پاگل ہیں۔" "بالکل ٹھیک ہے۔"

ایسا سوچا جا سکتا ہے ۔۔۔ کہا جا سکتا تھا ۔۔۔ لیکن ایسا ٹھیک ٹھیک ہو نہیں پاتا ۔۔۔ وہ ذلت اگر سو فیصد ہوتا بھی تو اگلی بار "صفر" ضرور ہو جاتا ہے ۔۔۔ وہ جتنا خود کو "یہ سب جاہل ہیں" کہہ کر بہلاتی اتنا ہی اگلی بار ان سب جاہلوں کی باتوں پر پچھلی سے روتی۔ دادا کی باتیں اسے ٹھیک ٹھیک کر سلاتی تھیں تو اسی نیند میں وہ ان سب کی باتوں پر کراہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

دادا گورنمنٹ پنجاب پبلک لائبریری میں لائبریرین تھے۔ اسکول کی چھٹیوں میں وہ سارا دن پنجاب لائبریری میں گھومتی پھرتی رہتی۔ ویسے بھی اسے کم سے کم گھر میں رہنے دیتے تھے وہ اسکول سے پیدل چل کر لائبریری آجاتی دونوں دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے۔ اسی ملازمت سے دادا حضور نے ہزاروں کتابیں پڑھی تھیں اور اسی لیے وہ جمعرات کو مرنے والوں کے نام کے دیے نہیں جلاتے تھے۔ شام کو دونوں چہل قدمی کرتے۔ مال کی لمبی سڑکوں سے ہوتے ہوئے گرم گرم بھنے چنے اور راکھ کی چھلی کھاتے رات گئے گھر آتے۔ امرحہ کا دل چاہتا کہ رات کو بھی گھر نہ جائے اور جھولے سے مال کے فٹ پاتھ پر سو جائے۔

گھر پہنچ کر نظر پڑتے ہی دادی کہتیں۔

"ہو آئی چڑیل۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم کتابیں پڑھ پڑھ کر ۔۔۔ ڈھنگ کی نوکری مل جاتی تو عقل تو نہ جاتی۔"

لیکن دادا کو ڈھنگ کی نوکری تو نہ ملی لیکن ڈھنگ سے عقل ضرور مل گئی۔ بابا نے اپنے زمانے کی آٹھ کو فرنیچے اپنی دوکان پر رکھ کر سیل کر دیا ۔۔۔ چاچی نہ جتنا نہ آٹھ جماعتیں پڑھے ہیں یا آٹھ تک تھی ۔۔۔ علی بڑا تھا اور کمال کا بڑا تھا۔ ہر جماعت میں سینئری رہتا دو سال ضروری لگاتا ۔۔۔ پھر چلو تھا ۔۔۔ اسے دنیا بھر کے گانے والوں کا پتہ تھا، انہیں نچانے والوں کے نام گھر، شہر، قومیت، مذہب، شادی، بچوں، افیئرز کے بارے میں تو معلوم تھا لیکن یہ نہیں کہ ایف اے کے بعد کی ڈگری کو کیا کہتے ہیں اور اسے پاس کیسے کرتے ہیں ۔۔۔ کتنا چاہا دادا نے کہ ایک انجینئر بن جائے، ایک کم سے کم دیال سنگھ کالج میں لیکچرار ۔۔۔ ورنہ ایک کسی ہسپتال میں ڈاکٹر اور ایک پاک آرمی میں کپتان ۔۔۔ لیکن دادا کے سوچنے سے تو کچھ نہیں ہوتا نا ۔۔۔ ویسے ان کے کہنے سے بھی کچھ نہیں ہوا ۔۔۔

پھر امرحہ کا نمبر تھا "مگر وہ بھی نہیں تھی اور کیونکہ منحوس لڑکی تھی تو ہر وقت روتی رہتی ۔۔۔ بڑی مشکل سے دادا نے اسے آٹھ جماعتیں پاس کروائیں اپنے رونے کے دوران ایک بار تو اس نے پڑھائی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور مکمل بھی۔ سارا سارا دن دادا کے ساتھ لائبریری رہتی۔

دادا نے منت کی "امرحہ میٹرک کر لو۔"

پرنسز امرحہ کے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ بس ہر بات پر ایک ہی رٹ "بھاگ جاتے ہیں گھر سے نہیں۔"

دادا کے پاس تھوڑے سے جو پیسے تھے ان سے اسے اپنے دوست کے گھر بلوچستان لے گئے ہفتہ رہ کر آئے۔ خاندان میں تو کہیں وہ جاتی نہیں تھی۔ وہاں بہت خوش رہی۔ پھر دادا سے کہنے لگی۔

"دادا آپ دبئی چلے جائیں پھر مجھے بھی وہیں بلا لینا ۔۔۔ بڑے خوش رہیں گے ہم دونوں۔"

دادا اس عمر میں کیا دبئی جاتے "ہاں" پھر بھی اس سے وعدہ کر لیا۔

"میٹرک کر لو پھر چلا جاؤں گا ۔۔۔"

اس نے دبئی کے لیے ۔۔۔ میٹرک کر لیا ۔۔۔ خوب جی جان لگا کر کیا مگر اتنی جی جان لگانے پر بھی سیکنڈ ڈویژن میں ۔۔۔ جو ہر کس و ناکس کے ہاتھ آہی جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

انہی دنوں نیا واقعہ ہوا تھا کہ بابا کا ہاتھ جل گیا۔ دادی بولنے لگیں اس نے آگے سے جواب دیے تو بابا نے غصے سے جلا ہوا ہاتھ تو اس کے گال پر کھینچ دیا ۔۔۔ اور مزید غصے سے اس نے اپنا سر دیوار میں زور سے دے مارا ۔۔۔ اس کے خون نکلا ۔۔۔ سر میں بہت درد ہوا اور اس درد اور خون کو بھلا کر وہ بابا کے تھپڑ کو لے کر روتی رہی ۔۔۔ رات کے پچھلے پہر سے آخری پہر تک ۔۔۔ پھر اپنے اسکول بیگ میں اپنے چند کپڑے رکھ کر گھر سے نکل گئی ۔۔۔ چلتی گئی ۔۔۔ چلتی گئی ۔۔۔ گھر کی سڑک کو پار کیا۔ بڑی سڑک تک آئی۔ اسے بھی پار کر گئی چلتی گئی ۔۔۔ چلتی گئی ہے ۔۔۔ حد تو یہ کہ پہلی بار سڑک پر یہاں وہاں پھرتے آوارہ گندے مندے کتوں سے بالکل نہیں ڈری ۔۔۔ وہ آنکھوں میں اشک لیے ۔۔۔ کندھے پر اسکول بیگ لٹکائے ایسے چلتی جا رہی تھی جیسے خدانخواستہ دنیا میں اکیلی ہو۔

کچھ دور آگے جا کر سمجھ میں نہ آیا کہ اب کہاں جائے ۔۔۔ تو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"تھکا ڈالا تم نے مجھے امرحہ!" دادا بھی فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ پہلے خود پانی پیا پھر اسے پلایا۔

"میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔" پانی پی کر وہ چلائی۔

"ایک دن تو تمہیں وہ گھر چھوڑنا ہی ہے ۔۔۔ وہ تمہارا گھر ہے بھی نہیں میرے بچے۔"

"جانتے کیوں نہیں ہیں آپ دبئی ۔۔۔ کر لیا ہے نا میں نے میٹرک ۔۔۔"

دادا آزردہ ہو گئے۔ "میں بوڑھا کمزور بیمار شمار رہنے والا بندہ اب کہاں بیٹھوں گا ملک سے باہر وہ بھی کمانے ۔۔۔ خود سوچ بچے ۔۔۔ کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں میں ۔۔۔ اور پھر ابھی تو تو کیا ہو۔"

"وعدہ کیوں کیا تھا؟"

دادا ۔۔۔ چپ ہی رہے ۔۔۔ نو عمری پھر امرحہ جذباتی بھی تھی ۔۔۔ اب کوئی جھوٹی تسلی اسے نہیں دی جا سکتی تھی۔

"تم کہاں نہیں چلی جاتیں امرحہ؟"

"کہاں۔" اس نے کندھے سے اسکول بیگ اتارا۔

"دبئی امریکا آسٹریلیا کینیڈا فرانس۔"

"میں امریکا فرانس۔" وہ اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی کہ دادا کو کیسے لطیفے یاد آ رہے ہیں۔ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

"ہاں نا ۔۔۔ مرزا کمال کی نواسی نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا ہے اس سال۔ اسے اسکالر شپ ملا ہے۔ دو دن ہوئے وہ کینیڈا چلی بھی گئی ۔۔۔ امرحہ! تو بھی ایف ایس سی میں ٹاپ کر لے۔"

"میں ۔۔۔؟"

"ہاں امرحہ بچے ۔۔۔ ٹاپ کر اور چلی جا ۔۔۔ مرزا کمال کی نواسی سات سال بعد آئے گی بلکہ سمجھ آئے گی ہی نہیں ۔۔۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد اسے کینیڈا میں ہی تین سال لازمی سروس کرنی ہو گی ۔۔۔ یوں ہو

گئے دس سال۔۔۔ دس سال وہ بھی کینیڈا میں۔۔۔ جہاں بیس پچیس لاکھ لگا کر جایا جاتا ہے' وہ مفت پہنچ گئی۔ دیکھو تو امرحہ! پڑھائی کے کتنے فائدے ہیں آپ خود کو منوالو تو دنیا آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔" رات کے آخری پہر سڑک کے کنارے بیٹھے دادا اسے فلسفہ کے معلم اول ارسطو سے کم نہیں لگ رہے تھے جو سکندر اعظم کو تاریخی فاتحوں کی فتوحات بڑے سلیقے سے سمجھا رہا تھا۔

اور پھر سکندر اعظم بھی تو فاتح رہا تھا۔

اور یوں اس نے بہت دل سے دادا کے ساتھ جا کر کالج میں داخلہ لیا۔۔۔ رات دن پڑھائی۔۔۔ بس پڑھائی۔۔۔ مطلب کرنا ہے اس نے خود پر لازم کر لیا۔ اسے اتنا یقین تھا خود پر کہ وہ خود ہی سب فرینڈز کلاس فیلوز کو بتاتی پھرتی۔

"مجھے تو کینیڈا جانا ہے۔۔۔ پورے دس سال رہوں گی وہاں۔"

"ڈاکٹر بن جاؤں گی۔۔۔ مزے سے اپنی زندگی گزاروں گی۔"

"ہاں' ہاں! میرے پلان میں ہمیشہ سے یہی شامل تھا مجھے اپنی زندگی کسی یورپین کنٹری میں ہی گزارنی تھی۔"

"بس کسی طرح یہ چند سال گزر جائیں۔۔۔ امتحانات ہوں اور میں جاؤں۔۔۔"

ان دو سالوں میں وہ بہت خوش رہی۔ اس نے کینیڈا کی اتنی معلومات اکٹھی کر لیں کہ خود کینیڈین بھی وہ سب نہیں جانتے ہوں گے جو وہ جاننے لگ گئی تھی۔ دادا نے اسے وہ ساری کتابیں لا دیں جن میں لفظ کینیڈا شامل تھا۔

اور پھر رزلٹ آ گیا۔۔۔ لیکن افسوس۔۔۔ وہ اسے پنس بھی نہ لے سکی۔۔۔ رو رو کر اس نے اپنا حشر کر لیا۔ دادا نظریں چرائے چرائے پھرتے چھپکے چھپکے دو تین جگہ اپلائی کیا اسکالرشپ کے لیے' لیکن جہاں ذہانت والوں کی بھرمار ہو وہاں خالی خولی "اے گریڈ" کو کون پوچھتا ہے۔ دادا کو ان دنوں معلوم ہوا کہ ملک میں کتنی بڑی تعداد اول لائق فائق لوگوں کی ہے۔ جہاں جہاں وہ اس کا فارم جمع کروانے گئے تھے وہاں ہم عمر دیکھ کر انہیں خوشی تو ہوئی لیکن اپنی امرحہ کے لیے افسوس بھی ہوا۔ وہ اسی وقت سمجھ گئے کہ اسے مشکل سے ہی کوئی اسکالرشپ ملے گا۔۔۔ اور وہی ہوا۔ اسے معذرت کے تین آفیشل لیٹرز آ گئے تو اداروں کی طرف سے' ایڈمیشن فارم نہ آئے۔

گھر والوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ دادا پوتی کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ امرحہ کا نظارا تربے کا نام کیوں نہیں لے رہا۔۔۔ امرحہ اور دادا میں بات چیت کیوں بند ہے۔۔۔ امرحہ سے دادا جی دادا جی کیوں نہیں کہتی پھرتی۔۔۔ اور اسے کلاس فیلوز اور فرینڈز کے فون آتے رہے۔

"کب جا رہی ہو کینیڈا۔۔۔ دیکھو بھول کر جانا۔"

"قسمت ہے تمہاری جو اتنی دور جا رہی ہو۔۔۔ میں تو تمہیں دیکھ کر امرحہ نے لگتی ہوں۔"

اس نے دو سالوں میں اتنے یقین سے اپنے جانے کے بارے میں کہا تھا کہ سب کو کامل یقین تھا کہ اب بس وہ گئی۔۔۔ وہ سب طنز نہیں کرتی تھیں پر امرحہ کو تو طنز ہی لگ رہے تھے نا۔۔۔

☼ ☼ ☼

بابا نے اس کی منگنی کر دی۔۔۔ اس نے بھی کروا لی کہ کینیڈا تو گئے نہیں دوسرے گھر ہی چلو۔۔۔ لیکن دوسرے گھر بھی نہ جا سکی۔۔۔ چھ ماہ بعد ہی منگنی ٹوٹ گئی۔ ظاہر ہے انہیں بھی خبر ہو گئی کہ اس لڑکی کی پیدائش اور بعد از پیدائش سے کیسے کیسے واقعات جڑے ہیں۔۔۔ بابا کو غصہ تو بہت آیا لیکن کیا کر سکتے تھے۔۔۔ اماں اور دادی پر ناراض ہوئے کہ کیوں ایسی ایسی باتیں کر کے اسے اتنا مشہور کر دیا ہے کہ اس کا رشتہ ہی ختم ہو گیا۔ اماں اور دادی پچھتائیں پر اب تو دیر ہو چکی تھی۔۔۔

پھر دوسرا رشتہ ہوا۔ بابا نے فوراً" شادی کی تاریخ دے دی لڑکے والوں کو۔۔۔ منگنی نہ نکاح فوراً" شادی اور عین شادی سے پندرہ دن پہلے جس دن وہ اپنا شرارہ

پہن کر دیکھ رہی تھی اسے لڑکے کی جوان بہن کے بیوہ ہونے کی خبر ملی۔۔۔ قصہ ہی ختم۔

اور اس بار اسے خاندان سے وہ وہ کچھ سننے کو ملا کہ اس نے دادی کی نیند کی گولیاں کھالیں۔

ہفتے بعد جب وہ ٹھیک ہو کر گھر آئی تو اس کا دل چاہا کہ پھر سے گولیاں کھالے اور فوراً" مرجائے۔ اماں بابا کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر روتے ہوں۔۔۔ دادی "ہائے میری جوان بچی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔" کہہ کہہ ہچکیاں لیتی ہوں۔۔۔ اور دادا ہمیشہ کے لیے اس گھر کو چھوڑ دیں اور بابا 'دادی دیوانوں کی طرح دادا کو ڈھونڈتے ہوں اور دادا رات کو چھپ کر اس کی قبر پہ آتے ہوں۔ اسے اپنی موت کے تصور سے ایسے راحت ملی کہ سب روتے پھریں گے جنہوں نے اسے رلایا ہے۔ مگر وہ صرف یہ تصور ہی کرتی رہی 'دوبارہ ہمت نہ ہوئی موت کو گلے سے لگانے کی۔ دادا اس سے بات کرنے کی اسے منانے کی کوشش ہی کرتے رہے۔

جوان لڑکی نے خود کو ختم کرنے کی کوشش کی اور یہ سب ان جاہلانہ باتوں کی وجہ سے ہوا تھا جو وہ بچپن سے اپنے لیے سن رہی تھی۔ اگر وہ نیند کی گولیاں نہ بھی مرتی تو ذہنی دباؤ سے مرجاتی۔

"میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں امرحہ! کہ میں تمہیں پڑھنے کے لیے باہر ملک بھیج سکوں۔۔۔ شادی بھی تمہاری نہیں ہو رہی۔۔۔ میں نے تمہارے بابا سے بات کی تو وہ الٹا مجھ پر چیخنے لگا کہ وہ تمہارے لیے لاکھوں روپے لگا کر تمہیں پڑھنے کے لیے بھیجے اس سے اچھا ہے وہ تمہارے لیے سونے کے زیورات بنوا کر رکھ لے یا تمہارے نام کے پیسے بینک میں رکھوا دے تاکہ تمہاری شادی میں کام آسکیں۔

امرحہ! میں بے زار ہوں ایسے لوگوں سے جو مقدس راتوں کو لمبی لمبی عبادتیں کرتے ہیں اور سال کے بارہ مہینے گناہ کی مختلف حالتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔۔۔ جھوٹ 'حسد' بے ایمانی 'غیبت سے خود کو بچانے کی رائی برابر جدوجہد نہیں کرتے اور وضو کر کے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تمہاری سابقہ ساس جنہوں نے شادی کو ختم کیا وہ مذہبی جلسوں میں احادیث کا حوالہ دے کر مذہبی تقاریر کرتی ہیں۔۔۔ میں اسی لیے بہت مطمئن تھا کہ تمہاری شادی وہاں ہو جائے۔۔۔ پر وہ بھی وہی خوش رنگ پھل نکلیں جو اندر سے گلا سڑا اور بدبودار ہو تا ہے۔۔۔ ہماری یہ منافقت معاشرے کے سکون کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔۔۔ ہم جو خود کو سیدھے راستے کی طرف سمجھتے ہیں نہایتی طرف جارہے ہیں۔۔۔ الٹے پیروں جارہے ہیں۔

امرحہ! میرے دل کے ٹکڑے دوبارہ مرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں بھی خود کو مار ڈالوں گا۔۔۔ اپنی تعلیم کو محنت سے ذمہ داری سے حاصل کرو۔۔۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور بن جائے گا۔"

بابا نے اسے بلوچستان کا ایک اور پندرہ روزہ کورس کروا دیا اور پھر اسے منا کر کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ لیکن اب اس کی زندگی تھوڑی سے زیادہ تلخ ہو چکی تھی کیونکہ اب اس کی دو منگنیاں ٹوٹ چکی تھیں۔۔۔ خاندان میں کوئی اسے لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ماموں نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے وانیہ کا ہاتھ مانگ لیا۔

اماں اور دادی نے خود سے امرحہ کا کہا بھی لیکن ماموں وانیہ کے لیے ہی اصرار کرتے رہے۔

"اتنے ڈرپوک ہیں سب کہ رسک لینے کے لیے تیاری نہیں۔" وہ تپ کے دادا سے کہتی۔

"جو خدا سے دور ہوتے ہیں وہ ایسے ہی خوف زدہ ہوتے ہیں۔"

میں تو خدا سے دور نہیں پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں؟

"کبھی کبھی قدرت بے خبر سوئے پڑوں کے سر پر کنکر مارتی ہے تاکہ وہ بیدار ہو جائیں اور اپنے مقصد حیات کی طرف لپکیں۔"

☼ ☼ ☼

اسی دوران کچھ یہ بھی ہوا کہ جس سے اس کی منگنی ٹوٹی تھی اس کی شادی اس کی خالہ زاد ماریہ سے ہو گئی

۔۔۔ مزید یہ کہ اس لڑکے کی فوراً "پروموشن" ہوگئی اور کمپنی کی طرف سے اسے ایک بہترین گھر مل گیا۔ شادی کا تحفہ یورپ کا ایک ماہ کا ٹور۔۔۔ مائرہ نے ایک دن اسے فون کیا۔

"میں نے تو افراسیاب سے کہا کہ شہوت سے شادی کر کے بچ گئے ورنہ اگر امرحہ۔۔۔ خیر۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ ویسے اچھے خاصے کنگلے ہو جاتے اور پتا نہیں کیا کیا ہو جاتا ان کے ساتھ۔"

وہ خاموشی سے مائرہ اور افراسیاب نامہ سنتی رہی۔۔۔ عاجز آکر مائرہ نے پوچھا۔

"کچھ تم بھی بولو۔۔۔ کچھ کہو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔۔۔ اتنا جواب ہی کافی تھا۔

کالج وہ جاتی رہی۔۔۔ دادا سے کم کم بات کرتی۔ ان سے ناراض تھی۔ دادی اور اماں ابا سے گھر میں کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ گھر میں آگ بھڑکتی دادی کے بیچ میں موج آجاتی۔ حماد کا موٹر سائیکل کا حادثہ ہوتا یا بابا کو دکان پر کوئی نیا نقصان اٹھانا پڑتا۔۔۔ کوئی کچھ نہ کہتا کیونکہ اب یہ ٹھیک زور و شور سے وہ بھول بیٹھے۔۔۔ رکھا تھا۔۔۔ امرحہ کو ایسا لگتا کہ نادر کی کا ایسا جنگل ہے جس میں وہ بھٹکتی پھر رہی ہے لیکن روشنی کی کرن ہے کہ آکر نہیں دے رہی۔۔۔ اسے لگتا کہ دنیا سب کچھ بھول جائے گی لیکن امرحہ سے متعلق کچھ نہیں بھولے گی۔۔۔ وہ دعا کرتی کہ کاش کوئی ہوا چلے اور سب کے ذہنوں سے اس کا نام مٹا ڈالے۔۔۔ نہ کسی کو اس کا نام یاد رہے نہ اس نام کی شخصیت سے جڑے واقعات۔۔۔ گھر میں مہمان آتے تو وہ لائبریری چلی جاتی۔۔۔ وہاں بھی شام تک ہی رہ سکتی تھی۔۔۔ پھر دادا اسے لیے لیے گھومتے پھرتے وہ دادا سے بات نہ کرتی مگر ان کے ساتھ ساتھ گھومتی رہتی۔۔۔ دادا جانتے تھے وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے خوف زدہ رہتی ہے خاص کر رشتے داروں اور جاننے والوں کا۔۔۔ اور یہ خوف ان ہی لوگوں نے اس کے اندر پیدا کیا تھا۔

وہ خاندان کی تقریبات اور گھر میں کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی پھر بھی وہ ان سب میں بے حد مقبول تھی۔۔۔ وہ ڈسکس کیے جانے کے لیے قہقہے لگانے کے لیے ایک بہترین موضوع تھی۔ سانپ سیڑھی کا وہ کھلاڑی جسے بار بار سانپ کھا لیتا ہے اور اس کی دم سے نکلتا وہ سب سے پچھلے درجوں میں آجاتا ہے۔۔۔ بار بار۔

امرحہ جیسی خوب صورت لڑکی کو بار بار نچلے درجوں میں دیکھنا خاندان کی حاسد لڑکیوں کا پسندیدہ مشغلہ بھی تھا اور وہ حاسد لڑکیاں ہی کیا۔۔۔ کون ہے جو اپنے لیے پہلا نمبر اور دوسروں کے لیے آخری نمبر پسند نہیں کرتا۔۔۔

لیکن انسان تو وہی ہے نا جو اپنی خود نمائی بے شک کرتا پھرے لیکن دوسرے کی خامی کی پردہ پوشی ہر حال میں کرے۔

اور ایسے انسان اب انسانوں کے ڈھیر میں کہاں ملتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اپنے آپ سے تنگ آکر اپنے ماحول سے تنگ امرحہ کا دن بدن بوجھل اور بے زار رہنے لگی۔ نہ معلوم یہ قدرت کا طریقہ کار تھا یا قدرت کی ترغیب کہ اپنے اس بدتر ہوتے ماحول سے نکلنے کے لیے اس نے کوشش تیز تر کر دی۔ ڈیڑھ سال کے دوران اس نے مختلف بیرونی کالج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالرشپ فارم بھرے۔۔۔ لفظی پرسنٹ سکسٹی پرسنٹ سیونٹی پرسنٹ بس نے کسی یونیورسٹی کے کسی بھی طرح کی اسکالرشپ کو جانے نہ دیا۔ دادا نے اس دوران بابا کو منانے کی بہت کوشش کی کہ چند لاکھ کی بات ہے بچی پر لگا دیں۔ پڑھ لکھ کر لوٹا دے گی لیکن بابا کو یہ مشورہ ہی سراسر ایک مذاق لگتا۔۔۔

"بھلا پڑھنے لکھنے پر کوئی لاکھوں لگاتا ہے؟"

مانچسٹر یونیورسٹی کے طلبا کی سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے پانچ اسکالرشپ دے رہی تھی۔ اسے وہاں سے بھی انکار ہو گیا۔۔۔ دو سالوں میں اس نے دو سو بار "سوری یو آر اے گڈ اسٹوڈنٹ' بٹ وی کانٹ ہیلپ۔۔۔ بیسٹ آف لک۔" "ہم معذرت چاہتے ہیں آپ

اچھی طالبہ ہیں لیکن ہم آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے) جیسی سطریں پڑھی تھیں پھر اس نے گنتی چھوڑ دی تھی۔۔۔ لیکن ظاہر ہے انکار ناکامی کی کوئی حد بالشبہ نہیں ہوتی لیکن انکار سننے اور ناکامی سہنے والوں کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔

مانچسٹر یونیورسٹی کے اس انکار نے اسے ایک بار پھر گھٹنوں میں سر دے کر رلا دیا۔۔۔ اور اس نے بہت خفا ہو کر بہت جل کر ایک آخری میل انہیں ضرور کی۔۔۔

"میں ہوں ہی منحوس ماری۔۔۔ میں جل کر مر جاؤں تو ہی اچھا ہے۔۔۔ بھاڑ میں جاؤ تم سب اور تمہاری اسکالرشپ آفر۔۔۔"

اگلے ہی دن اسے ایک لمبی میل موصول ہوئی جس میں انتھک کوشش کرنے اور کبھی نہ ہار ماننے پر ایک بڑا سا لیکچر تھا۔ ساتھ ہی دنیا بھر کے ان کامیاب انسانوں کی مثالیں تھیں جنہوں نے بدترین حالات میں شاندار کامیابیوں کی بنیاد رکھی تھی۔ ان میں سرفہرست نام محمد علی کلے اور چارلی چپلن کا تھا۔۔۔ ساتھ ہی اسے بہت نرم انداز سے بتایا گیا تھا کہ میٹرک میں اس کا اے پلس ہے ایف ایس سی میں صرف اے اور یونیورسٹی میں بھی بہت مشکل ہے کہ وہ اے پلس کے ساتھ کرے گی۔۔۔

ایسی صورت میں جبکہ اس کے پاس شاندار اکیڈمک رزلٹ نہیں ہے۔۔۔ وہ جیسے اسے دوسرے شاندار تعلیمی قابلیت رکھنے والوں کے مقابلے میں اسکالرشپ دے دیں۔۔۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہو گی۔

"افسوس! آپ بڑے افسوس کے عالم ہو!۔۔۔"

آخر میں ایک چھوٹی سی سطر لکھی گئی۔ جو کچھ یوں تھی۔

"پھر بھی ہم سب سوچ رہے ہیں شاید آپ کے لیے کچھ کر سکیں۔ ہمیں وقت دیں۔"

اس نے وقت دے دیا۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس دوران اس کا بی اے کا رزلٹ بھی آ گیا۔ اسے لگا تو جیسے بورڈ والوں نے اس پر حرام ہی کر دیا تھا کہ جتنی بھی محنت کرلے امرحہ کو اے پلس نہیں دینا۔۔۔ وہ بہت خفا خفا سی رہی اپنے رزلٹ سے لیکن کیا کر سکتی

تھی صرف اتنا کہ "اے پلس" کا سائن صفائی سے لگا کر اپنی ڈگری مانچسٹر میل کر دی۔۔۔ اور اس کی ذرا سی چالاکی کام کر گئی۔ پورا ایک مہینہ سوچنے کے بعد انہوں نے اسے کہا۔

"ہم آپ کو سیونٹی پرسنٹ اسکالرشپ آفر کر رہے ہیں۔ وہ بھی تیس فیصد ہر حال میں دو سالہ ڈگری کے دوران واپس کرنا ہو گا۔ بلکہ پچاس فیصد آئندہ آنے والے پانچ سالوں کے دوران۔۔۔ اپنی رہائش، فوڈ آپ کو خود ہینڈل کرنا ہو گا۔ ہم صرف عارضی طور پر یہ سب مہیا کریں گے۔"

تو منحوس ماری اور جل مروں گی الفاظ کام کر گئے۔ انگریز بھلا انسانیت کا بیڑا نے اور اسے اسکالرشپ آفر کر دیا۔

دادا کے ساتھ جا کر جیسے اس نے اپنا پاسپورٹ بنوا لیا۔۔۔ کچھ دادا کے اپنے اور کچھ دادا نے اپنے دوستوں سے قرض لیا اور باقی کا تیس فیصد جمع کر کے اس کے ہاتھ میں دیا۔

اب وہ دادا سے چہک چہک کر باتیں کرتی۔۔۔ ان سے لاڈ کرتی۔۔۔ کئی سالوں کی کمی اب ختم ہوئی۔۔۔ دادا پوتی میں پھر سے خوب بننے لگی۔۔۔ اس کے انداز کچھ ایسے تھے جیسے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔۔۔ اور دادا کے یوں کہ وہ ڈگری لے کر آئے گی تو کافی بدل چکی ہو گی اور رونا دھونا مرنا مارنا بھول چکی ہو گی۔

وہ دادا کے ساتھ چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں کھانے کھاتی رہی۔۔۔ اور ہر ہر قدم پر آس پاس ایسے نظر دوڑاتی جیسے سب کو الوداع کہہ رہی ہو ہمیشہ کے لیے۔۔۔ دادا کچھ جذباتی سے ہو گئے۔

"امرحہ! پڑھنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔۔۔ صرف پڑھنا وہاں۔۔۔ یاد رکھنا صرف پڑھنے کی آزادی دے رہا ہوں باقی فیصلوں کی نہیں۔۔۔ باقی سارے اختیارات آج بھی میرے اور تمہارے بابا کے پاس ہیں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلا دیا۔۔۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ وہاں پڑھنے کی جاب کرے گی اور وہیں رہے گی پتا نہیں دادا کیا سوچ رہے تھے۔۔۔ اس کو

کبھی لڑکیوں میں دلچسپی نہیں رہی اور وہ لکھ کر دینے کے لیے تیار تھی کہ ہوگی بھی نہیں۔

دونوں پل پر چلنے والی بگھی میں بیٹھے تھے جس کے آگے سفید گھوڑا جتا تھا۔ اس نے آج غور کیا تھا۔ یہ سب کتنا اچھا تھا۔ دادا کے ساتھ بیٹھنا اور جگمگ کرتی روشنیوں کو دیکھنا۔ کھوئے والی قلفی کھانا اور ہاتھ کو قلفی کے نیچے رکھنا۔ کھوئے والی قلفی جب گرتی ہے تو پھسل کر پوری کی پوری گرتی ہے اور یہ ایسا صدمہ ہوتا ہے کہ کسی تسلی سے زائل نہیں ہوتا۔ مزید پانچ دس قلفیاں کھانے کے بعد بھی بس وہی ایک گر جانے والی قلفی یاد آتی رہتی ہے۔

عید کی روشن بڑی تاریخی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپ سے وہ موسیقی پیدا کی جو صرف لاہور کے گھوڑے مال پر دوڑتے پیدا کیا کرتے ہیں۔ وہ ہنستے مسکراتے ان دو بچوں کی طرف گھر آئے جو عید کے تین دن عیدی جمع کرنے میں لگا دیتے ہیں اور صرف اس لیے گھر سے باہر نہیں نکلتے کہ مبادا ان کے پیچھے کوئی مہمان آجائے اور ان کی عیدی ماری جائے۔ بچوں کی عیدی جمع کرنے والے یہ دو بچے چوتھے دن گھر سے نکلتے ہیں اور کیا خوب نکلتے ہیں۔

٭٭٭

"امرحہ دو دن بعد جا رہی ہے۔" کھانے کی میز پر دادا نے اعلان کیا۔

"کہاں۔" دادی نے پوچھا۔ وہ سمجھیں اکثر بلوچستان جاتی رہتی ہے اب کے شاید پشاور کو نکل جائے اپنے والد کے ساتھ۔

"مانچسٹر۔"

"وہ کیا ہے۔"

دونوں نے اپنی طرف سے دھماکا کیا تھا وہ ناخن بھی نہ نکلا۔ بظاہر ماری جانی چاہیے تھی ان سب کی جغرافیائی معلومات کی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ مانچسٹر شہر کا نام ہے اور یہ شہر برطانیہ میں ہے۔

"کوئی رشتہ آیا ہے امرحہ کا وہاں سے۔" اس اگلے سوال پر دادا خاموش ہی ہو گئے۔

"تمہاری بیٹی اتنی قابل ہے کہ مانچسٹر کے میئر نے خود خط لکھ کر اسے بلایا ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں آکر پڑھو۔" دادا نے طنز کیا۔

بچلے سے دانت باؤس سے خط آتا کہ اوبا کی اسسٹنٹ ہو آکر کوئی فرق کب پڑنے والا تھا۔ سب آرام سے کھانا کھاتے رہے۔

"امرحہ باہر جا رہی ہے پڑھنے۔ وہاں داخلہ فلائٹ لے جا اس کی۔"

اب فرق پڑا۔ اماں، بابا، دادی نے حیرت سے دادا کو دیکھا۔

"بچے مار کے آئے۔" بابا غصہ دبا کر بولے "مفت پڑھنا ہے۔ سارا خرچہ یونیورسٹی نے لیا ہے۔"

"بابا کیوں پاگل بنا رہے ہیں مجھے۔ آج کل کون مفت میں سب کرتا ہے۔ آپ نے اپنا پلاٹ تو نہیں بیچ دیا۔ وہ میں نے امرحہ اور وامیہ کی شادی کے لیے رکھا تھا۔"

پلاٹ کو بیچنے کی کوشش تو دادا نے بہت کی تھی پر وہ ایک ایسی جگہ پر واقع تھا کہ بک ہی نہیں رہا تھا۔

"پلاٹ جہاں تھا اب بھی وہیں ہے۔ جا کر دیکھ آنا۔"

"کہیں نہیں جا رہا۔ رشتہ دیکھا ہے اس کا ایک بس شادی ہوگی اس کی۔"

"رشتہ۔" امرحہ نے دادی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کمرے میں آگئی اور جلدی جلدی اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خود کو تھپکی دے کر کہتی جاتی۔

"مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ میں چلی جاؤں گی۔ میں چلی جاؤں گی۔"

دادی "اماں، بابا" میں باہر تکرار بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ کون سا رشتہ تھا جو اس برے وقت میں اس کے لیے آیا تھا۔ [illegible] کے بارے میں جو جو کچھ مشہور ہے وہ سب ان رشتے

والوں تک پہنچ جائیں۔۔۔ اس کے خاندان والے انھیں فون کر کر کے بتائیں کہ لڑکی کیسی جنم جلی ہے۔۔۔ منحوس ہے۔۔۔ کالی قسمت۔۔۔ کالی زبان والی ہے۔۔۔ اور نہیں تو کوئی دادی کی زبانی تیار کردہ اس کا پیدائشی خلاصہ ان تک پہنچا دے کہ محلے کی وہ کو کیا کیا ہوا تھا فقط ایک اس کی آمد سے۔

یہ کوئی موقع تھا رشتے کا۔۔۔ اس کی انگلیاں تھیں جو گھس گئی تھیں ہیلز لکھ لکھ کر "آن لائن" سکالر شپ فارمز بھر بھر کر اور دادی اور اماں اس کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔

وہ خود کو تھپکتی رہی اور کہتی رہی "میں چلی جاؤں گی۔۔۔ میں پرسوں جا رہی ہوں۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ دادا سب ٹھیک کر لیں گے۔" کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی سامان بھی پیک کرتی رہی۔ پاسپورٹ کو حفاظت سے چھپا دیا کہ بابا غصے میں آکر اس کا پاسپورٹ ہی نہ جلا دیں۔

رات گزرتی رہی باہر سے ہنوز چارولوں کی تیز آوازیں آتی رہیں اور پاسپورٹ کو چھپانے کے بعد وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ لگی زمین پر ٹیک لگا کر لوٹنے لگی لیکن ساتھ ساتھ بڑبڑاتی رہی۔

"میں چلی جاؤں گی۔۔۔ میں تو جا رہی ہوں۔"

دادا نے دروازہ کھولا تو اسے دروازے پہ ہی لوٹتے پایا اور اس کی بڑبڑاہٹ کو بلند ہوتے سنا۔ تکیہ لا کر اس کے سر کے نیچے رکھا۔۔۔ زندگی میں وہ پہلی رات اتنی خوش تھی اور اس خوشی کی اسے اتنی فکر تھی کہ وہ بنا بستر کے فرش پر سو گئی تھی۔۔۔ انھیں دکھ ہوا۔ اس ماحول نے اسے اتنے دکھ نہ دیے ہوتے۔ اس گھر میں اس کی ایسی حیثیت نہ ہوتی تو وہ ہر رات ایسے ہی سوتی۔۔۔ رو رو کر آنکھیں سرخ کیے خوفزدہ نیند نہیں بلکہ آنکھیں موند کر پریوں کا انتظار کرنے والی نیند۔۔۔ دادا اس کے پاس ہی بیٹھ گئے اور اسے دیکھتے ہی رہے۔۔۔ اولاد ہی جس طوطے میں والدین کی جان ہوتی ہے وہ طوطا امرحہ تھی ان کے لیے۔

انھیں اتنا پیار امرحہ کے والد سے بھی نہیں تھا باقی کی اولادوں سے بھی نہیں تھا۔۔۔ ایک دن امرحہ ان سے خائف ہو کر پوچھنے لگی۔

"آپ بھی دوسروں کی طرح ہو جائیں نا۔۔۔ کیوں کرتے ہیں مجھ سے پیار۔"

وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکے۔۔۔ قدرت ہمیشہ انسان پر اتنی مہربان ضرور رہتی ہے کہ اگر ساری دنیا اس انسان سے نفرت کرنے لگتی ہے تو کوئی ایک ضرور اس پر جان چھڑکتا ہے۔ وہ انسان کوئی بھی ہو سکتا ہے اور کوئی چرند پرند یا دوسری مخلوق بھی۔۔۔ بلاوجہ کی نفرت ضرور ایک بلاوجہ کی محبت کو ساتھ باندھ لاتی ہے۔۔۔ جیسے جیسے وہ دوسروں کے لیے وہ ناپسندیدہ ہوتی گئی ان کے لیے پسندیدہ ترین ہوتی گئی۔۔۔ خدا بھی بھلا کبھی یہ گوارا کرتا ہے کہ اس کے بندے کے آس پاس صرف کانٹے ہی اگ آئے ہیں۔۔۔ اور اب اسے ایک مہکتے ہمیشہ تروتازہ رہنے والے پھول کی اشد ضرورت ہے۔۔۔ تاکہ اس پھول کو پا کر وہ کانٹوں کی اذیت کو فراموش کر دے۔۔۔ دادا کیا جان سکتے تھے یہ تو خدا ہی جان سکتا تھا اور جو بہتر جان سکتا ہے وہی بہترین کر سکتا ہے۔۔۔ بے شک۔۔۔ بابا نے اسے دس ہزار روپے دیے کہ وہ ضروری خریداری کر لے۔۔۔ اماں اور دادی کا موڈ البتہ بہت برہم تھا۔۔۔ دادا کے ساتھ جا کر ہی اس نے ضروری خریداری کی۔۔۔ دانیہ نے اس کا سامان پیک کروایا۔۔۔ عماد اور علی دل مسوس کر کے دیکھتے رہے۔۔۔ آخر وہ اتنی دور جا رہی تھی۔

دادا مسلسل دو دن سے اپنی آنکھوں کی جھڑی چھپا رہے تھے۔

"یہ پڑھنے جا رہی ہے بھاگ نہیں رہی۔۔۔ ماں باپ تو خوش ہوتے نہیں۔ تم دونوں اسے رخصت کرو خوشی سے۔ یہ نہ ہو کہ جہاز کریش ہو جائے یا یہ لاپتا ہو جائے۔"

دادا نے یہ چھوٹا سا لیکچر دادی اور اماں کو دیا تھا۔۔۔ اس کا جہاز کریش نہ ہو جائے یا وہ لاپتا نہ ہو جائے۔ دونوں نے اپنی برہمی کو ایک طرف رکھا اور اسے

دعاؤں میں الوداع کہا۔
وہ مانچسٹر کے لیے روانہ ہو گئی۔
شہر اسپین کے لیے۔
شہر آزاد کے لیے۔
شہر یار م کے لیے۔

☼ ☼ ☼

وہ برطانیہ کے تیسرے مصروف ترین ایئرپورٹ کی اونچی چھت تلے ایڑی کے بل گھوم گھوم گئی۔

"میں مانچسٹر آ گئی ہوں آگ لگانے۔"

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چلا کر کہا۔ چند لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ گھیردار سفید شلوار اور کھلے دامن قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کا سفید لمبا دوپٹہ مانچسٹر ایئرپورٹ کی صفائی کر رہا تھا اور خاص کر ہر آنے جانے والے کے سامان کے ساتھ الجھ رہا تھا۔ اس نے پھر سے دونوں بازو پھیلا کر ایڑی کے بل گھوم کر کہا۔

"میں آ گئی مانچسٹر۔ میں اب بھی نہیں روؤں گی اور تم مجھے کبھی نہ رلانا۔"

برصغیر کے حاکم وقت کی سرزمین پر گھوم گھوم کر اس کا سفید دوپٹہ لہراتا بہت خوش رنگ لگ رہا تھا۔ خوش بختی کا اگر کوئی اشارہ تھا تو اس وقت امرحہ نامی نعرہ تھا۔ مسرت و شادمانی کا اگر کوئی نعرہ تھا تو وہ یہی۔ نہی۔ ایڑی کے بل گھوم گھوم رہا تھا۔

سکون و راحت کے دریا کا اگر کوئی کنارا نہ تھا تو بس۔ یہ امرحہ کا وجود سارا تھا۔

اس کو کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ وہ تین گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی لیکن اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ تین دن بھی انتظار کر سکتی تھی۔ اب اسے کہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اسے اپنے نام کا بورڈ دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ لانگ کراس بیگ لٹکائے ایک چائنیز نقش کورین لڑکی بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔

"میں ہوں امرحہ۔" وہ لیک کر اس کورین لڑکی کی طرف لپکی۔

"اوہ ہیلو۔ سوری مجھے دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں چلیں۔۔۔؟"

"دراصل جسے تمہیں لینے آنا تھا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا آتے ہوئے۔ پھر مجھے آنا پڑا۔ زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔"

امرحہ کی شکل پر پھر ہنسی نکل گئی۔ ہانا آگے آگے چلنے لگی وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ امرحہ کے لیے اس کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ بلڈنگ تک آئیں۔ سامان اوپر لے گئیں اور فلیٹ کے اندر آ گئیں۔

فلیٹ چھوٹا سا تھا۔ دو کمرے سامنے۔ چھوٹا سا لاؤنج اور لاؤنج کے سامنے ہی اوپن کچن۔ امرحہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایسا صاف ستھرا فلیٹ اس کے لیے نیا تھا۔

ہانا اسے ایک کمرے میں لے آئی جہاں دو سنگل بیڈ رکھے تھے اور جانے کی جگہ نکال کر فرش پر ایک فولڈنگ میٹرس بچھایا گیا تھا۔ جہاں میٹرس بچھا تھا یقیناً وہاں کے چلنے پھرنے کی چند قدمی جگہ ہو گی۔

"یہ آپ کا بستر ہے۔" اس نے فرشی بستر کی طرف اشارہ کیا۔ اور امرحہ کا موڈ ذرا سا تف ہو گیا۔ وہ کیوں سوئے نیچے۔

"برائے مہربانی اس کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ مت لگائیے گا۔" یہ فقرہ اس نے جبراً مسکرا کر لیکن بہت درخواست گزار انداز میں کہا اور کیونکہ ہانا چائنیز تھی تو ذرا سا جھک کر کہا۔

جب تک وہ فریش ہوئی۔ ہانا نے اسے کافی اور سینڈوچز بنا دیے۔ "یہ میری طرف سے۔" چھوٹی سی ٹرے کو آگے کرتے ہوئے اس نے عاجزی اور اتنی خوشی سے کہا جیسے اپنے قیمتی خزانے میں سے اسے کچھ عنایت کر رہی ہو۔ امرحہ دیکھ کر رہ گئی۔ اتنی لمبی فلائٹ کے بعد اسے یہ چھوٹا سا خوان پیش کیا جا رہا تھا۔

"شاید یہ ابتدائیہ ہو اور اصلی سوپر (کھانا) رات میں ہو۔" امرحہ سوچنے لگی۔

"میں لیٹ ہو رہی ہوں۔۔۔ مجھے جانا ہے۔" اور جاتے جاتے بھی وہ پھر کہہ گئی۔ "دو کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگایئے گا پلیز۔"

لیکن وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتی رہی۔۔۔ اسٹڈی ٹیبل پر رکھے نئی نئی اشکال والے پرفیومز کو اسپرے کرتی رہی۔۔۔ دراصل وہ صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ وہ کس قدر اصلی ہیں۔۔۔ یعنی کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں کتنا بھی مہنگا اور بانی برانڈ کا پرفیوم لے لیا جائے وہ اصل کی کاپی ہی ہوتا ہے اصل نہیں۔۔۔ سب کے پرفیومز بے دریغ اسپرے کرتے اسے کچھ کچھ حقیقت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ پاکستان میں وہ اصل کی کاپیاں ہی خریدتی رہی ہے۔۔۔ پورا فلیٹ معطر ہو گیا اتنے بھلی کوالٹی پرفیومز سے۔۔۔ وہیں قریب ہی کچھ میک اپ کا سامان رکھا تھا وہ اسے دیکھتی رہی۔۔۔ کتابوں پر صرف ایک نظر ڈالی ایسے ایسے ٹائٹل تھے کتابوں کے جیسے عہد قدیم کی کتابیں عہد جدید کے لوگوں کے ہاتھ لگ پڑی ہوں۔۔۔

عہد قدیم سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔۔۔ واش روم گئی۔۔۔ ایک ایک آئٹم چیک کیا، فیس واش، باڈی واش۔۔۔ اسے تو کیا تھا۔۔۔ حتیٰ کہ باتھ ٹب کے کنارے پر رکھی چھوٹی چھوٹی بطخوں کو بھی۔۔۔ پھر وہ کچن میں گئی۔۔۔ ایک ایک کیبنٹ کو کھول کر دیکھا۔۔۔ فوڈ آئٹمز کو سونگھ کر دیکھا۔۔۔ وہ سرا کمرا لاک تھا۔۔۔ لاؤنج میں رکھا ٹی وی اس نے آن کیا اور پہلے چینل چیک کرتی رہی پھر ایک میوزک چینل لگا کر کچن میں آ کر نوڈلز بنانے لگی۔۔۔ دو عدد نوڈلز کے پیکٹ بنائے۔۔۔ بڑے پیالے نما باؤل میں ڈالے۔۔۔ اور ایلڈورڈ مایا کو سنتے سنتے کھا گئی۔ باؤل کو میز پر ہی رہنے دیا اور ٹی وی بند کر کے سنگل بیڈ پر آ کر سو گئی۔

"تمہیں یقیناً لولا کیا تھا انہوں نے۔۔۔ کوئی مذاق تھا۔"

رات کو بارہ کے بعد کا وقت ہو گا جب اسے اٹھایا جا رہا تھا۔

"مس پاکستان۔۔۔ پلیز اٹھیں۔" ایک نیا چہرہ اسے اٹھا رہا تھا۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ یہ خواب ہے سو وہ بدستور سوئی رہی۔

"لیڈی امرحہ۔۔۔ پلیز۔۔۔ ورنہ میں آپ کی ناک کے پاس یہ ڈی ڈی اسپرے کر دوں گی۔۔۔ ایڈ ٹرسٹ می اس کی اسمیل دنیا کی گندی ترین اسمیل ہے۔۔۔ کئی ہفتوں تک ناک میں گھسی رہتی ہے۔"

امرحہ تو خواب میں رڈولا کے ساتھ نیٹ فلیکس نسماری کھا رہی تھی۔

اسپرے کا ڈھکن کھلا اور دنیا کی گندی ترین بدبو اس کی ناک کے قریب تک۔۔۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ کئی ہفتوں نہیں جائے گی والی تھی۔

"اوہ۔۔۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"ابھی میں نے اسپرے نہیں کیا۔" اس نے ہنستے ہوئے کر اسپرے کی بوتل پر ڈھکن رکھا۔

امرحہ ادھ کھلی آنکھوں سے گہری سبز آنکھوں والی کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔ اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔۔۔

ڈی ڈی کا ڈھکن پھر سے کھلا۔۔۔ اور اس کی ناک کے قریب آیا۔۔۔ اس نے ہاتھ سے پرے کیا۔۔۔ اس بار اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"کتنا غیر مہذب انداز ہے یہ۔" امرحہ کی آواز رو دینے جیسی ہو گئی۔ گہری سبز آنکھیں پھیل گئیں۔

"غیر مہذب۔"

"تم لوگ کتنی بھی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھ لو، بنیادی اخلاقی اصول کبھی نہیں سیکھ سکو گے۔"

اس بار سبز آنکھیں طنز سے اسے دیکھنے لگیں۔ "ذرا صبر کے ساتھ باہر آ جائیے۔" یہ کہہ کر چلی گئی۔

امرحہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ اس نے جان بوجھ کر زیادہ وقت لگایا کہ کر تی رہیں کھانے پر اس کا انتظار۔۔۔ لیکن باہر لاؤنج میں کوئی کھانے والے کی میز لگی تھی نہ ہی کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں آ رہی تھیں البتہ ایک نہ دو پورے پانچ کا مجمع باہر بیٹھا تھا اور

میز پر نوڈلز کا وہ باؤل رکھا تھا جس میں کچھ نوڈلز بچے تھے۔ وہ مجرم! اسے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جائیے۔" بھورے بالوں والی نے کہا جس نے ہیپیانہ طرز کی بالوں کی چٹیا گوندھ کر دائیں شانے کی طرف ایسے لٹکا رکھی تھی جیسے کنڈلی مارے بھورا سانپ کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑا جھول رہا ہو۔ امرحہ بیٹھ گئی۔ شاید کھانے سے پہلے متعارف ہونا ہوگا۔

"یہ مس پاکستان ہیں۔ امرحہ۔" ہانا نے کہا۔

"ہائے۔ میں للی کوئی ہوں۔ اسکاٹ لینڈ سے۔" اسپرے والی نے اپنا تعارف کروایا۔

"میں شرلی مارگوٹ۔" بھورے بالوں والی نے کہا لیکن وہ مسکرا نہ سکی۔

"ہانا ایم پی ٹی۔ میں جرمنی سے ہوں۔" بہت لمبی اور بہت پتلی چینی لوشے بے طرح مسکرا کر کہا امرحہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہنسی اس کی آمد سے ہی قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

"میں عذرا ہوں۔ شنگاگو سے۔" تڑ کھڑاتی اردو میں آواز تھی مراٹھ بنیر اسٹائل کی داڑھی بنے وہ شارلٹ کرسٹینا ٹائپ بکھو رہی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ کچن کو ہاتھ نہیں لگانا۔؟" ہانا نے بولنا شروع کیا۔

"میں صرف واش روم دیکھ گئی۔" وہ صاف مکر گئی۔ ہانا کا منہ کھل گیا "یہ جھوٹ بول رہی ہیں شرلی۔" شرلی نے آنکھ سے اشارہ کیا ہانا کو۔۔۔ اور ہانا خاموش ہو گئی۔

"یہ۔۔۔" شرلی نے میز پر رکھے باؤل کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے کیا معلوم اس کے بارے میں۔۔۔ یہ تو پہلے سے یہاں رکھا تھا۔" اب کی بار وہ حقیقتاً ڈر گئی تھی اور اسے افسوس ہوا اس نے سارے نوڈلز کھا کر باؤل کو دھو کر کیوں نہ رکھا۔

"ٹھیک ہے امرحہ! آپ جا کر سو جائیں۔۔۔ سوری آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"اور کھانا۔۔۔؟" وہ کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

وہ جو پوں پہلے اسے پھر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ چینی لوشے نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا لیکن امرحہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ اپنی ہنسی کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"ابھی آپ کو اور بھوک لگی ہے۔۔۔؟" عذرا نے پوچھا۔

"نہیں بھوک تو نہیں لگی۔۔۔ پھر بھی کھانا تو کھاتے ہیں نا۔۔۔" اس سے یہی بات بن سکی لیکن حقیقت میں اسے بھوک لگی تھی اور بھوک سے زیادہ اسے یہ انتظار تھا کہ آخر اس کے لیے کھانے کا کس قسم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کیا کیا بنایا گیا ہے اس کے لیے۔

"ہم بنا بھوک کے کھانا نہیں کھاتے لیڈی۔۔۔" شرلی نے بڑی محبت سے کہا۔

"کھانا۔۔۔ بھی نہیں؟" اس نے اردو میں کہا۔۔۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا بس عذرا نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ کمرے میں آئی اور فرشی بستر پر آکر سو گئی۔ باہر بھنبھناہٹ ہوتی رہی۔۔۔ "ہوتی رہے میں فیصلہ ہو گیا ہے۔" وہ سو گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ اٹھی تو کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی "اف اتنی صفائی۔۔۔ اتنی خوب صورتی۔"

بلڈنگ کے جس راستے سے وہ اس فلیٹ میں آئی تھی یہ اس کی پچھلی طرف کا منظر تھا جہاں سرسبز گھاس کا ایک کھلا قطعہ تھا اور اس سرسبز گھاس پر جگہ جگہ مختلف کیاریوں میں ڈھیر سارے پھول کھلے تھے۔۔۔ قطعے کے پار سڑک جس پر دور دور تک گرد کا نشان نہ تھا۔ اتنی خاموشی جیسے کہیں بنی نوع انسان زمین پر اترا ہی نہیں۔

کمرہ خالی تھا۔۔۔ سارا فلیٹ ہی خالی تھا۔۔۔ بیڈ کورز بے شکن تھے ڈریسنگ ٹیبل پر ایک بھی پرفیوم موجود نہیں تھا۔۔۔ واش روم میں کل رات تک نظر آنے والے سب ہی شیمپوز، فیس واش غائب تھے۔ وہ کچن

میں آئی تو کاؤنٹر پر ایک چٹ رکھی تھی۔
"ہیو آ بریک فاسٹ۔"

انڈا، جام، چار ڈبل روٹی کے پیس، دودھ اور شوگر ایک پلیٹ میں ۔۔۔۔ کافی کے مگ میں ایک مگ جتنی کافی اور سائیڈ پر رکھا ایک عدد ٹی بیگ۔

باقی چاروں کیبنٹ کو ایک زنجیر سے پرو کر درمیان میں چھوٹا سا تالا لگا دیا تھا۔ امرحہ کو ایک معمولی سا جھٹکا لگا یہ سب دیکھ کر۔ بس کی "معمولی سا۔" اس کے پاس کوئی فون نہیں تھا ورنہ بابا نے اس کی بات پاکستان کروا دی تھی۔ اب ظاہر ہے اسے خود ہی فون کرنا ہوگا اگر وہ اس معمولی سے جھٹکے کے بارے میں دادا سے لمبی بات کرنا چاہ رہی تھی تو۔ اور لمبی بات پر تو بل بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔

دوسری چٹ فریج پر لگی تھی۔ "نو بجے آکر ویلی تمہیں لے جائے گی یونیورسٹی تیار رہنا۔"

ناشتا کرکے وہ تیار ہو گئی۔ ٹھیک نو بجے ویلی آئی۔ چھوٹی سی عورت نما بچی کہ لڑکی آئی۔

"میں ویلی ہوں۔ مجھے شرلی نے کہا تھا کہ تمہیں یونیورسٹی ڈراپ کرتی جاؤں۔"

"میں امرحہ ہوں۔ میں آج پہلی بار یونیورسٹی جا رہی ہوں۔"

"یہ تمہیں دیکھ کر پہلی نظر میں ہی پتا چل جاتا ہے۔" وہ مسکرائی اور امرحہ کو وہ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگی۔ ان لمیٹڈ امرحہ کو اس کی کسی ہوئی جینز اور گھسے ہوئے شوز بھی بہت اچھے لگ رہے تھے اور اس کے برسلز والے دانت بھی کیونکہ وہ مانچسٹر یونیورسٹی میں قدم رکھنے جا رہی تھی۔ اسے سب اچھا ہی لگنا چاہیے تھا۔

"جلدی کرو ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" ویلی تیزی سے باہر نکلی۔ فلیٹ کو لاک کرکے وہ اس کے پیچھے آئی۔ ویلی ایک منی سی سائیکل کو لیے تیار کھڑی تھی۔

"آجاؤ بیٹھ جاؤ۔" اس نے اس منی سی سائیکل کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔
تو اس پر ڈراپ کرنا تھا اسے۔۔۔ اس لیے خاص ویلی کو بھیجا گیا۔

"کیا ہوا امرحہ۔۔۔ آجاؤ نا۔۔۔ مجھے اپنی کلاس بھی لینی ہے۔"

وہ اس منی سی لڑکی کی منی سی سائیکل پر بیٹھ گئی، پہلے اپنی شرمندگی چھپاتی رہی پھر اپنی ہنسی دباتی رہی۔۔۔ سڑکوں پر سے گزرتے اس نے کسی طرف بھی نہ دیکھا اور ویلی کے پیچھے منہ چھپائے وہ اپنی ہنسی کی رفتار کم کرتی رہی۔

"دادا۔۔۔" اس نے خیالوں میں دادا کو مخاطب کیا۔ "مجھے اتنی ہنسی آ رہی ہے کہ میرا جی چاہتا ہے اس سڑک پر گر جاؤں اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اتنی زور زور سے ہنسوں کہ سارا مانچسٹر اکٹھا ہو جائے۔ دادا! زندگی کیسی کیسی ہنسی چھوٹے "معمولی" بے کار قسم کے بر محل سے ونشانی ہے۔۔۔ دادا! مجھے وقت کے یہ پہلے ہی لمحے۔۔۔ جو اس نے میری زندگی میں پرو دیے۔"

اس دوران بار بار اس کی نظر ویلی کے ان چند بالوں کی طرف اٹھ جاتی تھی جنہیں ویلی نے سر سے بہت اوپر اٹھا کر چتی منی سی پونی میں باندھ رکھا تھا۔۔۔ اور جو خدا معاف کرے پونی ٹیل کے نام پر خاصا کم اٹکنک کا نیکہ تھا۔۔۔ ہوا میں لہراتے وہ کسی چھوٹی چڑیا کی دم جیسے لگ رہے تھے۔

ویلی سنجیدگی و متانت سے اپنے سائیکل چلا رہی تھی جیسے شاہ اروں کی سواری کی بگھی وہ دوڑا رہی ہو۔۔۔ سارا راستہ وہ امرحہ کی ہنسی کے فواروں کا بوجھ ڈھوتی رہی تھی۔۔۔ اسے اتارنے کے بعد وہ بولی بھی تو صرف اتنا "کتنی موٹی ہو تم۔۔۔ جاگنگ کیا کرو۔" ویلی جیسے اسے اپنی سائیکل پر گھسیٹ کر وہاں تک لائی تھی اس کی پیشانی کا پسینہ بتا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آکسفورڈ روڈ پر برطانوی طرز تعمیر کی تاریخ ساز عمارت کے عین سامنے کھڑی تھی۔ یونیورسٹی میں کیمپس کی آرک کے نیچے۔۔۔ جس کے اوپر بڑے سنہرے حرف میں یونیورسٹی آف مانچسٹر جڑا تھا جس

کی بنیاد 1824ء میں رکھی گئی تھی۔
علم 'حکمت' انسانیت۔ جس درسگاہ کا موٹو تھا۔ جو تقریباً" چالیس ہزار کے قریب اسٹوڈنٹس کو فیض یاب کر رہا تھا۔ دنیا کی دس بہترین درسگاہوں میں سے ایک "وزیونیورسٹی آف مانچسٹر"

وہ مین کیمپس کو۔ آرک کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس طرز تعمیر کی عمارتیں اس نے لاہور میں بھی دیکھی تھیں۔ یہ اسے کچھ کچھ لاہور عجائب گھر جیسی بھی لگی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اندر کیسا جہان آباد ہے۔ دنیا کے کیسے لائق فائق قابل اساتذہ یہاں اکٹھے کیے ہیں۔ وہ کیسے کیسے شاگردوں کے استاد بنا دیے گئے ہیں۔ وہ ابھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ بہت جلد بہت کچھ جان جائے گی۔

اسٹوڈنٹس کا ہم غفیر ایسے اندر جا رہا تھا جیسے اندر کوئی چیز مفت بانٹی جا رہی ہو جیسے کہ "بریانی" یا اٹلی کی مشہور پیزا اور اٹلی میں بھی نہیں ملتا۔

"چلو امرحہ۔" ڈیلی کافی آگے جا چکی تھی۔
امرحہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ ان دونوں نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔ یہ عجیب طرز کا سائیکل اسٹینڈ بھی امرحہ کے لیے بے تعلق تھا۔ اسے تو ابھی بہت کچھ نیا ہونے والا تھا۔ اس کی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف دیکھے۔ بس جی چاہ رہا تھا سب ایک ہی بار جلدی سے دیکھ لے۔ اسٹوڈنٹس کی آمد و رفت میں تیزی بھی تھی اور پھرتی بھی اور وہ ایسے تھی جیسے کہ پھرتی اور تیزی سے ہم کبھی ملے نہیں اور سست روی سے ہماری بہت دوستی چل رہی ہے۔

"امرحہ! تیز چلو نا۔" ڈیلی نے بیس قدم آگے جا کر گردن موڑ کر آواز لگائی۔ اس آواز پر اس نے ذرا سی تیزی دکھائی اور اس سے پندرہ قدم قریب ہو گئی۔ ڈیلی سرسبز گراؤنڈ میں ایک گروپ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف اشارہ کیا۔ امرحہ کافی دور سے ہی ذرا دم سا نکل گیا۔ وہ دس بارہ لڑکے لڑکیوں کا گروپ تھا اور ان میں شرلی کو اس نے فوراً" پہچان لیا۔ باقی عذرا کو پہچاننے میں اسے تھوڑا وقت لگا کیونکہ اس نے سر پر سیاہ نیٹ باندھ رکھی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے ان کے قریب جا کر ذرا دبی دبی آواز میں کہا اگر ڈیلی کے ساتھ اس کی سائیکل پر بیٹھے وہ چنے سے ذرا جلدی فارغ ہو جاتی تو اس سے کچھ معلومات ہی لے لیتی۔

سب نے اپنا اپنا نام لے کر تعارف کروایا۔ اس دوران وہ جس خلوص سے مسکراتے رہے امرحہ ہلکی پھلکی ہوتی گئی۔ وہ بلاوجہ ان کے دباؤ میں آ گئی تھی۔ یہ سب تو بہت اچھے ہیں۔
ایک لڑکا اور دو لڑکیاں اٹھیں اور اسے ساتھ لے کر یونیورسٹی کینٹین میں آ گئیں اور اسے کافی پلائی۔ جب وہ کافلر کی آخری چسکی لے چکی اور گروپ کے لیڈر وہ تھم اور گروپ کی لڑکیوں نوال اور بریرہ کی خوب صورتی نوال۔ یہاں میں دا اور دے چکی تو دائم نے کچھ یوں بات شروع کی۔

"مس امرحہ! کیا آپ مجھے مکمل سنجیدگی اور توجہ سے سننے کا وعدہ کریں گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" اس نے ٹھیک اسی انداز میں کہا جس میں بچے ایک ہاتھ میں چاکلیٹ چھپا کر اور دوسرے ہاتھ کو آگے کر کے کہتے ہیں۔ "پکا وعدہ میں رات میں چاکلیٹ نہیں کھاؤں گا۔"

"گڈ۔ کیونکہ مجھے کچھ شک سا ہے اس لیے پھر کہہ رہا ہوں کہ درمیان میں مت بولیے گا۔ ہم یہ تین لوگ جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہم نے اور کچھ ان دوستوں نے جو تعلیم مکمل کر چکے ہیں یا جو ہم سے سینیئر ہیں نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ کیوں نہ ہم اپنی ذاتی کوششوں سے لائق فائق قابل پاکستانی اسٹوڈنٹس کو اسکالرشپ دیں۔ ہم انہیں اپنے جمع کیے گئے فنڈز سے یہاں بلوائیں تاکہ وہ پاکستانی اسٹوڈنٹس کو جو لائق تو ہیں لیکن اچھی تعلیم افورڈ نہیں کر سکتے انہیں آگے بڑھنے کا اور غیر ملکی سطح پر اپنا آپ منوانے کا موقع ملے تاکہ یہ سب بھی پاکستان کی ترقی میں

اہم ثابت ہو سکیں۔ سادہ لفظوں میں ہم بے حد ذہین لیکن بے حد غریب اسٹوڈنٹس کو یہاں بلوا رہے تھے۔ جو پاکستانی یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمارے تمیں لوگوں کے گروپ نے مختلف ذرائع سے فنڈز اکٹھے کیے۔ ہم نے مختلف ایونٹس میں اسٹالز لگائے' کچھ میوزک اور تھیٹر کیا۔ کچھ ہماری اپنی سیونگ تھی اور کچھ ہمیں ہمارے والدین' رشتے داروں' دوستوں اور مختلف کمیونٹیز کے مختلف افراد نے فنڈز دیے۔ اور ہم نے مطلوبہ ہدف پورا کر لیا۔

ہم صرف پانچ اسٹوڈنٹس ہی افورڈ کرسکتے تھے' وہ بھی اس صورت میں اگر وہ یہاں آتے ہی جلد سے جلد اپنی خوراک اور رہائش کی ذمہ داری اٹھا لیتے۔ اگر ہم انہیں خوراک اور رہائش بھی دیتے تو صرف تین ہی کو یہاں بلوا سکتے تھے۔

ہمیں ایک ہزار سے زیادہ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے ہم نے پانچ کا انتخاب کیا۔ باقی کے جو ہزار اسٹوڈنٹس تھے' وہ بھی کسی سے کم نہیں تھے لیکن جن پانچ کا ہم نے انتخاب کیا تھا وہ بہت غریب اور بہت چھوٹے قصبوں کے رہنے والے تھے اور ان کے لیے مانچسٹر یونیورسٹی آکر پڑھنے کے چانسز صفر تھے۔

وہ سب یہاں ایک ہفتہ پہلے ہی آ چکے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آتے ہی انہوں نے اپنی رہائش اور خوراک کا انتظام کرلیا ہے کیونکہ وہ پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ ہنر مند بھی تھے اس لیے انہیں فوراً یہاں جاب مل گئی۔ ان میں سے ایک گاڑیوں کے لاک ٹھیک کرتا ہے اور ایسی ہی ورکشاپ نے سیلیوٹ مار کر اسے جاب دی ہے۔ مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ایک ایسے طالب علم کو یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس نے اپنی پرائیویٹ تعلیم میں پنجاب بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اور یہ کام اس نے گاڑیوں کے لاک ٹھیک کرتے اور ایک دن بھی اپنی جاب سے چھٹی نہ کرکے کیا۔

ہمیں جتنی درخواستیں موصول ہوئیں وہ کم و بیش سب ہی ایسی تھیں لیکن ایک آپ کی درخواست سب سے مختلف تھی۔ آپ کی تعلیمی اسناد میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں تھا۔ آپ ان ہزار میں سے صفر تھیں۔ آپ لاہور جیسے بڑے تعلیمی شہر میں رہتی تھیں۔ جہاں اچھے تعلیمی اداروں کی بھرمار ہے۔ آپ پڑھنے کے لیے ایک اچھے کالج جاتی تھیں۔ آپ کے فادر کی پاکستان کے ایک بڑے بازار میں اپنی ذاتی دوکان تھی۔ آپ کے پاس اپنا ذاتی گھر تھا۔ آپ کوئی جاب بھی نہیں کرتی تھیں پھر بھی آپ کی کسی تعلیمی قابلیت میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں تھا۔ آپ کسی بھی طرح اس اسکالرشپ کی مستحق نہیں تھیں۔ آپ کی درخواست پر جواب بھی نہیں دیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن ہم نے جواب دیا۔ آپ کی تعلیمی قابلیت دیکھ کر نہیں۔ آپ کی ذہنی حالت دیکھ کر۔ اپنی آخری لائن میں آپ نے لکھا تھا "میں ہوں ہی منحوس' مجھے نہیں جل کر مرجاؤں تو ہی اچھا ہے۔" اس سطر پر ہم نے ذرا توجہ دی۔

ہماری ایک گروپ ممبر نے جو نفسیات کی طالبہ ہیں' آپ کی بھیجی گئی دوسری میلز بھی پڑھیں اور اس نے اپنی رائے دی کہ آپ کی ذہنی حالت بہت تباہ کن ہے' اتنی ناکامیاں اٹھانے کے بعد مزید ناکامی آپ کو بالکل توڑ دے گی اور مایوس ہو کر آپ کچھ بھی کرسکتی ہیں اس لیے ہم نے ایک مہینے کا وقت لیا آپ سے۔ ہم اس صورت حال پر حقیقتاً" کافی پریشان تھے ہم اپنے اسکالرشپ دے چکے تھے۔ آپ کو کیا دیتے۔ لیکن آپ کو اس کیفیت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

اس لیے اس بار ہم نے اپنی پاکٹ منی نکالی۔ کچھ دوسرے اسٹوڈنٹس سے رابطے کیے۔ اور پھر چالیس اسٹوڈنٹس نے آپ کے لیے فنڈز اکٹھے کیے۔ اور بہت مشکل سے۔ اتنی مشکل سے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ان چالیس اسٹوڈنٹس میں عیسائی' مسلم' انڈین' بنگالی' جاپانی' امریکن' فرنچ سب شامل ہیں۔ اس لیے یہاں خاص طور پر میں آپ کو یہ ذہن نشین کروا دوں کہ ان افراد کی اقوام کا احترام

آپ پر لازم ہے۔
ہم نے آپ سے پوچھا۔ کیا آپ ففٹی پرسنٹ افورڈ کر سکتی ہیں؟ آپ نے کہا نہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ اس ففٹی پرسنٹ کے لیے آپ نے اتنی کوشش نہیں کی ہو گی جتنی ہم آپ کے لیے کر رہے تھے۔ لیکن آپ تھرٹی پرسنٹ لانے پر مان گئیں۔۔۔ اگر آپ تھرٹی پرسنٹ پر نہ مانتیں تو آپ کے لیے مجھے اپنی وہ کار بیچنی پڑتی جو میں نے کالج کے زمانے میں اپنی پارٹ ٹائم جاب کی سیونگ سے خریدی تھی۔۔۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیے گا کہ جن چالیس اسٹوڈنٹس نے آپ کے لیے فنڈز دیے ہیں وہ بہت امیر کبیر نہیں ہیں۔۔۔ سب پڑھنے کے ساتھ جاب کرتے ہیں اور ایک ایک پینی بچاتے ہیں۔۔۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ ہوا میں اڑ کر یا جادو سے یہاں نہیں آگئیں۔۔۔ ہر روز ہم نے آپ کے لیے میٹنگ کی ہے۔۔۔ صورت حال پر غور کیا ہے۔۔۔ کوئی ایک بھی ہاں کر کے پیچھے نہیں ہوا۔۔۔ کمائے گئے اور بچائے گئے ایک ایک پونڈ کو انہوں نے آپ پر انویسٹ کیا ہے۔۔۔ ڈونیٹ نہیں کیا۔ سمجھتی ہیں آپ۔۔۔ انویسٹمنٹ اس چیز کی ہوتی ہے کہ پیسے لگانے والے کو نفع ہو۔۔۔ اور یہ فائدہ وہ اس طرح لے رہے ہیں کہ تیسری دنیا کا ایک باشعور تعلیم یافتہ ہو جائے تو وہ اپنے ملک و قوم کا سرمایہ ہے۔۔۔ اس لیے آپ ان کے دیے گئے پورے پیسے واپس کریں گی۔ ایک کم نہ ایک پونڈ زیادہ۔۔۔ اور سارا منافع آپ لے جائیں گی۔۔۔ اس سارے منافع یا فائدے کے لیے انہوں نے انویسٹمنٹ کی ہے۔۔۔ میری بات کو برائے مہربانی سمجھیں اور یاد تو ضرور ہی رکھیں۔
جنہوں نے فنڈز دیے ہیں وہ آپ کو نہیں جانتے۔ کوئی ایک بھی آپ کا نام نہیں جانتا۔۔۔ شکل سے تو بالکل بھی نہیں۔۔۔ تاکہ آپ کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔۔۔ ہم تین کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ فنڈز آپ کے لیے اکٹھے کیے گئے ہیں۔۔۔ ہم نے آپ کی عزت نفس کا پورا خیال رکھا ہے۔۔۔ ایسا بھی نہیں ہو گا کہ کوئی آپ کے پاس آکر آپ کو کچھ بھی جتا سکے۔۔۔ اب میں دوسری طرف آتا ہوں۔
آپ سے کہا گیا کہ اپنی رہائش اور کھانے کا ذمہ آپ کو لینا ہو گا۔ آپ نے کہا آپ یہاں آکر دیکھ لیں گی۔۔۔ گڈ۔۔۔ صرف یہی ایک اچھی اور مثبت بات تھی جو آپ نے کی تھی۔۔۔ جن پانچ لڑکیوں کے ساتھ آپ رہیں۔ ان سے ہم نے خاص درخواست کی تھی کہ وہ آپ کو عارضی طور پر چند دن اپنے پاس رکھ لیں۔۔۔ آپ کو ایئر پورٹ ریسیو کرنے کے لیے جانے والے جس شخص کا ایکسیڈنٹ ہوا وہ ہمارے لیے رضاکار بنا تھا جو آپ کو ایئر پورٹ سے لے کر گئی تھی وہ اپنے اس دوست کے لیے آپ کی مدد کر رہی تھی جس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔۔۔ جس بستر پر کل آپ سوئیں وہ مسٹر ہارز وڈ ہول نے"
ہن نے فرش اور بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔
"ہم نے باقی ماندہ بچی ہوئی سیونگ سے خرید کر وہاں رکھا۔۔۔ آپ کو بابا نے منع کیا تھا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا لیکن آپ نے لگایا پرفیومز کو اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو۔۔۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ سوائے کتابوں کے ہر چیز کو۔ آپ نے دو نوڈلز کے پیکٹ نکال کر کھائے۔۔۔ مس امرحہ وہ سب بہت اچھی میزبان ہیں۔۔۔ ان ایلکٹ ہم سب جانتے ہیں کہ میزبانی کسے کہتے ہیں لیکن ہم سب اور وہ سب اپنے گھروں میں نہیں ہیں۔۔۔ ہم اپنے گھروں، شہروں، ملکوں سے دور یہاں اکیلے رہ رہے ہیں۔۔۔ اپنی مدد آپ کے تحت۔۔۔
کاش رات ہی بابا تھوڑا سا آپ کو اپنے بارے میں بتا دیتیں۔۔۔ وہ صرف دو وقت کھاتی ہے۔ صبح وہ نوڈلز کا پیکٹ کھاتی ہے اور رات کو جہاں وہ جاب کرتی ہے وہیں سے اسے ایک برگر ملتا ہے اور ایک کپ کافی۔۔۔ وہ ایک ایک پونڈ بچاتی ہے کیونکہ اپنے تعلیمی اخراجات وہ خود ہی اٹھا رہی ہے۔ کوریا میں رہنے والے اس کے گھر والے اسے اخراجات کے نام پر ایک پاکستانی روپیہ بھی نہیں بھیج سکتے۔۔۔ اس نے تن تنہا مانچسٹر میں آکر پڑھنے کا خواب پورا کیا ہے۔۔۔ شاید یہ باتیں آپ کو معمولی لگیں۔۔۔ آپ جو لاہور

کے تعلیمی اداروں میں پڑھتی ہیں اور جن کی فیس والدین ادا کرتے ہیں۔۔۔ آپ جنہوں نے کبھی کوئی جاب نہیں کی۔۔۔ نہ آپ کو جاب کی ضرورت پیش آئی ہے۔۔۔ آپ کو یہ سب معمولی لگے گا کیونکہ آپ نے کبھی زندگی میں سخت جدوجہد نہیں کی وہ بھی مسکرا کر حوصلے سے۔۔۔ یہاں بہت سے ایسے اسٹوڈنٹس ہیں جو زیادہ کھانا نہیں کھاتے کیونکہ انہیں زیادہ کتابیں خریدنی ہوتی ہیں۔۔۔ وہ ایک چینز وزٹی شرکس میں یہاں سے اپنی ڈگری لے جاتے ہیں۔۔۔ اور مسکراتے ہوئے آتے ہیں مسکراتے ہوئے ہی جاتے ہیں۔۔۔ شلی جن کے فلیٹ پر آپ رہ رہی ہیں ان کے ساتھ رہنے کے لیے آپ کے پاس زیادہ سے زیادہ آج کی رات ہے۔۔۔ فائنل ڈیڈ لائن ٹھیک ایک مہینے کی ہے۔۔۔ آپ کے ایک مہینے کے کھانے کا سامان وہاں موجود ہے۔۔۔ آپ آج ہی اپنی رہائش اور جاب کا انتظام کرلیں۔" وہ رکا۔

"ویلکم ٹو مانچسٹر مس امرحہ۔۔۔" اس نے سانس بھی نہیں لیا اور پھر سے شروع ہو گیا۔

"یہ تو ہو گئیں آپ کے یہاں رہنے کے بارے میں کچھ تفصیلات۔۔۔ اب آپ کو میں کچھ تجاویز دیتا ہوں ۔۔۔ یعنی اچھی باتیں۔" وہ مسکرایا۔

"برا مت مانیے گا لیکن یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان' انڈیا' سری لنکا اور ایسے ہی دوسرے ترقی پذیر ممالک سے آنے والے بہت شکایتی ہوتے ہیں۔۔۔ سست کاہل۔۔۔ بہانے باز۔۔۔ انہیں لگتا ہے بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ سب مشکلیں' مصیبتیں' دکھ ان ہی کو مل گئے ہیں۔۔۔ رونے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔۔۔ آپ کی شکل بھی کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔۔۔ روئیں لیکن بہت بڑے دکھ پر' تکلیف پر۔۔۔ لیکن مشکل پر نہیں ۔۔۔ یہاں آپ کو کوئی چپ نہیں کروائے گا۔۔۔ اس لیے نہیں کہ یہاں سب خود غرض ہیں جیسا کہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں سوچا اور کہا جاتا ہے۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رونا بے وقوفی ہے۔۔۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ نوال اور بریرہ بھی یہی سمجھتی ہیں ۔۔۔ اگر چھوٹی بڑی مشکلات پر رونے والے کو بار بار چپ کروایا تو وہ بزدل بن جائے گا بہادر نہیں۔

مس امرحہ! اپنی سستی اور کاہلی کو بہانے بازی کو یہاں وہاں کوئی ڈسٹ بن دیکھ کر اس میں ڈال دیں یا آگ لگا دیں۔۔۔ اصل جل مرنا تو انہیں چاہیے۔۔۔ آپ لڑکی ہیں لیکن کمزور نہیں ہیں۔۔۔ ہمارے مذہب نے کہاں لڑکی کو کمزور کہا ہے۔۔۔ کہتے ہیں' مرد رویا نہیں کرتے۔۔۔ لیکن یہ کہنا مرد کے لیے ہی کیوں ہے؟ عورت کے لیے کیوں نہیں یا مرد کے ہاتھوں بنا معاشرہ یہ مقولہ کہلواتا ہے تاکہ عورت کو ہر سطح پر کمزور ثابت کیا جاسکے۔

مس امرحہ! آپ مانچسٹر یونیورسٹی آچکی ہیں۔۔۔ آپ یہ ذہن نشین کر چکی ہیں۔۔۔ یا تو گولڈ میڈل لیں ورنہ روڈ سے الگ ہو جائیں اور جاکر تماشائیوں میں بیٹھ جائیں اور یاد رکھیں' تماشائیوں کی بھیڑ میں آپ کو ذرا سی جگہ مل جائے گی۔۔۔ روڈ میں آپ اگر صرف انجوائے منٹ کے لیے آئی ہیں تو آخری نمبروں میں آنے سے بہتر ہے کہ آپ روڈ سے نکل کر کسی اور کو آگے آنے دیں۔۔۔ میرا یقین کریں' دنیا میں جوہریوں کی کمی تو یقیناً ہوگی لیکن ہیروں کی کسی صورت نہیں۔۔۔"

اس بار وہ رکا اور کافی دیر تک رکا ہی رہا۔

"یونیورسٹی میں ویلکم ویک چل رہا ہے۔۔۔ پھر اس کی کلاسز شروع ہو جائیں گی۔۔۔ اس ایک ہفتے کے درمیان آپ گول گول گھومیں یا زمین کھودیں' آپ کی رہائش کا بندوبست ہو جانا چاہیے۔۔۔ آپ کی جاب کا ۔۔۔ آپ کے فوڈ کا۔۔۔ اگر آپ بھوکی نہیں رہ سکتیں تو ۔۔۔ یہ سب آپ کے مسئلے ہیں اور یہ سب آپ حل بھی کرسکتی ہیں۔۔۔ کیا نہیں کرسکتیں؟"

اس کی گردن فوراً" نفی میں پھر ہاں میں ہلی۔

"آپ سب سمجھ گئیں نا؟"

"جی۔" اس نے اوپر سے سر ہلایا۔۔۔ اندر [illegible]

"گڈ۔۔۔ اب آپ جائیں اور زمین کھودیں۔۔۔" اور

میرا مطلب جاب ڈھونڈیں ــــ اپنی ڈگری کے دوران آپ کو ہر صورت فیس کی پرمنٹ واپس کرنا ہو گا ــــ اپنے اخراجات کو آپ کو ایسے سنبھالنا ہو گا کہ آپ یہ تھوڑی پرمنٹ جلد سے جلد واپس کر سکیں ــــ سمجھ گئیں آپ۔"

"جی۔" اس نے سر ہلا کر بمشکل کہا۔

"نوال اور بریرہ اردو سمجھ لیتی ہیں تھوڑی بہت لیکن بول نہیں سکتیں ــــ آپ کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھ میں آجائے اس لیے میں نے آپ سے خطاب کیا ــــ آپ کو برا نہیں لگنا چاہیے ــــ"

"مجھے برا نہیں لگا ــــ"

"ویل ــــ آپ کی شکل تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔"

"میری شکل ایسی ہی ہے ــــ"

"ایسی کیسی ــــ؟"

"بھوت جیسے والی ــــ"

"اچھا ــــ اب آپ کیا کریں گی۔"

"مجھے جاب ڈھونڈنی ہے ــــ جلد سے جلد۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"بالکل ٹھیک کہا ــــ ویسے آپ کی شکل بہت تیزی سے اور بہت سخت قسم کی ٹرانسفارم ہو رہی ہے مس امرحہ ــــ اگر آپ کو رونا ہے تو کسی ایسی جگہ چلی جائیے جہاں آپ کو کوئی نہ دیکھے ــــ ٹھیک ہے۔"

"جی ٹھیک ہے ــــ"

"پہلے جا کر اپنا اسٹوڈنٹ کارڈ بنوائیں ــــ اپنی کلاسز کا معلوم کر لیں۔" وہ سہم سی گئی کہ ابھی یہ سب بھی کرنا ہے۔

"کارڈ ــــ یہ کہاں سے بنے گا ــــ"

"آپ یونیورسٹی میں کھڑی ہیں اور سب اسی یونیورسٹی میں ہوتا ہے ــــ یہ جو آپ اتنے سارے اسٹوڈنٹس دیکھ رہی ہیں۔ یہ سب بیچارے اپنے سب ہی کام کر رہے ہیں ــــ آپ بھی یونیورسٹی میں گھومیں پھریں کہ آپ کے کام کیسے ہو سکتے ہیں ــــ یا آپ کو کیسے کرنے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پلیز دل ہی دل میں مجھے برا بھلا مت کہیے۔" امرحہ کا رنگ فق ہو گیا وہ یہی کر رہی تھی۔

"اور پلیز جب آپ کی جاب کا انتظام ہو جائے تو ہانا کے پونڈز واپس کر دیجیے گا ــــ"

"کر دوں گی ــــ"

"اور ــــ ایک اور بات ــــ دوبارہ کبھی اپنی ڈگری سے چھیڑ چھاڑ مت کیجیے گا ــــ خاص کر پلیس کو ایڈ کرنے کی غلطی ــــ"

یہ آخری لیکن سب سے خطرناک بم تھا جو کینٹین کے شور و غل میں بہت اہتمام سے پھٹا ــــ وہ ان کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے ابھی ابھی افریقہ کے کسی قدیم قبیلے سے انسانی کھوپڑیاں اٹھا کر لائے ہیں اور اسے بتا رہے ہیں کہ یہ کچھ زیادہ خوفناک نہیں ــــ وہ کوئی جنگلی درندہ نہیں یہ پہاں سے چلنے والی بڑی سی بس ہے جس پر سفر لیا جاتا ہے اور جسے ایک ڈرائیور چلاتا ہے ــــ وہ دیکھا تو کوئی بڑا درندہ نہیں۔

ان تینوں کی شکلیں ــــ جیسے قہقہوں کے دھماکوں کو وہ اندر ہی اندر دبا رہے ہوں ــــ وہ اس آخری بات پر ہنسی کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے اور وہ دھاڑیں مار کر نہ رونے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہوئی جا رہی تھی ــــ اس کی شکل سب بتا رہی تھی ــــ اسے خیال سا آیا کہ اس کی نحوست کو لے کر اس پر جو حملے کیے جاتے رہے تھے۔ وہ کتنے معمولی سے تھے ان حملوں کے مقابلے میں جو مانچسٹر میں مانچسٹر والوں نے اس پر کیے۔

وہ تو تھی ہی چھوٹی سی بچی تھی۔ اسے خوش بھی نہ ہونے دیا گیا اور رلا دیا ــــ رلا دیا۔

آنسوؤں کا سمندر اس کی آنکھوں میں تیرتا نظر آنے لگا۔ ان تینوں نے اس کی شکل کی طرف دیکھا اور بالکل خاموش ہو گئے پھر اٹھ کر چلے گئے ــــ اگر وہ اس کے اولین استاد تھے تو کمال کے استاد تھے۔ انہوں نے اسے سمندر میں دھکا دے دیا تھا یا ڈوب کر مر جاؤ یا تیر کر ابھر آؤ ــــ مانچسٹر میں ملنے والا پہلا سبق ــــ مانچسٹر

میں سنا جانے والا پہلا لیکچر اور مانچسٹر میں گرائے جانے والے اولین آنسو۔۔۔۔

"ویلکم ٹو مانچسٹر (مانچسٹر میں خوش آمدید)

☼ ☼ ☼

وہ کینٹین سے نکلی اور ایک ایسا گوشہ ڈھونڈنے لگی جہاں کوئی نہ ہو لیکن ویلکم ویک تھا۔ یونیورسٹی میں ایسا رش تھا جیسے چودہ اگست کو مال پر ہوتا ہے۔۔۔۔ خاص کر چین اور رینگل چوک کے پاس۔۔۔۔ خیر وہ سبزے پر بیٹھ گئی۔۔۔ اور منہ نیچے کر کے رونے لگی۔۔۔ آج اس کا پہلا دن تھا تو وہ بہت اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی۔۔۔ اس نے مسکارا بھی لگایا تھا اور آئی لائنر بھی۔۔۔ میک اپ کے نام پر وہ یہ دو چیزیں زیادہ استعمال کرتی تھی۔۔۔ کافی دیر تک وہ سول سول کرتی رہی۔۔۔ اس کا مسکارا پھیل گیا اور آنکھیں رگڑنے سے آنکھوں کے آس پاس اوپر نیچے سیاہی پھیل گئی۔۔۔ اس کے پاس ٹشو نہیں تھا۔ اپنے سفید دوپٹے سے وہ صاف کرنا نہیں چاہتی تھی۔ انگلیوں سے جتنا آنکھیں صاف کر سکتی تھی اس نے کر لیں۔ اس کے چہرے پر کافی سیاہی پھیل چکی تھی اور وہ عجیب مضحکہ خیز سی لگ رہی تھی پر اب اسے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اچھی لگ بھی رہی ہے یا نہیں۔۔۔ خوب جی بھر کر رو لینے کے بعد وہ اٹھی۔ ایک اسٹوڈنٹ وہاں سے اس کے پاس سے گزرا۔

"مجھے جاب چاہیے۔" آنکھوں کو رگڑتے اس نے کہا۔

"جاب۔۔۔ امیرے پاس جاب نہیں ہے۔"

"پاگل! مجھے جاب چاہیے۔ کیسے ملے گی۔۔۔؟"

اس نے اپنا غصہ اس پر اتارنا چاہا۔

"اوہ۔۔۔ مجھے تو ابھی خود ڈھونڈنی ہے۔" وہ کہہ کر چلا گیا۔

تین چار اور ایسے ہی نمونوں سے ملی وہ ایک جگہ جا کر کھڑی ہو گئی اور آس پاس موجود دوسرے اسٹوڈنٹس کو دیکھنے لگی۔۔۔ وہ بہت تیزی سے آرہے تھے جا رہے تھے۔۔۔ ہنس رہے تھے باتیں کر رہے تھے قہقہے لگا رہے تھے۔۔۔ وہ سب بہت خوش اور پرجوش تھے۔۔۔ ان سب کے چہرے دمک رہے تھے۔ وہ چالیس ہزار اسٹوڈنٹس میں بلکہ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی لڑکی ہو گی جو ایسے ایک طرف کھڑی مزید رونے کی تیاری کر رہی تھی۔۔۔ وہ اپنے سنہری وقت کو برباد کر رہی تھی۔۔۔ وہ چپ کھڑی سب کو دیکھتی رہی۔۔۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے بھی چلنا پھرنا چاہیے۔۔۔ اور ایک دم اسے یاد آیا کہ اسے اپنا اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کارڈ صرف آج کے دن ہی بنے اور آج ہی نہ بنوانے پر اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔

وہ پھر سے اسٹوڈنٹس کے ریلے میں شامل ہو گئی اور او گوڈ پوگیلن کی طرح منہ اٹھا کر چلتی رہی۔۔۔ گھومتی رہی۔۔۔ ایک سے دوسرے کیمپس جیسے وہ کسی تاریخی ذخیرے کا جائزہ لینے آئی ہو، پڑھنے نہیں۔۔۔۔

"آپ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں یقیناً۔" گہرے جامنی یونیورسٹی کلر کی شرٹ پہنے اور Ask me (مجھ سے پوچھیں) کا بورڈ ہاتھ میں لیے وہ خود ہی اس کے قریب آیا تھا۔۔۔ وہ دو تین بار اس کے پاس سے گزری تھی بلکہ وہ کئی بار Ask me کے پاس سے گزری تھی۔

"مجھ سے پوچھنے میں آپ کی مدد کروں گا۔"

اوہ اچھا۔۔۔ Ask me کا بورڈ وہ اس لیے گھوم رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ویب سائٹ کی پروموشن کر رہا ہے۔

"مجھے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔" یہ کہتے وہ اس کی بے جا لمبی ناک کو دیکھنے لگی۔

"ویل یہ تو بہت ہی آسان ہے۔۔۔ یہاں چلی جائیں۔" اس نے اس کے ہاتھ ایک نقشہ دیا۔ اس پر ایک جگہ سرخ دائرہ لگایا۔

"آپ کا دن اچھا رہے۔۔۔" وہ مسکرائے گا۔۔۔ اس کی لمبی ناک پھیل سی گئی۔۔۔ وہ پھر سے اس کی ناک کو دیکھنے لگی۔

"کچھ اور پوچھنا ہے۔" وہ زبردستی بولا۔ یقیناً وہ جان گیا تھا کہ وہ مضحکہ خیز انداز سے اس کی ناک کو گھور رہی ہے۔

اب وہ ہاتھ میں پکڑے نقشے کو دیکھنے لگی اسکول کے کورس کی کتاب کے نقشے کے علاوہ یہ اس کے ہاتھ میں آنے والا پہلا نقشہ تھا جو کسی عمارت کا تھا۔۔۔ اور دور سے کہہ سکتی تھی۔۔۔ وہ اس نقشے کو استعمال کر کے بھٹک تو کئی بار سکتی تھی لیکن اصل مقام پر پہنچا سویں کوشش پر بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔۔۔ مزید کسی سے کوئی لیکچر نہ سننا پڑے۔۔۔ وہ آرام سے نقشہ لے کر بھٹکتی رہی۔۔۔ بھٹکتی رہی۔۔۔ اسے ایک ڈر اور بھی تھا کہ کہیں وائم تو ولی وغیرہ اس کے پیچھے نہ ہوں کہ دیکھیں یہ اپنے کام کر بھی پاتی ہے کہ نہیں۔۔۔

ادھر ادھر گھومتے تین چار بار آسک می نے اسے لوٹ لیا۔

"آپ جا کیوں نہیں رہیں۔۔۔؟" نقشہ دینے والا اس کے پاس آیا۔

"مجھے راستہ ہی نہیں مل رہا۔"

"میں نے نشان لگایا تو ہے۔۔۔ بورڈز پڑھتی جائیں اور چلتی جائیں۔"

"آپ مجھے چھوڑ آئیں۔"

"نہیں۔۔۔" اس کی دونوں آنکھیں کچھ زیادہ ہی پھیل گئیں۔ امرحہ کا انداز ہی ایسا تھا کہ بھائی ذرا مجھے میری دوست کے گھر تک تو چھوڑ آ۔

اس بار اس نے باقاعدہ ہاتھ سے اشارے کر کے اسے سمجھایا۔۔۔ یہاں سے آگے جا کر سیدھا۔۔۔ پھر تھوڑا سا بائیں طرف۔۔۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا۔۔۔ آپ مجھے چھوڑ آئیں۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر۔۔۔!" اس بار وہ بے چارہ ایسے حیران ہوا جیسے اس کا کوئی محو رشتہ دار اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔

"کیسا ڈر۔۔۔؟ آج ہالووین نہیں ہے۔"

"مجھے ان سب سے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے آس پاس چلتے پھرتے ہر قوم و نسل کے لڑکا لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

امرحہ کی طرف اچنبھے سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ایک قہقہہ لگانا ضروری سمجھا پھر واکی ٹاکی نکال کر بولنے لگا۔

"جارج۔۔۔ سنو ایک ہندوستانی لڑکی۔"

"پاکستانی۔۔۔" اس کی بھنویں تن گئیں۔

"جارج ایک پاکستانی۔۔۔ بلیو لینڈ وائٹ۔"

"ڈارک بلیو شرٹ اور وائٹ دوپٹا۔"

"ڈارک بلیو شرٹ اینڈ وائٹ دوپٹا۔۔۔"

"دوپٹا۔۔۔"

"دوپاٹا۔۔۔ میں آرہی ہے، پلیز آگے سے آگے ریفر کرتے جانا اور اسے اسٹوڈنٹ کارڈ کاؤنٹر تک پہنچا دینا۔"

"ریفر کیوں کرتا ہے۔۔۔ اتنا وقت کس کے پاس ہے۔ [illegible]" اس نے بھی سن لی۔

"اسے ڈر لگ رہا ہے۔" لمبی ناک والے نے [illegible] کہا۔

"آپ۔۔۔ کیا مذاق ہے یہ۔۔۔"

"وہ سنجیدہ ہے۔۔۔ مکمل سنجیدہ۔۔۔ یا یونیورسٹی میں اعلان کروا دو کہ سب تھوڑی دیر کے لیے یونیورسٹی کو خالی کر دیں تاکہ وہ اسٹوڈنٹ کارڈ بنوا سکے۔۔۔ تم سن رہے ہو جارج۔"

جارج یقیناً سن رہا تھا۔۔۔ کیونکہ اس کا بلند بانگ قہقہہ امرحہ نے سنا تھا۔۔۔ حد ہے کوئی اسے سمجھ کیوں نہیں رہا آخر۔۔۔

"اس طرف چلی جائیں۔۔۔ اگلے آسک می کو اپروچ کریں۔"

اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔۔۔ وہ دائیں طرف چلی گئی اور ایک آسک می کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگا کہ جو پوچھنا ہے وہ پوچھے۔۔۔

"میں مزید آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔" اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ یعنی یہ وہ جارج نہیں تھا جسے اسے اپروچ کرنا تھا۔

"مجھے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ یہ لیں یہاں چلی جائیں۔" اس نے بھی نقشے پر سرخ دائرہ لگا کر اسے دیا۔

"مجھے میپ نہیں چاہیے۔"

"تو۔۔۔ انتظامیہ نے ابھی تک ایر بس کا انتظام نہیں کیا یہاں۔"

اف کتنی تیز زبانیں تھیں ان سب کی۔۔۔

"مجھے وہاں تک چھوڑ آئیں۔"

"میں کیوں۔۔۔؟ آپ کو آسانی سے راستہ مل جائے گا۔۔۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں۔ میں آسک ٹی ہوں "ڈراپ یو" نہیں۔"

"نہیں مل رہا نا راستہ۔۔۔"

"سب اپنے اپنے راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آپ کو بھی مل جائے گا۔"

"سب تیز ہیں۔۔۔ چالاک ہیں۔۔۔ مکار ہیں۔۔۔ میں نہیں ہوں۔۔۔ میں ڈرپوک ہوں۔" اس نے روانی سے اردو میں کہا اور خاموش ہو گئی اور صرف کندھے اچکائے کہ بس نہیں مل رہا۔

"سب ذہین ہیں۔۔۔ ذمہ دار ہیں۔۔۔ پڑھے لکھے ہیں اور خاص طور پر اپنی مدد آپ کے قائل ہیں۔" جواب اردو میں آیا۔ اس نے ٹھٹک کے اس انگریز کو دیکھا جس کی گھنی بھوری آنکھیں تھیں اور سفید سرخی مائل رنگت گوری اور بڑے بڑے کان تھے۔۔۔ کچھ زیادہ ہی بڑے لگ رہے تھے۔

اس کا واکی ٹاکی بولا۔

"بلو شرٹ وائٹ ڈوپٹا۔۔۔ پاکستانی۔۔۔ ظفر قرنے تو پلیز آگے ریفر کریں۔"

"میں تھک گئی ہوں چلتے چلتے۔۔۔ مجھے بھوک بھی لگی ہے۔۔۔ مجھے کتنا اور آگے ریفر کریں گے۔"

"یہ آپ کا پہلا دن ہے؟"

"جی۔۔۔"

"آپ پہلے ہی دن تھک چکی ہیں۔۔۔ آسک می کا بورڈ پکڑے یہاں کھڑے یہ میرا تیسرا دن ہے۔۔۔ میں ابھی تک نہیں تھکا۔"

"آپ لڑکے ہیں۔۔۔"

"آپ جیسی لڑکیاں بھی نہیں تھکیں۔" اس نے دور کھڑی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو بورڈ لیے کھڑی تھی اور تیزی سے اسٹوڈنٹس کی رہنمائی کر رہی تھی۔

"آپ ہم سے کچھ بھی پوچھ کر ہم پر احسان نہیں کر رہیں بلکہ ہم کر رہے ہیں۔ آپ نہیں ہم تھکے ہیں۔۔۔ ہمیں اس کام کے پیسے نہیں مل رہے۔ ہم یہ بورڈ لے کر رضاکارانہ خدمات پیش کر رہے ہیں۔۔۔ آپ ایک باس کی طرح ہم پر حکم نہیں چلا سکتیں۔۔۔ تھک گئی ہیں تو سینما جا کر بیٹھ کر ٹام اینڈ جیری دیکھیں۔ آپ کی تھکن اتر جائے گی۔"

"آپ کو بات کرنے کی تمیز سیکھنی چاہیے۔"

"آپ کو تھکن اتارنے کی مشق کرنی چاہیے۔"

"میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" اس نے چبا کر کہا۔

"بیسٹ آف لک۔" اس نے کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا کہ اب جاؤ۔

وہ دوسری طرف جا کر ایک لڑکی سے پوچھنے لگی اور آخر کار پوچھتے پاچھتے اسٹوڈنٹ کاؤنٹر تک آ گئی۔۔۔ اور اپنے کاغذات دینے کے بعد تصویر کے لیے ڈیجیٹل کیمرے کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"تمہارا کچھ گم ہو گیا ہے؟" کاؤنٹر سرنے کاؤنٹر سے اپنا آدھا نکلا سر آگے کر کے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔"

"تو مسکراؤ بھئی۔۔۔ تم مانچسٹر میں ہو۔"

"مانچسٹر میں مسکرانا پڑتا ہے؟"

"بالکل۔۔۔ کیونکہ مانچسٹر مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔۔۔ یہاں اداسی کا کیا کام۔۔۔ یہ تو دنیا بھر کے Swans (راج ہنس) کی جگہ ہے۔" وہ مسکرائی۔

"بلیک سوان۔" اسے بڑبڑاہٹ سنائی دی اور اس کی تصویر کھینچ دی گئی۔

"نہیں۔۔۔ ایک اور پلیز۔" اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

اس بار وہ مسکرائی اور وائٹ سوان بن گئی۔۔۔ کیونکہ وہ دل سے مسکرائی وہ مسکراہٹ جو اس نے یہاں آ کر سیکھی تھی۔

کیونکہ اسے رونے کی عادت تھی۔۔۔ اسے یہی

عادت ڈالی گئی تھی۔ بات بات پر رونے کی۔۔۔ اسے بات بات پر رلانا سب کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔۔۔ اور وہ دل چھوٹا کر بیٹھتی تھی کیونکہ اسے دل بڑا کرنا سکھایا ہی نہیں گیا تھا یہی اس کا ماحول تھا جو اسے ملا تھا۔۔۔ اسی ماحول کی وہ عادی تھی اسے نہیں بتایا گیا تھا کہ جس زمین پر رینگا جاتا ہے اس پر شان سے چلا بھی جا سکتا ہے اور دوڑا بھی۔۔۔ وہ ایسی ہی رینگتی' روتی دھوتی زندگی گزارتی رہتی اگر وہ یہاں نہ آتی۔۔۔ کیونکہ اسے کبھی نہیں کہا گیا تھا "یو آر لائے بیوٹی فل ڈیئر۔۔۔ فلائی جسٹ فلائی۔" (میری پیاری تم ایک پرندہ ہو۔۔۔ تو تم اڑو۔۔۔ بس اڑو)

اسے تو کہا گیا تھا کہ تو منحوس ہے۔۔۔ بدبخت ہے۔۔۔ کالی نظر اور کالی زبان والی ہے۔۔۔ مانچسٹر یونیورسٹی کے پھاٹک سے اندر آتے ہی کچھ اور سکھایا جا رہا تھا۔

"مسکراؤ کہ رونے کے لیے زندگی میں کوئی دن نہیں بنا۔۔۔"

"اڑو کہ اڑنے کا حق صرف پروالوں کے پاس نہیں۔"

"اور ایسے کھل کر مسکراؤ کہ ۔۔۔ بہتر گلستان میں کوئی کلی نہیں۔"

"تم سب کر سکتی ہو۔۔۔ سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔۔۔ ناکامی اور مایوسی کی فضا میں ہمیشہ سانس بھرنا تم پر فرض نہیں۔"

کلرڈ لے کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے کاؤنٹر پر کا شکریہ ادا کیا بس اتنی سی تو بات تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس درس گاہ کو دنیا کی بڑی درس گاہوں میں کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ اس درس گاہ نے اسے پہلے دن ہی رینگنے سے چلنا سکھایا تھا۔۔۔ ذمہ داری۔۔۔ خود اعتمادی۔۔۔ آگے بڑھ کر کر لینے کی صلاحیت عطا کر دی تھی۔

ہاتھ میں کارڈ لے کر وہ اپنی مسکراتی چمکیلی سیاہی سے لبی آنکھوں کو دیکھنے لگی اور ہنس پڑی۔۔۔ وہ بدشکل تھی۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا اگر وہ بدصورت بھی لگ رہی تھی تو۔۔۔ یہاں دماغ والوں کو سلیوٹ کیا جاتا تھا۔

خوب صورت چہروں کو نہیں۔۔۔ اور دماغ کو کام پر لگانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔۔۔ سب آسان تھا۔۔۔ سب۔۔۔ کچھ بھی دور نہیں تھا۔ سب پاس تھا۔ دونوں ہاتھوں کی دونوں مٹھیوں میں تھا۔۔۔ ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر وہ باہر آ گئی۔۔۔ دن روشن تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے بال نرمی سے لہرانے لگے۔ اس نے اپنے بیگ کا اسٹریپ لمبا کیا اور اسے دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح کراس کر کے پہن لیا (دائیں سے بائیں طرف) اور اعتماد کے ساتھ چلنے لگی۔

"امرحہ ماجد" گولڈ میڈل لینے کے لیے روز میں پورے یوں یہاں سے شامل ہو چکی تھی۔۔۔ تنہائیوں کی خاطر۔ نشتوں پر اسے کسی صورت نہیں بیٹھنا تھا۔۔۔ اس کے نام کی آگہی سے اب یہاں کبھی نہیں ہوگی۔

✲ ✲ ✲

آکسفورڈ روڈ پر وہ سیدھی چلتی جا رہی تھی۔ صبح اس نے وہ مناسا ناشتا کیا تھا اور اب اسے بھوک لگی تھی لیکن وہ کھانا کھانے نہیں جا رہی تھی نوکری کی تلاش کے لیے جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے اندر کی طرف باہر بھی اسٹوڈنٹس کی بہت رونق لگی تھی۔ کچھ اور ذرا آگے سڑک کے اس پار اسے چرچ نظر آیا۔ اس کا دل چاہا کہ اندر جا کر دیکھے چرچ کو پھر وہ اپنی ہی سائیڈ پر چلتی رہی اب دو سال یہیں رہنا تھا تو وہ سب دیکھ لے گی۔۔۔ اگر نوکری کا انتظام نہ ہوا تو ایک ماہ بعد ہی واپس جانا پڑے گا۔۔۔ سڑک ختم ہو گئی لیکن اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں وہ نوکری کی بات کر سکتی۔۔۔ سڑک کے سامنے دوسری طرف اسے عبدالہادی حلال فوڈ کی دوکان نظر آئی۔۔۔ سڑک پار کر کے وہ اس دوکان میں آئی۔ بلاشبہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بجلے سے کانپ رہی تھیں اس نے اندر جا کر کاؤنٹر والے سے بات کی۔ اس نے سلیقے سے اسے بتایا کہ فی الحال وہاں اسے نوکری نہیں دی جا سکتی۔

"کیا کچھ دن بعد دی جا سکتی ہے۔۔۔ دو ہفتوں بعد"

"نہیں۔۔۔ شاید ایک سال بعد جب میں یہاں سے چھوڑوں گی۔"

وہ اگلے اسٹور "بک اینڈ کلک" میں گئی۔ وہ کمپیوٹر اسٹور تھا اور وہ کمپیوٹر ہینڈلنگ کے بارے میں یقیناً نہیں جانتی تھی اور ظاہر ہے اسے نوکری نہیں دی گئی جبکہ اسی اسٹور پر دوسری لڑکیاں کمپیوٹر ریپئرنگ کا کام کر رہی تھیں۔

ان ہی اسٹورز اور دکانوں کے عین سامنے سڑک پار کر کے تھرڈ اور برگر اور۔۔۔ دیگر چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ کھلے تھے وہ وہاں بھی گئی اور زیادہ خود اعتمادی سے گئی۔۔۔ اب اس کے صرف دل کی دھڑکن تیز تھی۔۔۔ لیکن شام تک نہ اس کے دل کی دھڑکن تیز رہی نہ ٹانگوں میں کپکپاہٹ، صرف زبان میں تیزی رہی وہ ہر ریسٹورنٹ، دکان، اسٹور میں جاتے ہی تیزی سے چلنے لگتی۔۔۔ وہ تھک گئی تھی لیکن رکی نہیں تھی۔۔۔ اسے بھوک بھی تھی لیکن پیسے بچانے کے لیے اس نے باہر سے کچھ بھی لے کر نہیں کھایا۔۔۔ اور [illegible] بڑھ کر اس نے یہ کام کیا کہ اس نے [illegible] جانے والی ایک لڑکی سے لفٹ لی اس نے کاغذ پر لکھے ہوئے پتے کو لڑکی کے آگے کر دیا۔

"میں تمہیں [illegible] تک لے جا سکتی ہوں۔۔۔ آگے تمہیں پیدل چلنا ہو گا۔" اس نے کہا۔

اب سائیکل پر بیٹھے جاتے ہوئے قطعاً ہنسی نہیں آ رہی تھی۔۔۔ اس کے پیٹ میں بھوک کی وجہ سے بل پڑ رہے تھے لیکن اسے رونا نہیں آ رہا تھا وہ اس پر غم زدہ بھی نہیں تھی۔ وہ خود کو بے چاری بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔

صبح ان ہی کھلی روشن قدیم عمارات سے بھری سڑکوں سے آتے ہوئے بھی وہ امرحہ واجد ہی تھی اور ان ہی سڑکوں سے پھر سے گزرتے ہوئے بھی وہ امرحہ واجد ہی رہی۔۔۔

تبدیلی ظاہر میں نہیں باطن میں آ گئی تھی۔۔۔ اور کلی سے زیادہ آ چکی تھی۔۔۔ کلی سے زیادہ آنے والی تھی۔

گھر آئی تو اس کا لنچ کاؤنٹر پر رکھا تھا اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سب اپنے اپنے کام پر جا چکی تھیں۔ اس نے لنچ کو رات کے کھانے کے طور پر کھا لیا اور منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو کر سو گئی۔ دو گھنٹے بعد وہ اٹھی تو کتابیں پڑھنے لگی۔ رات کو وہ ایک ایک کر کے آتی گئیں اور سوتی گئیں لیکن وہ جاگ کر پڑھتی رہی۔

* * *

اگلے دن صبح شرلی کے ساتھ اس نے جاب کی بات کی کہ اسے کہاں جانا چاہیے اور کہاں نہیں۔ شرلی نے اسے دو تین جگہوں کے نام بتائے اور پتے بھی سمجھا دیے۔

سیلف انرولمنٹ کروانی تھی تاکہ اپنی کلاس کا علم کر سکے اس کے لیے یونیورسٹی ایریا میں الگ سے بہت بڑا کیمپ لگایا گیا تھا جہاں ہر ڈیپارٹمنٹ کا کاؤنٹر لگا ہوا تھا۔ پھر اسٹوڈنٹس ان کاؤنٹرز پر اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر انجام دے رہے تھے سب کے سب یونیفارم میں ملبوس تھے تاکہ انہیں دور سے ہی پہچان لیا جائے۔۔۔ اس ایریا میں بھی ویسے ہی رش تھا جیسے وہاں ایک مہذب اور ریو [illegible] سجا ہو۔۔۔ آہستگی سے لیکن جلدی جلدی بولنے کی آوازیں تھیں اور ایک ساتھ ایک جگہ جمع ہو کر شور بن گئی تھیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مطلوبہ کاؤنٹر تک آئی اور بنیادی معلومات لینے لگی۔ لیکن ایک مسئلہ تھا جو لڑکی اسے سب سمجھا رہی تھی وہ فرنچ تھی اور اس کی انگلش اچھی ہو کر بھی امرحہ کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھی۔۔۔ اس نے لڑکی سے ایک دو بار کہا کہ

"برائے مہربانی پھر سے بتائیں اور آہستہ بتائیں۔۔۔ میں کچھ نہیں پا رہی۔" اور لڑکی نے ایسا کیا بھی لیکن امرحہ پھر بھی کچھ خاص سمجھ نہ سکی۔

"ڈیرک! اسٹو تم ان کی مدد کرو۔" لڑکی نے خوش اخلاقی سے اپنے ساتھی سے کہا جو ان دونوں کی طرف سے رخ موڑے کسی دوسرے کا مسئلہ حل کر رہا تھا۔

"جی۔۔۔" ڈیرک نے اس کی طرف دیکھا اور اس

کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

یہ وہی Ask me کا بورڈ پکڑے لمبی ناک والا تھا۔ اس سے پہلے کہ امرحہ کچھ بولتی۔ اس نے اپنی ناک کو ایک ہاتھ سے چھپا لیا۔

امرحہ کا دل چاہا واقعی اس کی ناک پر اپنے ہاتھ میں پکڑی موٹی فائل دے مارے... یہ نقصان یقیناً" اس کا کوئی مشہور زمانہ مذاق بن جائے گا جو ساری یونیورسٹی میں مشہور ہو جائے گا۔

"فرمایئے۔ میں آپ کو کیسے ڈرا سکتا... آئی ایم سوری! آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

ناک بدستور اس نے بائیں ہاتھ سے چھپا رکھی تھی۔ امرحہ نے کاغذ اس کی طرف بڑھایا جس پر اس کے مضمون لکھے تھے اور اس نے پڑھ کر دوسرے کاغذ پر کم سے کم چند منٹ لگا کر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ سب کچھ لکھ دیا... کلاس کے اوقات کار۔ ٹیچرز کے نام... مزید مدد کے لیے اس کی جماعت کے دو تین ہم جماعتوں کے نام... ان کی رہائش کے پتے... پھر اس نے نقشہ نکالا اور اس پر سرخ دائرہ لگایا۔ "یہ آپ کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔"

"اسے اس کا ڈیپارٹمنٹ دکھا آؤ۔" اس نے قریبی لڑکی سے کہا۔

لڑکی نے اچنبھے سے پھر ڈیرک کو دیکھا اور امرحہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

"کیوں... یہ خود چلی جائے گی نا..."

"نہیں... یہ خود نہیں جاتی... اسے ڈر لگتا ہے۔"

امرحہ نے ڈیرک کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ لیا... ڈیرک کے قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا... وہ دعا کر رہی تھی کہ پہلے دن جو جو لوگ اسے ملے ہیں ان سے دوبارہ اس کی ملاقات نہ ہو... ایک لڑکی اس کے پاس سے گزری اور ایکدم سے رک گئی۔

"کہاں مدد چاہیے؟" ساتھ ہی اس نے امرحہ کے ہاتھ میں پکڑا کاغذ لے لیا۔

"یہاں جانا ہے نا... میں ابھی وہیں سے آ رہی ہوں... بلکہ پھر سے وہیں جا رہی ہوں... آجاؤ میرے ساتھ۔" وہ خواری سے بچ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ اسے ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ گئی... اس نے اپنی کلاسز دیکھ لیں اور اوقات کار بھی... اپنی کلاسز دیکھ کر اسے خاصی خوشی ہوئی۔ وہ اس کی سوچ سے زیادہ خوب صورت تھیں۔

یونیورسٹی سے نکل کر وہ پیدل ہی پھر سے نوکری کی تلاش میں لگ گئی... لیکن یہ کام تو مشکل ہی بنتا جا رہا تھا۔ یونیورسٹی سے بہت زیادہ دور وہ نوکری کر نہیں سکتی تھی۔ اس طرح اس کا بس کا کرایہ لگتا اور اس کی بچت مشکل سے ہی ہو پاتی۔

اس کی کلاسز شروع ہو گئیں... لیکن کام نہیں ملا۔ اسے پریشانی ہوتی کہ اگر وہ کام نہ ڈھونڈ سکی تو پھر سے [illegible] پڑ جائے گا لوگوں کے آگے۔ ٹھیک تھا لیکن [illegible] وہ بھی نہیں تھی۔ سو انتھک کوشش کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک دن یونیورسٹی سے چند منٹ کی واک پر واقع کیفے کے سامنے سے اس کا گزر ہوا۔ وہ یہاں پہلے بھی آ چکی تھی لیکن اسے جواب دیا گیا تھا کہ انہیں ضرورت نہیں ہے۔ اب ضرورت ہے کا بورڈ کیفے کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے پہلے کیفے میں بیٹھ کر کافی پی پھر کاؤنٹر تک آئی... اسے یہاں کام تو فوراً" ہی مل سکتا تھا لیکن صرف ایک مسئلہ تھا اور کافی بڑا مسئلہ تھا جو ویٹرس اسے نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے گھٹنوں تک اسکرٹ پہن رکھا تھا جو ایک مشہور کافی کے لیبل جیسا تھا یعنی کمپنی کا چلتا پھرتا اشتہار تھیں... اسے اشتہار سے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ یہ اسکرٹ تو نہیں پہن سکتی تھی اور جو حالات جا رہے تھے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اس واحد نظر میں آنے والے "ضرورت ہے" کے موقعے کو... ہاتھ سے جانے بھی نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے دراز قد فربہ مائل گورے چٹے انگریز سے بات کی... اس نے امرحہ

سے چند سوالات پوچھے اور اسے ہاں کہہ دیا۔۔۔ وہ خوش ہونے کے بجائے اسے دکھ سے دیکھنے لگی جتنی نوکری ملی بھی تو کون سی۔ جس پر شاید ابھی انکار ہو جائے جب وہ اس کی اگلی بات سنے گا۔

"مجھے اس کام کی بہت شدید ضرورت ہے۔۔۔ اگر مجھے یہ نوکری نہ ملی تو میرا مستقبل بہت بری طرح سے تاریک ہو جائے گا۔" اس نے اپنی طرف انگریز کو جذباتی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے تمہیں رکھ لیا ہے۔"

"میں یہ ڈریس نہیں پہن سکتی۔۔۔ میں جینز پر یہ شرٹ پہن لوں گی بس۔" اس نے ویٹرلیس کی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں اتنا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ تم جا سکتی ہو۔"

"اس دنیا کے روشن مستقبل کے لیے کیا آپ صرف اس نامکمل ڈریس کو نظر انداز کر کے تعلیم حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتی اس لڑکی پر ایک احسان نہیں کر سکتے۔۔۔ دنیا کا ہر انسان علم حاصل کرنے والے کی عزت کرتا ہے۔"

"مجھے صرف اپنے روشن مستقبل کی فکر ہے۔"

"آپ کس مذہب کے ماننے والے ہیں؟"

اس نے اسے گھورا۔۔۔ یورپ میں کبھی بھی کسی سے بھی اتنی جلدی اور ایسے مذہب کے بارے میں نہیں پوچھ سکتے۔۔۔ وہ برا مان جاتے ہیں۔

"میں یہودی ہوں۔" امرحہ کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

"مجھے گھورنا بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔۔۔"

"دیکھیے جناب اگر آپ مجھے کام دیں گے تو سب آپ کی تعریف کریں گے ایک یہودی نے ایک مسلم کا احترام کیا۔۔۔ اس کی اخلاقیات کا خیال رکھا۔۔۔ یونو وغیرہ وغیرہ۔"

"یہ وغیرہ وغیرہ کیا ہے؟"

"مزید تعریف۔۔۔ اور تعریف۔۔۔ سب آپ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

"لیکن مجھے اپنی کرسی پر بیٹھنا ہی اچھا لگتا ہے۔"

"پھر بھی ذرا سوچیے۔۔۔ یہ یونیورسٹی ایریا ہے۔۔۔ اسٹوڈنٹس آپ کی کس قدر عزت کریں گے۔۔۔ ہو سکتا ہے بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ سالانہ کانووکیشن ڈے پر آپ کو خاص طور سے مدعو کیا جائے گا اور آپ تقریر بھی کریں گے۔۔۔ ایسا دن آپ کی زندگی میں دوبارہ نہیں آ سکتا۔"

"مجھے کانووکیشن میں جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"جب آپ جائیں گے تب آپ کو یہ بہت دلچسپ لگے گا۔"

وہ کاؤنٹر پر بائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں بجانے لگا اور اسے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔۔۔ اس کی نیلی آنکھیں مزید نیلی ہو گئیں۔

"میں نے سنا تھا انگریز بہت رحم دل ہوتے ہیں۔"

"میں پولش ہوں۔"

"مجھے اندازہ تھا لیکن پولش تو دنیا بھر میں انسان دوست مشہور ہیں۔ اخلاقیات کی پاس داری کرنے والے۔۔۔ انسانی خدمت میں سب سے پہلے آنے والے۔۔۔ اور مدد کے لیے کبھی نہ پیچھے ہٹنے والے۔۔۔"

"تمہاری زبان ہمیشہ ایسے ہی چلتی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن جو کلاس میں نے ابھی آپ کے یہاں سے لی ہے اس کے بعد سے کافی زیادہ۔۔۔ آپ مجھے ایک ہفتے ٹرائل پر رکھ سکتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"میں شرط لگا سکتی ہوں جب لوگ مجھے ایک مسلم لیڈی کو فل ڈریس میں دیکھیں گے تو وہ اس طرف کھنچے چلے آئیں گے کہ یہ ایک انسان دوست کا کیفے ہے۔۔۔ یہاں کے مالک نے انسانیت کے لیے نام نہاد اصول کو توڑ دیا۔"

کیا واقعی۔۔۔؟" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کاؤنٹر بجانے لگا۔

"بالکل۔۔۔ آزما کر دیکھ لیں۔" یہ کہتے امرحہ کی نظر آ تاری جلدی جا چکی تھی۔

"ٹھیک ہے کل سے آجانا۔۔۔ تمہیں اصل کا لفظی پرسنٹ ملے گا۔"

"مجھے منظور ہے۔۔۔ ویسے آپ کو یہ اندازہ ہو گا ہی کہ روزانہ اس کیفے میں کتنے لوگ آتے ہیں۔۔۔" امرحہ کی ذہانت بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں دس سال سے یہ کیفے چلا رہا ہوں، سال میں صرف ایک بار آنے والوں کو بھی پہچان لیتا ہوں۔۔۔"

"میرا مطلب تھا کہ اگر کل زیادہ لوگ آئے تو۔۔"

"تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" وہ آنکھوں کو اندر کی طرف لے جا کر مسکرایا۔۔۔ اور یہ مسکراہٹ اس پر جم کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر گئی تو اس نے شرلی، عذرا وغیرہ سب سے کہہ دیا کہ کل ہر صورت وہ خود اور اپنے دوستوں کو لے کر اس کے کیفے آجائیں۔۔۔ ان چاروں نے آنے کا وعدہ کر لیا سوائے ہانا کے۔۔۔ اور انہوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ کوشش کر کے اپنے ایک یا دو دوستوں کو بھی ساتھ لے کر آئیں گی۔۔۔ صبح وہ دائم اور ویلا پاپ کے پاس بھی گئی۔۔۔ انہیں سب سچ سچ بتا دیا۔۔۔ دائم کتنی ہی دیر بے یقینی سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

"تم نے کس چالاکی سے یہ سب لیا ہے۔۔۔ ہے نا۔۔۔"

"کرنا پڑا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"میں اپنے تمام جماعتوں اور دوستوں کو بھی کہہ دیتا ہوں۔۔۔ کتنے دن کا ٹرائل ہے۔"

"ایک ہفتے کا۔۔۔ اگر روز آٹھ دس لوگ آئیں تو!"

"آٹھ دس تو کم ہیں۔۔۔ آخری دن تک میں تمہیں چالیس کر دوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

اور پھر یوں پہلے دن دس۔۔۔ دوسرے دن پندرہ پھر اٹھارہ، بیس۔۔۔ چھبیس اور آخری دن پورے تیس کم پچاس اسٹوڈنٹس وہاں کافی پینے گئے اور مزے کی بات یہ کہ انہوں نے اپنی برق رفتاری کی حد ہی کر دی۔۔۔ وہ کافی پینے جاتے کاؤنٹر تک آتے جاتے۔

"کتنے نوبل انسان ہیں آپ۔" مسکرا کر کہا جاتا۔

"آپ نے ایک مسلم خاتون کو بغیر کسی امتیاز کے نوکری دی۔"

"آپ جیسے انسان دوست لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔"

"ہم سب ضرور اپنے پروفیسرز سے آپ کی تعریف کریں گے" "آپ کو ہمارے کانووکیشن ڈے میں ضرور آنا چاہیے۔"

"بہت فرشتہ صفت ہیں آپ۔۔۔ ایسی صفات آج کل نایاب ہیں۔"

"اب ہم ہر ہفتے صرف یہاں ہی آیا کریں گے کافی پینے۔"

ان برق رفتار مفس کے ساتھ ساتھ وہ مسکرا تا رہا، مسکراتا رہا۔

"میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ڈرامے دیکھے لیکن ان چھ دنوں میں جو یونیورسٹی والوں نے میرے کیفے میں ڈرامہ سیشن کیا وہ سب سے شاندار رہا۔"

وہ ونگ کھڑی کاؤنٹر پر ہاتھ رکھے اسے جلتے ہوئے دیکھتی رہی، اس کا تو خیال تھا اس کا پلان کامیاب رہا لیکن یہ کیا۔۔۔

"تم ایک کاروباری انسان کو الو نہیں بنا سکتیں۔۔۔ رائٹ۔"

"رائٹ۔" اس نے کمزور سا رائٹ کہا۔

"پر۔۔۔ تم ایک کاروباری انسان کو متاثر ضرور کر سکتی ہو۔۔۔ رائٹ۔۔۔"

"رائٹ۔" وہ مسکرانے لگی۔

"دیکھو مس اخروٹ۔۔۔ میں تمہیں یہاں ویسے نہیں رکھ سکتا۔"

وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا اور امرحہ بھی۔۔۔ اس کی خوشیاں ان چھو ہو گئیں۔

"کافی کمپنی اس بزنس کے لیے مجھے پے کرتی ہے۔۔۔ اور اس کیفے کے پچاس فیصد مالکانہ حقوق کمپنی کے

پاس ہی ہیں۔۔۔ لیکن کیونکہ میری دلچسپی بڑھ گئی ہے کہ میں یونیورسٹی کے کانووکیشن میں بلایا جاؤں تو میں تمہیں عارضی طور پر یہاں رکھ سکتا ہوں۔۔۔ جب تک تمہیں کہیں اور نوکری نہیں مل جاتی تم یہاں کام کر سکتی ہو لیکن اگر کمپنی نے اعتراض کیا تو مجھے تمہیں فوراً دوسری جگہ دیکھنا ہوگا۔۔۔"

"کمپنی اعتراض نہیں کرے گی۔" وہ خوشی سے نہال ہو کر بولی۔

"کیوں؟ تمہیں کیسے پتا۔۔۔؟"

"میں دعا کروں گی کمپنی اعتراض نہ کرے۔"

"تم یہ دعا کیوں نہیں کرتیں کہ تمہیں کہیں اچھا سا کام مل جائے۔"

"وہ بھی کر رہی ہوں ساتھ ساتھ۔۔۔ لیکن فی الحال مجھ پر یہی دعا واجب ہے۔۔۔ کہ کمپنی اعتراض نہ کرے۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے مسکرا رہا تھا۔

"اور مجھے اخروٹ مت کہیے۔۔۔ آپ مجھے چلغوزہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ چلغوزے مجھے بہت پسند ہے۔"

وہ خوشی سے بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔۔۔ کھڑکی سے باہر مانچسٹر کی سڑکوں پر اترنے والی رات بہت روشن تھی۔۔۔ جب سب ہی منظر ہو جائے۔۔۔ راتیں روشن ہو جائیں، تو زندگی کی شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ خوشبو رنگ۔۔۔ پھول، پھلوں سے لدی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کام سے بھی لگ گئی اور کلاسز میں بھی مصروف ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے بھی نوٹز کھانے شروع کر دیے۔ اپنی پہلی تنخواہ سے اس نے سب سے پہلے اپنا کی پسند کے نوٹز کا بڑا پیکٹ لیا جو وہ ہفتے تک کھا سکتی تھی۔ ساتھ ہی انڈے، دودھ کے ڈبے، جیم، ڈبل روٹی لے کر اس نے فریج کو بھرا تاکہ وہ سب بھی استعمال کریں۔۔۔ اب اسے رہائش کی تلاش تھی۔۔۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا رہائش کا مسئلہ بھی حل کر رہی تھی۔ گو شل نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اتنی پریشان نہ ہو رہائش کے لیے لیکن وہ پریشان تھی اگر اسے انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ڈھیٹ بن کر مستقل ہی وہاں جم جاتی اور بہانے بناتی کہ اسے رہائش نہیں مل رہی۔

چونکہ اسے شروع سے ہی بہت زیادہ کھانے کی عادت تھی تو ابھی وہ مکمل طور پر اپنی بھوک پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ چنے منے سے ناشتے سے تو اس کا پیٹ بھرتا ہی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ تو وہ شام کی چائے میں اڑا جایا کرتی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے وقت یونیورسٹی میں اسے کسی نہ کسی کی ٹوئیٹ مل جاتی۔ ٹوئیٹ۔۔۔!؟ (Twit)

تو ٹوئیٹ کانسپٹ کچھ یوں تھا کہ کسی بھی فرینڈ یا ہائے ہیلو فرینڈ یا کلاس فیلو کے پاس چلے جانا اور اس سے کہا جاتا کہ

"ٹوئیٹ می پلیز۔" (مجھے ٹوئیٹ کرو) اگر وہ چاہتا یا اگر کر سکتا تو اسے ٹوئیٹ کرتا یعنی ایک کپ چائے، کافی یا کوئی بھی کولڈ ڈرنک پلا دی جاتی۔۔۔ وائم گروپ نے اسے اپنی ساری ٹوئیٹس دے دی تھیں۔۔۔ ٹوئیٹ مانگنے والے کو وہ ٹوئیٹ واپس بھی کرنا ہوتی تھی۔

اب منظر کچھ یوں ہوتا کہ وائم یا نوال اس سے کہتے کہ جو سامنے حماد بیٹھا ہے۔ اس کے پاس میری چھ ٹوئیٹس ہیں۔ اس کے پاس جاؤ اور کہو۔

"ٹوئیٹ می بیک پلیز۔"

وہ جاتی اور کہہ دیتی۔۔۔ اسی طرح اسے شل، عذرا اور ایسے ہی دوسرے ہائے ہیلو دوست اپنی ٹوئیٹس دے دیتے۔۔۔ اکثر جن کی تین یا چار ٹوئیٹس اکٹھی ہو چکی ہوتیں ان کا وہ پیٹ بھر کر کھا لیتی۔ چکن برگر یا سینڈوچ یا پیزا کھائے جانے پر ایک ایکسٹرا ٹوئیٹ منتقل ہو جاتی۔ یعنی اگر چار ٹوئیٹس ہیں تو تین کا برگر اور ایک منفی۔ یعنی باقی زیرو۔۔۔ اور اگر تین ہی تھیں تو ایک جمع ہو جاتی۔ یعنی برگر کھانے والے کے کھاتے میں ایک ٹوئیٹ آ جاتی۔

پہلی بار تو امرحہ کو کلی سے زیادہ شرم آئی پھر اس نے محسوس کیا کہ امیر کبیر اسٹوڈنٹس بھی ایسا کر لیتے ہیں تو وہ بھی کرنے لگی۔ وائم، نوال، شل کے پاس

جاتی "ریفری آنوئیٹ پلیز۔" کتنی وہ سوچتے۔ کو تھر ادھر دیکھتے۔

"وہ سامنے۔۔۔ بلیو ایلن گراؤنڈ میں۔۔۔ وہ جس نے سفید شرٹ پہنی ہے۔ ہاں وہی اس کے پاس جاؤ۔"

کاغذ پر لکھ دیا تھا "نوٹیٹ ہر ایک" (واٹ نوٹیٹ واپس کر دو) اسی کاغذ پر نوٹیٹ دینے والا لکھ دیتا" بتاؤ وہ روپالی کی وہ بھی ہڑپ کر جاتی۔ اسے بڑا مزا آ رہا تھا۔ اسے نوٹیٹ پر نوٹیٹ مل رہی تھیں۔۔۔ اس نے اوا کو سب بتایا۔

"لوٹنے کے نت نئے انداز۔" وہ ہنسنے لگے۔

"دینے کے نت نئے انداز ہوا۔"

"کیا کمال کا جواب دیا ہے تم نے۔" وہ بہت خوش ہوئے اس دن وہ ڈرامہ گروپ کی ایک لڑکی اقصیٰ کے پاس گئی اور نوٹیٹ ریفر کرنے کے لیے کہا۔

"یہ تمہیں لائبریری میں ملے گا ورنہ کہیں نہیں ملے گا اس وقت۔۔۔ بڑے بڑے کان ہیں۔۔۔ لائبریری میں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ تمہیں اس کا پتا دیا جائے گا۔۔۔ پوری میں نوٹسز ہیں میری اس۔۔۔ کیا ہے۔"

"نہیں۔۔۔" امرحہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آرام سے چار پانچ برگر کھا۔۔۔ جا سکتے ہیں۔ وہ ہفتے آرام سے نکل جائیں گے۔

یعنی اگلے دو ہفتوں تک اسے بالکل خوار نہیں ہونا پڑے گا۔۔۔ وہ لائبریری میں گئی اور سرگوشی کے انداز سے اس کا پوچھا۔

"میں سمجھ نہیں پائی۔۔۔ کون سی کتاب چاہیے۔"

"اف۔۔۔ کتاب نہیں چاہیے۔۔۔ عالیان کا پوچھ رہی ہوں۔ جس کے بڑے بڑے کان ہیں۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ لائبریرین کے چہرے پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی اور اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ وہ اس کے پاس گئی اور کاغذ جس پر اقصیٰ کی لکھائی میں نوٹیٹ کا لکھا تھا اس کے آگے کیا۔

اس نے اپنی موٹی سی کتاب سے نظر اٹھا کر اس چٹ کو پڑھا پھر جس ہاتھ نے اس چٹ کو تھام رکھا تھا اسے خفگی سے گھورا۔۔۔ اس کی پیشانی پر ایک پتلی سی لکیر بن کر غائب ہو گئی۔

"سوری۔ اس وقت نہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"پھر کس وقت؟"

"ابھی آج نہیں۔۔۔ ان فیکٹ اگلے ہفتے تک نہیں۔۔۔ برائے مہربانی اس سے پہلے تنگ نہ کیا جائے۔"

"پر مجھے تو ابھی اسی وقت بھوک لگی ہے۔" اس کی تیز آواز پر وہ بھوری آنکھوں والا حیران رہ گیا۔ پیشانی پر خفگی سے اس بار دو لکیریں بن کر ابھریں اور وہیں براجمان رہیں۔

"نوٹیٹ نہیں۔۔۔" امرحہ نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ڈھٹائی اور تیز آواز میں کہا۔ یہی تو تھا وہ اس ان ڈور ویک کے دوران اس پر چلا دیا تھا۔ اب وہ اس پر چلا رہی تھی۔

"میں نہیں کر رہا۔" اس نے ذرا سختی سے کہا۔

"میں کیا کروں۔ مجھے تو بھوک لگی ہے۔" اس نے اس طرف آتے ہوئے ایک اور کام کیا تھا۔ اس نے کاغذ پر خود ہی سینڈوچ لکھ دیا تھا۔

اس کی تیز بھوری آنکھیں ایک لمحے کے لیے سیاہی مائل سی ہو گئیں۔ پیشانی پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا۔ 90ء کے ہیروز کی طرح اس نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے گھورا اور پھر وہ نوٹنکی ز کے ہیرو کی طرح اسے مکمل نظرانداز کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا نا اگلے ہفتے سے پہلے میرے پاس نہ آنا۔" وہ لائبریری بلڈنگ سے باہر نکلا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ بھی اس کے ساتھ نکلی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کھینچا اور تیزی سے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے لپک کر وہ کینٹین جا رہا ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو۔۔۔

"یہ کیا ہے اقصیٰ؟" اس نے دو انگلیوں میں اٹکا کاغذ اقصیٰ کے آگے کیا۔ "کس بھوکی کو میرے پیچھے لگا

رہا ہے۔"

"یہ کیا۔؟" امرحہ نے اس امریکی نقوش کے حامل۔ فریج غصے کو بھسم کر دیکھا۔ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔ اتنے دھڑلے سے۔ امرحہ نے آس پاس دیکھا۔ الف۔ یونیورسٹی کے سارے اسٹوڈنٹس انگوٹھے لہرا لہرا کر شرم کرو۔ شرم کرو۔ کہہ رہے تھے۔ پہلے تو امرحہ نے آنکھیں میچ لیں۔ پھر اس نے غصے سے بھڑک کر اسے دیکھا۔ اقصیٰ نے پڑھا کاغذ پر سینڈوچ لکھا تھا۔

"ٹویٹ می بیک پلیز۔" اقصیٰ نے اس کی عزت رکھ لی۔

"اگلے ہفتے۔" اس نے شان سے کندھے اچکائے جیسے ایک بڑا نقصان کرنے کے بعد اطالوی اچکاتے ہیں۔ بے نیازی سے بھی اور خونخواری سے بھی۔

"تم دونوں ہینڈل کر لو پلیز۔" اقصیٰ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک بھوکے اور دوسرے کنگلے کو کیسے ہینڈل کرے اور وہ کہہ کر گراؤنڈ سے اٹھ کر چلی گئی۔

"اگلے ہفتے سے ایک بھی دن پہلے میرے پاس نہ آنا۔" لمبے کانوں والے نے ناک چڑھا کر کہا اور پھر سے لائبریری کی طرف جانے لگا۔

"اگلے ہفتے تک میں مر جاؤں گی۔" وہ پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"ایک میری ہی ٹویٹ پر زندہ ہو کیا؟" وہ پھر سے ایک فریج بن گیا جو غصے کو دبانے کے لیے لفظ چباتے ہیں تو آنکھیں سرد مہری سے اندر کر لیتے ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ لیکن وہ اس کے اس طرح تم دے کر طنز جھاڑنے پر اسے دیکھتی رہ گئی۔ غصہ کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ کیسی بات کی۔

"آج تو اسی ٹویٹ پر رہنا ہے۔ سارے پیسے ختم ہو گئے اور فوڈ لز بھی۔ صبح جلدی کی وجہ سے چائے بھی نہیں پی۔" اس بات پر وہ ذرا رکا۔ اپنے کراس بیگ کو اپنی گردن سے نکال کر اسے کھنگالنے لگا۔ تھوڑا وقت لگا۔ لیکن وہ مطلوبہ چیز نکال چکا تھا۔

الف۔ اس نے ایک چاکلیٹ نکالی جو آدھی کھائی ہوئی تھی۔

"یہ لو۔" آدھی کھائی چاکلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"اس سے کیا ہو گا۔" چاکلیٹ دیکھ کر امرحہ کو خوشی تو ضرور ہوئی۔ لیکن فی الحال اسے سینڈوچ ہی کھانا تھا۔

"کافی کیلوریز ہیں اس میں۔" بھوری آنکھوں والے نے بیگ کو واپس گلے میں ڈالا۔ ایک ہاتھ جینز کی جیب میں ڈالا اور ایسے کھڑا ہو گیا جیسے اس کا فوٹو سیشن ہو رہا ہو۔

"ارد میسٹر ہوائی کے دنوں میں یونیورسٹی میں چیریٹی کرتے ہوئے۔" فوٹو کا کیپشن اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔

"مجھے کیلوریز نہیں چاہئیں۔ کھانا چاہیے۔"

"تو یہ کیا بھوسا ہے؟" ارد میسٹر نے بھنویں اچکا کیں اور وہ ایسے اچکائیں کہ وہ پیشانی پر گرے خوبصورت بالوں سے جا ملیں۔

"اور یہ چھوٹی — بھی ہے۔ چھوٹی اور آدھی کھائی ہوئی اور پھر میں کیوں کسی کی چیز کھاؤں۔" بھنویں۔ اس بار سالیہ اچکیں۔ یعنی اتنی انگو ہے تم میں۔ اچھا۔ سچ میں۔؟ دوسری طرف سے کھانا۔ آخری کنارہ پھینک دینا۔"

وہ منہ بنائے کھڑی رہی۔ اس نے پھر سے بیگ کھنگالا اور ایک پیکٹ نکالا۔ جس کے ریپر کو ایک کاسن پن سے بند کیا گیا تھا۔ تاکہ اندر موجود میٹھا بیگ میں بکھر نہ جائے۔ پیکٹ بسکٹ کا لگتا تھا۔

"یہ لو اور یہ بھی لو۔" چاکلیٹ اور بسکٹ دونوں اس کے آگے کیے۔ اس نے دونوں پیکٹ پکڑ لیے۔ ایک میں موجود چاکلیٹ تو اس نے دیکھ لی تھی۔ دوسرے کی پن نکالی تو وہ بسکٹ کا چورا نکلا۔

"مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ چیریٹی کر رہے ہو۔" امرحہ بری طرح سے برا مان گئی۔ لیکن اس نے جیسے سنا نہیں اور وہ تیزی سے لائبریری کی طرف جانے لگا۔

جو دونوں پیکٹ ہاتھ میں لیے کھڑی ہے۔ اسے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ لیکن جو جا چکا ہے کیا اسے جانتے ہیں؟

عالیان مارگریٹ۔ وہ اپنی ماں کے نام کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رہائش کا مسئلہ تھوڑا سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ جو رہائش مل رہی تھی یا تو وہ مہنگی تھی، جو سستی تھیں یا وہ دور بہت تھیں یا وہ لڑکوں کے ساتھ تھیں۔ سستی لڑکے لڑکیاں ایک ہی فلیٹ میں۔ سب اس کے لیے اپنی اپنی جگہ پر کوشش کر رہے تھے۔ وہ ایک دو برطانوی، پاکستانی، ہندوستانی گھرانوں میں بھی گئی۔ لیکن وہ رہائش بھی اس کی گنجائش سے زیادہ تھی۔ وہ بہت نارمل سی ایک رہائش افورڈ کر سکتی تھی۔ یعنی بے حد سستی سی۔ جتنی زیادہ سستی ممکن ہو سکے اتنی سستی اور یونیورسٹی کے پاس بھی۔

"ایک لینڈ لیڈی ہیں تو لیکن سنا ہے [illegible] کم ہی لوگ رہنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ انھیں تو سمجھنا بہت مشکل ہے وہاں جا کر دیکھ لو شاید تم ان کو سمجھ سکو۔"

"ٹھیک ہے وہاں بھی جا کر دیکھ لیتی ہوں۔" اس کا منہ لٹک گیا۔

"جلنے... ایسے ہی منہ لٹکائے گا۔" اور وہ اپنا مشہور زمانہ اور آزمودہ فقرہ ضرور کہتا۔ "منحوس ماری... تجھے تو جل مرجانا چاہیے۔" اس بات پر وہ نوال سے زیادہ ہنسی۔

"ایک دو لڑکیاں ہیں جو وہاں گئی تھیں۔ ایک چند دن بعد ہی واپس آ گئی اور ایک نے چند ہفتے بعد وہ گھر چھوڑ دیا۔ وہ لیے شنل کاک کہہ رہی تھیں۔"

"نام اچھا ہے شنل کاک۔"

"کہانی آتی ہے تمہیں؟"

"ہاں... ایک دو آتی ہیں۔"

"سنا ہے وہ ہر رات کہانی ضرور سنتی ہیں۔"

"اچھا... صرف کہانی... مطلب کرایہ نہیں لیں گی؟"

"ہاہاہا... کرایہ تو ضرور لیں گی... ساتھ کہانی بھی۔"

"ٹھیک ہے، میں دو چار کہانیاں یاد کر کے جاتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

شنل کاک کا پتا لے کر وہ چھٹی والے دن شام کو آ گئی۔ یہ ایک دو منزلہ برطانوی طرز تعمیر کا کافی بڑا گھر تھا۔ گھر کے آگے سبزے کا کافی بڑا قطعہ تھا۔ جس میں مختلف اقسام کے پودے اور پھول لگے تھے۔ ساری عمارت سفید رنگ کی اور وائٹ ہاؤس کا چھوٹا سا ماڈل سا تھی۔ [illegible] امرحہ کو شنل کاک کا بیرونی نظارہ بہت پسند آیا۔ بلکہ بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ اگر اسے [illegible] وہ مکمل شان دار قسم کی رہائش گاہ [illegible] تھی۔

بیل دی اور کافی دیر تک دیتی رہی۔ کھڑکیوں سے بھی جھانکتی رہی۔ دروازہ بھی بجایا۔ لیکن کوئی بات نہیں بنی۔ وہ دروازے کے پاس ہی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ شاید مالکن بازار تک گئی ہوں۔ کوئی بیس منٹ بعد جا کر دروازہ کھلا... وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے تک آئی۔

"مجھے کہانی آتی ہے۔" بہت کہا۔

سامنے والی کی ہنسی کا فوارہ نکلا۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں تھی۔ لمبی پتلی، سانولی سی... کالے سیاہ بالوں کی کس کر چوٹی بنائے ہوئے اور انھیں کندھے پر گرائے ہوئے۔

"مجھے کمرہ چاہیے۔"

"اندر آجاؤ۔" وہ ہنستی ہوئی اندر کی طرف بڑھی۔ امرحہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگی۔

بعد ازاں امرحہ کو معلوم ہوا کہ وہ لینڈ لیڈی کو شام کی چائے پلا رہی تھی۔ پھر ان کا منہ دھلایا، کپڑے تبدیل کروائے۔ بیل دینے والا، دروازہ پیٹنے والا جائے بھاڑ میں، ہم کیا کریں۔ لینڈ لیڈی نشست گاہ میں

سنڈے آتش دان کے پاس بیٹھی بال جیرل کا انگلش ترجمہ پڑھ رہی تھیں۔ اس کی سانس اٹکنے لگی۔ یعنی شاعری بھی سنانی پڑے گی۔ وہ بھی ایسی اعلا پائے کی۔ یعنی یہاں بھی اس کا کام بننے والا نہیں تھا۔ بہت دیر اس کا انٹرویو ہوتا رہا۔ وہ بہت صبر سے اور اپنی طرف سے بہت چالاکی سے سارے سوالات کے جوابات دیتی رہی۔

"کھانا پکا لیتی ہو؟ کیا کیا پکا لیتی ہو؟"

"چاول... روٹی... اور تنور ہو تو نان بھی لگا لیتی ہوں۔" اس نے اس چیز کا نام لیا جو برطانیہ میں میسر ہو ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ "تنور"

"بیسن کی روٹی... آلو، گوبھی... قیمے کے پراٹھے... روٹی کے بھی... نان پر بیسن لگا کر اسے تل لیتی ہوں... بہت مزے کا بنتا ہے... آلو کے پکوڑے... چکن پنک چکن کے اچھلی کے بھی بنا لیتی ہوں۔"

لینڈ لیڈی اپنے بچوں کے سے چھوٹے چھوٹے ہاتھ ٹھوڑی تلے رکھے اسے دیکھتی رہیں۔

"بہو چکا تمہارا! اب بتاؤ کھانا پکا سکتی ہو؟"

اس کا منہ لٹک گیا۔ اس کی چالاکی کسی کام نہ آئی۔ دادی ٹھیک کہا کرتی تھیں کہ انسان کو زندگی میں سب کام آنے چاہئیں۔ "علم زندگی کا" نہ جانے اور کون سا سیکھا کام... کام آ جائے۔

"گوشت کا سالن... اور چاول... اب... روٹی بھی۔"

"سارا حسنا! یہ پراٹھوں کی اتنی دیوانی کیوں ہے؟"

"جی ہفتے میں دو بار یہ ہو جائے گا... باقی گوشت کا سالن اور چاول۔" میڈم سارا حسنا اسی کے ساتھ صوفے پر ذرا کنارے پر بیٹھی تھیں اور سو شربت پی رہی تھیں۔

"سودا سلف بھی لانا ہو گا۔"

"جی۔ میں لے آؤں گی سنڈے کے سنڈے۔"

"سنڈے ونڈے ہم نہیں جانتے۔ جب جب سارا حسنا کہے گی لانا ہو گا" تازہ سبزی آتی ہے روز... حلال گوشت آتا ہے... بولو ہاں یا نا؟"

"ہاں جی... ہاں۔"

"ہنہ... اچھا اب بولو کہانی آتی ہے کوئی؟"

"جی آتی ہے... دو..."

"ہنہ... کون کون سی؟ سناؤ ذرا۔"

"ایک کوا تھا بہت پیاسا تھا... ادھر اڑا... ادھر اڑا..."

"دوسری...؟"

"دوسری... خرگوش اور کچھوے والی۔" سارا حسنا تیزی سے سلائیاں چلانے لگی تاکہ اس کی ہنسی کم سے کم اس کے منہ سے نکلے۔ لینڈ لیڈی البتہ ہونٹ بھینچے بیٹھی رہیں۔

"کیا تم یہاں رہنا چاہتی ہو یا نہیں؟"

"رہنا..."

"جی... بتاؤ... پھر..."

"میں اچھی کتابیں لے لوں گی... آپ کو پڑھ..."

"پھر سنا دوں گی..."

"ہاں..."

"اگر آپ بتا دیں پلیز..."

"پہلے شرائط سن لو... تم سے پہلے تین لڑکیاں ہو کر جا چکی ہیں... تم چوتھی آئی ہو... سارا حسنا یہاں دو سال سے رہ رہی ہے۔"

اس نے مسکرا کر سارا حسنا نامی "لڑکی" کو دیکھا۔

"ہائے میری بھی اتنی عمر لگتی ہے کیا؟"

"سارا حسنا سے پہلے یہاں چھ لڑکے رہ کر گئے ہیں۔ اچھے لڑکے تھے سارا کام کر دیتے تھے۔ میں تو لڑکوں کے حق میں ہی تھی۔ پر اب سارا حسنا کی وجہ سے لڑکیاں ہی رکھتی ہوں۔ سارے گھر کی صفائی کرنی ہو گی اور صبح ہی کر کے جانا ہو گی۔ باقی کے کمرے بند ہیں... اور جتنا بھی گھر استعمال ہو رہا ہے... وہ تمہیں صاف کرنا ہو گا۔ کھانا بنانا ہو گا۔ ہفتے میں لان پودوں کی کانٹ چھانٹ... اور کھڑکیوں کی صفائی... ایک ہفتے تم میرے کپڑے لانڈری کرو گی اور استری بھی... ایک ہفتے سارا حسنا کرے گی... جتنی زیادہ لڑکیاں یہاں رہنے کے لیے آ جائیں گی... اتنا ہی کام کم ہو جائے گا میرے گھر کا جو ٹھل کا حصہ ہے اسے دھوپ کے

دنوں میں تمہیں دھوپ لگوائی ہوگی۔ پاکستان میں اپنے گھر کا نمبر تمہیں مجھے دینا ہوگا۔ کیونکہ اگر میں نے تمہیں ٹریک سے اترتے ہوئے دیکھا۔ یعنی اگر تم میں کوئی غلط حرکت دیکھی تو فوراً "میں تمہارے گھر والوں کو بتاؤں گی' تم ایک مسلمان لڑکی ہو' اس لیے میں تمہارے پاس کوئی ایسی ویسی چیز نہ دیکھوں' ورنہ میں تمہیں فوراً" یہاں سے نکال دوں گی اسی وقت۔

چاہے باہر برف باری ہو رہی ہو اور تم نمونیے کا شکار ہو۔ تمہارے ہر طرح کے دوست یہاں آسکتے ہیں' لیکن اگر میں نے ان دوستوں میں خرابی دیکھی تو بھی تمہیں یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ بے شک تمہیں پورے انگلینڈ میں کہیں جگہ نہ ملے۔ اگر میں سوتی ہوں تو چٹکی کی آواز سے بھی اٹھ جاتی ہوں۔ اس لیے جب میں سوؤں تو تم ایسے ہو جانا جیسے گونگی ہو۔"

لینڈ لیڈی بولتی رہیں۔ بولتی رہیں۔ وہ جس صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی پر لوٹنے لگی۔ کوئی تین گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی صوفے پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کی نظر چھت پر لگے بڑے سے فانوس پر گئی جو روشن تھا۔ لیکن اس کی نیند سے بھری آنکھیں اس فانوس میں سے مختلف رنگ نکلتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ رنگ اڑ رہے تھے۔

"کیا مجھے کسی ڈان نے اغوا کر لیا ہے۔" چھت اور قد آدم کھڑکی کے قد آدم پردوں کو گھورتے اس نے سوچا۔

"میں یہاں ہوں۔ کہاں ہوں۔ میں۔؟" وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھی۔ سادھنا لینڈ لیڈی کی راکنگ چیئر کے پاس صوفے پر بیٹھی کہانی سنا رہی تھی۔ اسے لگا وہ صرف پانچ منٹ ہی سوئی ہے۔

"اور کیا کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" وہ آنکھیں ملنے لگی۔

"تم ایسے ہی ہر جگہ لم لیٹ ہو جاتی ہو لڑکی؟" لینڈ لیڈی انفس کر بولیں۔ امرحہ لفظ لم لیٹ پر حیران ہوئی۔ خالص دیسی لفظ تھا۔ یقیناً کوئی پاکستانی سکھا کر گیا تھا انھیں۔

"جی۔ بس۔ آج تھکی ہوئی تھی تو۔"

"جاؤ کھانا کھاؤ۔ کچن میں رکھا ہے۔"

"کھانا؟" جیسے صدیوں بعد یہ لفظ سنا تھا۔ وہ جلدی سے کچن میں گئی اور سارے ویجی ٹیبل رائس اور چکن سوپ ہڑپ کر گئی۔ کلفی مانی اور مگ لے کر آ گئی۔ لینڈ لیڈی اسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔

"کلفی کس سے پوچھ کر بنائی تم نے؟"

"وہ۔ پھر غلطی کر دی اس نے۔" وہ خاموش کھڑی دونوں' تو تین کو دیکھتی رہی اور منہ لٹکا لیا۔ شکل پر بے چارگی لے آئی۔

"ٹھیک کر دی ہو۔" لینڈ لیڈی کے اعصاب کچھ ڈھیلے ہوئے۔ وہ دوبارہ کہنے لگی۔

"برا نہ ماننا' تم ایشیا والے بہت تنگ کرتے ہو۔ ایک لمبا وقت تو تمہیں بنیادی اخلاقیات سکھانے میں لگ جاتا ہے اور تم لوگ کھاتے بھی بہت ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں پر تھوڑا اپنی عادات پر قابو پاؤ' انہیں درست کرو۔" امرحہ خاموشی سے کلفی چکھتی رہی۔

"تم جا کر سو جاؤ سادھنا۔ اور تم امرحہ! مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔" وہ انہیں کمرے تک لے گئی۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھیں۔ دائیں ٹانگ فالج زدہ تھی۔ دایاں ہاتھ بھی بہت مشکل سے حرکت کرتا تھا۔ لیکن ٹانگ کی طرح مفلوج نہیں تھا۔ انہیں ان کے بیڈ پر لٹایا۔ "میرے بال بھی اتار دو۔"

"بال۔" امرحہ کو لگا ان کے دماغ کے ساتھ بھی کچھ مسئلہ ہے۔

"بال بھی' تو تو۔؟"

وہ قریب ہوئی اور بالوں پر ہاتھ رکھ کر کھینچا اور وگ اس کے ہاتھ میں آگئی اور اندر سے بمشکل آدھ انچ لمبے بال نکلے۔

پھر وہ سوچ بورڈ کی طرف آئی اگر اس نے ٹھیک سے گنے تھے تو وہاں کم سے کم پچیس سے زیادہ بٹن تھے۔ نائٹ بلب کا شیڈ پسند کرنے میں انہوں نے کافی وقت لیا۔ پھر ٹی سرخی کو انہوں نے اوکے کیا رات

کے لیے پسند کیا اور اسے جانے کے لیے کہا۔

"تم ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ، صبح اپنا سامان لے آنا۔" خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی۔ کیونکہ تین وقت کے کھانے کے ساتھ یہ جگہ اسے بہت ہی سستی پڑ رہی تھی۔

"اور ہاں... وہ پھر کچن میں نہ جانا۔" لیکن وہ پہلے کچن میں گئی۔ ایک کپ اور کافی بنائی اور ایک کپ کافی کی قیمت کچن کاؤنٹر پر رکھ دی اور کمرے میں آکر سو گئی۔ درمیان میں اس کی آنکھ کھلی تو اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس نے فوراً "سری" کو فون کیا۔

"میں پولیس کو کال کرنے ہی جا رہی تھی۔ تم نے ہمیں پریشان کر دیا۔" وہ ابھی اتنی ذمہ دار نہیں ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن سامان لا کر اسے کمرے میں سیٹ کیا۔ پھر اس دن سنی ڈے تھا، تو کارپٹ کو اٹھا کر دھوپ میں ڈالا... کپڑے دھوئے، استری کیے، پھر انہیں لیڈی مہر کی وارڈ روب میں لٹکایا۔ سادھنا کے ساتھ مل کر کھانا بنایا اور پھر کیفے آگئی... واپسی پر بک اسٹور ہوتی گئی۔ لیکن وہاں اردو کی کتابیں بہت کم تھیں۔ جو تھیں، بہت پرانی تھیں۔ زیادہ تر شاعری کی۔ بہت بڑا ناول "خدا کی بستی" اداس نسلیں، بہت بڑا ناول، آگ کا دریا وغیرہ وغیرہ۔ ایک تو وہ فی الحال اس طرح کی مہنگی کتابیں خرید نہیں سکتی تھی۔ دوسرے اس عمر میں اپنے سر کے بال جھڑوانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سب کتابیں پڑھ چکی تھی۔ لیکن ری ریڈ کر نہیں سکتی تھی۔ یہ ایک صبر آزما کام تھا اور اتنا زیادہ صبر وہ اتنی سی عمر میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ایک سادہ سی... سستی سی کتاب چاہیے تھی۔ اس نے اپنی پاکستانی ہم جماعت سے بات کی تو اس نے اسے اپنی خالہ کی ایک کتاب لا دی... کھیل تماشا... اشفاق احمد کی۔ خیر ایک تو مفت میں کتاب مل گئی تھی۔ دوسرا زیادہ مہنگی نہیں تھی۔

اپنی باری پر اس نے لیڈی مہر کو کھیل تماشا سنانا شروع کیا، وہ تو مزے سے سنتی رہیں۔ لیکن امرحہ کے دماغ کے نہیں اوپر سے الفاظ گزر گزر کر جاتے رہے۔ وہ بلاشبہ اپنی طرز کی شاہکار کتاب تھی۔ لیکن امرحہ جیسے کند ذہن اسے سب کار بے کار رہے تھے۔ لیڈی مہر اسے بار بار پیچھے لے جاتیں۔ کئی کئی سطروں کو بار بار پڑھواتیں... اتفاق سے اس نے ایک بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔ "کھیل تماشا" نے سننے والے اور سنانے والے دونوں کا دل موہ لیا تھا۔ تنت نور کے ماسٹر جی اور ان پر مرمٹنے والی رجنی نے نشست گاہ میں جادو سا جگا دیا ہوتا جیسے... ایسے لگنے لگتا جیسے ماسٹر جی ابھی کارپٹ پر آ کر اور ان کے سامنے بیٹھے ہی بجا رہے ہوں... اور رجنی بھی ان کے ساتھ ادا ہی بیٹھی ہے۔

لیڈی مہر بہت خوش ہو گئیں۔ "ہمت کمال کی... شاباش۔"

سادھنا بالکل ہم بنگالی اور بھوج پوری لوک کہانیاں سناتی تھی، جو اس نے اپنے بنگالی باپ اور بھوج پوری ماں سے سنی تھیں اور حیرت انگیز طور پر وہ کہانیاں آتی تھیں کہ امرحہ کو لگتا سادھنا نے اپنی زندگی کے اتنے سال صرف کہانی سنتے ہی گزارے ہیں... جب وہ رات کو کہانی شروع کرتی تو اس کی آواز میں سارے بنگال کا گھر سمٹ آتا... وہ گنگا جمنا کی طرح رواں دواں ہو جاتی... بلوری کہانی... شفاف ہو جاتی... اکثر اس کی کہانیاں پرسوز ہوتیں... لیکن وہ انہیں اتنی نرمی اور چاہت سے سناتی کہ لگتا ہی نا کہ ان کہانیوں میں سوز ہے۔

سادھنا بمشکل بتیس سال کی تھی اور اس کے آٹھ سالہ بیٹے کو ہڈیوں کا کینسر تھا۔ سادھنا کی کہانی محبت سے شروع ہو کر امرحہ بیٹ پر ختم ہوتی... وہ پرسوز کہانی سناتے ہوئے بالکل آبدیدہ نہ ہوتی، بلکہ ایسے لگتا کہ اس کا آٹھ سالہ بیٹا اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے۔

"جو دکھ پر رو دیتا ہے... وہ تو پھر کوئی انسان ہوا لیکن جو کم ہمتی پر رو تا ہے... وہ بھی کوئی انسان ہوا... ؟ وہ بھی

کوئی انسان بھلا۔"

تو سادھنا کیونکر روتی، جب اس کا بیٹا ہی جواں حوصلہ ہے۔ ساری تکلیف سہ کر بھی اسے فون کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"میں جب تک زندہ رہوں گا۔ کبھی رو کر نہیں سوؤں گا۔ کبھی رو کر آنکھ نہیں کھولوں گا۔ ڈاکٹروں کے سارے اوزار اور ان کی دوائیں۔ اور میرے جسم کی ساری تکلیف بھی مل کر مجھے ہرا نہیں سکے گی۔ میں نہیں روؤں گا ماں۔ کبھی نہیں۔"

تو ایسے بچے کی ماں کیسے روتی۔ وہ بات بات پر مسکراتی۔ ہنستی۔ اس کی کہانیاں کیوں نہ "امر جیت" ہوتیں۔ اس کی آواز میں ایسا سحر کیوں نہ آتا جو تھپک تھپک کر سلا دیتا ہے۔ دل پر کیسا ہی بوجھ کیوں نہ ہو۔ اس کی کہانی پرستان لے کر جاتی ہے۔ سادھنا کی کہانی سنتے سنتے وہ نشست گاہ میں ہی سو جاتی جیسے کوئی وہ لوری سناتا ہو جو جنگ سے لوٹ آنے والا اپنے بچوں کو اور جنگ جیت جانے والا جیسے کہتا ہے۔ وہی جوان مردی کے قصے اور شہسواروں کے رنگ فسانے۔

☼ ☼ ☼

اس دوران ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جو کافی بڑی صورت اختیار کر گیا۔ سر اور اس کے چند کلاس فیلوز کو یونیورسٹی کے ایک دوسرے گروپ نے انوائیٹ کیا۔ وہ ماسٹرز میں اپنی نئی کلاسز کے شروع ہونے کے سلسلے میں ایک پارٹی کا اہتمام کر رہے تھے۔ وہ پارٹی کے انتظامات کے لیے انہوں نے یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو ہی موقع دیا تھا۔ تاکہ وہ چند گھنٹوں میں کچھ ڈالرز پونڈز کما سکیں۔ اس کے کلاس فیلوز نے ہاں کہا تھا اس نے بھی ہاں کہہ دیا۔ انہیں پارٹی کے سارے انتظامات دیکھنے تھے۔ ڈیکوریشن سے لے کر سرونگ تک۔ پارٹی ان میں سے کسی ایک اسٹوڈنٹ کے گھر کے لان میں تھی اور جہاں یہ گھر تھا۔ وہاں باقی گھر کافی دور دور تھے۔ جن کے آگے سڑکیں کھلی اور کشادہ تھیں۔

سر شام ہی ان سب نے پارٹی کے لیے ابتدائی سیٹنگ مکمل کر لی۔ باقی ان کا کام میزوں پر کھانے کی اشیا رکھنا تھا جو ذرا بعد کراکنگ سے لگی تھیں۔ انہیں ہر فرد کو الگ الگ نہیں پیش کرنا تھا۔

"تم شکل سے بہت زیادہ پاکستانی لگتی ہو۔" ایرک اور اس کے دوسرے دوست اسے تشویش سے ایسے دیکھنے لگے کہ اسے تشویش ہونے لگی۔ وہ سب پارٹی کے انتظامات دیکھنے آئے تھے۔

"میں ہوں بھی پاکستانی۔" وہ بر امان گئی۔

"نہیں۔ ہمارا مطلب ہے۔ وہ سب ذرا ڈرتے ہیں۔ وہ ذرا سے کچھ زیادہ ہی ڈرتے ہیں۔"

"ڈرتے ہیں۔ کون۔؟"

"آج کی پارٹی میں آنے والے زیادہ تر ڈونرز ہیں۔" وہ کافی زیادہ گول مول سی باتیں کر رہا تھا۔

"انہیں پاکستان فوبیا ہے کیا؟"

"نہیں۔ شاید ہاں۔ یہ اخبارات۔ ٹی وی۔ میڈیا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ پرانے ہو بیلیف۔ وہ کمزور عقیدے کے لوگ ہیں۔ جو کچھ اخبارات میں کہا جاتا ہے۔ اس پر یقین کر لیتے ہیں اور تم تو بھی مسلم ہے۔ پلیز ایسے برا نہ مانو۔ دھماکوں سے بہت ڈر لگتا ہے انہیں۔"

"دھماکوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں مسلم ہوں۔ آخر کیا مطلب ہے ان سب باتوں کا۔ مجھے بھی دھماکوں سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن میں تو تمہیں نہیں بتا رہی۔" وہ ایک دم بھڑک گئی۔

"دیکھو تم برا مان گئیں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ یہاں کون سا دھماکا ہونے جا رہا ہے۔ مطلب کچھ ہو گا ہی نہیں تو ڈرنا کیسا۔؟"

"کچھ ہونے کا خطرہ ہے یہاں۔ کوئی بلاسٹ؟ تم مجھے ڈرا رہے ہو؟"

"میں تمہیں صرف بتا رہا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر کے انکل اور فادرز پولیس میں ہیں۔ بس ایسے ہی بتا

رہا ہوں۔ لیے پریشان نہ ہو۔"

امرحہ کا سر چکرانے لگا۔ "کیا کہہ رہے ہو۔ کیا سمجھانا چاہ رہے ہو مجھے؟"

"ایسے ہی تم سے باتیں شیئر کر رہے ہیں۔"

"ایسے باتیں شیئر کرتے ہیں۔ تم سب مجھے شک سے گھور رہے ہو۔ تمہیں لگتا ہے میں یہاں دھماکا کروں گی۔ میں۔ کیا مذاق ہے یہ۔؟"

"ایسی تو کوئی بات ہم نے نہیں کی۔ تم کیا سے کیا سوچ رہی ہو؟"

"ہاں 'سیدھے سیدھے یہ بات نہیں کی' پر جو کی ہیں ان کا مطلب خوف ناک ہے۔"

"ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تمہارا تو ابھی سے رنگ اڑ گیا ہے۔"

"ابھی سے مطلب۔" اس کا رنگ واقعی میں اڑ اڑ گیا۔

وہ گڑبڑا گئے۔ "مطلب ہم تو صرف باتیں کر رہے ہیں۔"

"ایسی خطرناک باتیں ہی کرتے ہو تم سب۔ مجھے تمہاری باتیں پسند نہیں آئیں۔"

وہ اپنے کام میں لگ گئی اور اندر ہی اندر سہم بھی گئی۔ یعنی اگر ذرا سی بھی کوئی گڑبڑ ہو گئی تو یہ لوگ اس پر صاف صاف الزام لگا دیں گے۔ پولیس اور وہ سب۔

لان میں ایک طرف ڈوجیلوز پر ڈی۔ جے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جیسے کلب میں ہوتا ہے۔ اندھیرا گہرا ہوا تو ٹوئنسٹ لائٹس نے اور Twist بڑھا دیا۔ انہوں نے ڈی جے ساؤنڈ چیک کیا جو خطرناک حد تک تیز تھا۔ نیلی پیلی ہری گلابی ٹوئنسٹ لائٹس حرکت کرنے لگیں۔ سب آنے لگے۔ انہوں نے میزوں پر پہلے سے ہی سوفٹ ڈرنکس رکھ دی تھیں۔ وہ گھنٹے بعد انہیں کھانے کی چیزیں رکھنی تھیں۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دوسرا بھی گزر گیا۔ ان سب نے مل کر میزوں پر کھانے کی اشیا رکھ دیں۔ ڈی جے نسبتاً ہلکی آواز میں میوزک کے ساتھ تجلیات کر رہا تھا۔ جو امرحہ کو کافی پسند آ رہے تھے۔ وہ انجوائے کرنے لگی ...

ڈرے رکھتے جا رہی تھی کہ امرک نے اسے آواز دی۔ وہ اس کے قریب جا رہی تھی کہ ایک زوردار دہشت ناک دھماکا ہوا۔ اتنا زوردار کہ کانوں کے پردے پھٹنے کے قریب ہو گئے۔ امرحہ بری طرح سے لڑھک کر گری۔ اسی دھماکے کے ساتھ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں اور چند انسانی چیخوں کی آوازیں بھی آئیں۔ پورے ایک منٹ تک سناٹا رہا۔ امرحہ زندگی میں کبھی اتنی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی۔ جتنی اس دھماکے سے ہو گئی تھی۔ وہ بمشکل اٹھی اور آس پاس نظر دوڑانے کی کوشش۔ دوسرے لوگ بھی پڑو اٹھ چکے تھے۔ کچھ اٹھ رہے تھے۔ یہ ایک خوف ناک منظر تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہاں دھماکا ہوا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ سب اسے گھور رہے تھے۔ اس نے جینز پر لمبی قمیص پہن رکھی تھی اور امرک نے ہی کہا تھا کہ سر ڈھانپ کر کام کرنا ہے۔ تو اس نے اسکارف کو سر پر اچھی طرح سے اوڑھ لیا تھا۔

امرحہ کو پہلے یہ صرف اپنا وہم لگا کہ وہ سب ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے ہیں۔ پھر اس نے ذرا گردن گھمائی تو ... وہم لگنے والا خیال سو فیصدی خوف میں بدل گیا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ گھور رہے تھے۔

ان میں سے ایک نے کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ... یہ ... اس نے کیا ہے ...)

اس اتنی سی بات سے جیسے کسی نے اس کے سر پر دوسرا دھماکا کیا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے ذہن میں نائن الیون، لندن ٹرین دھماکے، اخبارات، ٹی وی چینلز کی سب ہی خبریں۔ ذاکو منٹریز۔ گڈ مڈ ہو کر چکرانے لگیں۔ دہشت گرد ... ٹیرزٹ ... دہشت گرد ... یہ ... یہ ... اس کا سر چکرانے لگا۔ وحشت اس کے چہرے پر نظر آنے لگی۔

"نہیں ... مجھے نہیں معلوم۔" وہ اٹک اٹک کر ہونٹ ہلانے لگی۔ آواز اس کے ہونٹوں سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری زندگی

بول ہی نہیں سکے گی اور ٹھیک اسی دوران ایک اور دھماکا ہوا۔ ویسا ہی زوردار۔ ان سب نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ وہاں موجود بہت ساری چیزیں گریں۔ شیشے کے چھوٹے ٹکڑوں کی ایک بوچھاڑ آندھی کی طرح آئی۔ پیچھے کھڑے بہت سے لڑکے لڑکیاں گر گئے اور کراہنے لگے۔ اس طرف کافی اندھیرا تھا۔ لیکن ان کی چیخیں اور کراہیں سنی جاسکتی تھیں۔ اس بار امرحہ گری نہیں کھڑی کی رہی اور کافی دہشت ناک انداز لیے کھڑی رہی۔ ایک دم سے فضا میں پولیس سائرن اور فائر بریگیڈ سائرن کی آوازیں گونجیں۔ پیچھے کہیں سے زوردار آگ کے بھڑک اٹھنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

"اس نے ایک بم اپنے ساتھ بھی باندھ رکھا ہے۔" کسی ایک نے چلا کر اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ سب سہم کر دور دور ہونے لگے۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب۔ یہ سب ایسے ہی ہورہا ہے جیسے اسے نظر آرہا ہے۔ پولیس سائرن کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ اس نے سوچا کہ مانچسٹر میں ایک اسٹوڈنٹ پارٹی میں دھماکے ہوگئے۔ اور اس جگہ امرحہ موجود کھڑی تھی۔ کھڑے اس نے کل کے اخبارات میں اپنی تصویر دیکھ لی۔ ٹی وی کی رپورٹ ملاحظہ کرلیا۔ عدالت میں خود پر کیس چلتے دیکھ لیا۔ اس کے حق میں چند ہزار مسلم ریلی نکال رہے ہیں اور عدالت اپنا فیصلہ سنا رہی ہے۔ اس کے گھر والے اسے لعنت ملامت کررہے ہیں۔ اور معصوم ہوتے ہوئے بھی اسے یورپین میڈیا دہشت گرد ثابت کررہا ہے۔ اس کی پڑھائی کا کیا ہوگا۔ اس کا کیا ہوگا۔ وہ تو مرجائے گی اور ٹھیک اسی دوران ایک اور دھماکا ہوا اور وہ حلق کے بل چلانے لگی۔ پاگلوں کی طرح۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا۔" ایک سیکنڈ میں وہ یہ بات تین بار کہہ گئی، ساتھ چلاتی رہی۔ چار پانچ سو اسٹوڈنٹس کا گروپ ادھر ادھر پھیلا اسے دیکھ رہا۔

"سن رہے ہو تم۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ پوری قوت سے چلائی۔ اپنی ساری ہمت جمع کرکے۔ پورا زور لگا کر۔ وہ سب ویسے ہی کھڑے رہے۔ جیسے کوئی اسٹیج شو کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں۔

"تمہارا میڈیا۔ تمہارے ٹی وی چینلز۔ اخبارات۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ پاگل ہو تم سب پاگل بناتے ہو۔ دنیا کو۔ ہم دہشت گرد ہیں یا تم۔ ہم نہیں تم ہو۔ تم نے دنیا میں فرسٹریشن کو بڑھایا ہے۔ تم ہو خرابی کی جڑ۔ اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں کہ تم مجھ پر الزام لگا کر مجھے اندر کروادو۔ میں تم سب کو مار ڈالوں گی۔ دہشت گرد نہیں ہوں میں۔ نہیں ہوں۔"

اور ایک دم سے وہ پنجوں پر بیٹھ کر اونچی اونچی آواز سے رونے لگی۔ اور اونچی۔ اور اونچی۔ پولیس اور فائر بریگیڈ سائرن بند ہوگئے۔ پارٹی میں اب صرف اس کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ سب جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ اب وہ ایسے کھڑے تھے جیسے ہارر مووی دیکھ رہے تھے۔

"یہ سب تمہارے ساتھ پریکٹیکل جوک (عملی مذاق) کررہے تھے۔"

آواز کچھ جانی پہچانی تھی۔ اس نے جھٹکے سے گردن اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس سے ذرا سا دور اندھیرے میں ایک کرسی پر عالیان بیٹھا کاک ٹیل سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس نے یہ بات اتنے سکون سے کی جیسے وہ خاموشی سے بیٹھا لوپیر اد یکھ رہا ہو۔

"پریکٹیکل جوک۔" وہ کئی لطیفے سنانے میں ہی رہی پھر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس حد تک کوئی عملی مذاق بھی کیا جاسکتا ہے۔

"تیسرے دھماکے کے بعد انہوں نے تمہیں خود ہی بتادینا تھا۔ یہ سب سینئرز ہیں اور جونیئرز کے۔"

"شٹ اپ۔" اس نے دھاڑ کر انگلی اٹھا کر عالیان سے کہا۔ پھر وہی انگلی لہرا کر اس نے وہی شٹ اپ پوری قوت سے چلا کر ان سب سے کہا۔

"تم لوگ۔ انگریز۔ گورے۔ دنیا پر گرفت

کرنے والے۔ جو جی میں آئے کرنے والے۔ ہمیں غلام سمجھ رکھا ہے۔ جب جی میں آیا مذاق بنالیا ہمارا۔ جب جی میں آیا غلام بنالیا۔ کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں۔ پہلے ہمارے ملک میں آئے۔ ہم پر راج کیا۔ ہماری تذلیل کرتے رہے اور اب ہمیں دہشت گرد بنا رہے ہو۔ ہم سے حسد کرتے ہو کہ ہم زندگی میں آگے نہ نکل جائیں۔ تم سب سے آگے نہ نکل جائیں۔"

گالی اور تسلی کے لیے ہر انسان اپنی مادری زبان استعمال کرتا ہے کہ مصداق وہ دونوں سے چیخ چلا کر اردو میں ان پر برس رہی تھی۔ عالیان ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کرتا جا رہا تھا۔

"تم انگریز۔ گورے۔ ہمارے ملک میں آئے۔ ہم نے تمہاری میزبانی کی۔ تمہیں بادشاہ بنایا۔ جاتے ہوئے تمہیں کوہ نور تحفے میں دیا۔" عالیان اپنی مرضی کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اسے اور بھڑکا۔ یا تھا۔ امرحہ کے پاس عالیان سے نمٹنے کا وقت نہیں تھا۔

"تم لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو؟ کیا سمجھتے ہو تم خود کو؟ ہاں! بہت بڑی توپ قوم ہو تم؟ تم نیک۔ تعلیم یافتہ۔ پڑھے لکھے۔ اور ہم جاہل۔ گنوار۔ وحشت گرد۔ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ ہیں۔ تم اور تمہاری گندی سیاست نے قتل کرا۔ دہشت گرد بنا دیا ہے۔ ایک نومولود بچہ بھی دہشت گرد ہے۔ اگر وہ مسلمان ہے تو۔"

امرحہ کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کے اس جلال کے عالم میں کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ بول سکے۔ یا اس کے قریب آسکے۔ عالیان خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی ترجمہ نہ کیا۔

"ٹرانسلیشن پلیز۔" کسی کونے سے آواز آئی۔

"ہوک کرنے کے لیے تمہیں یہی ہوک ملا تھا؟ خود تم نے کون سا سوچے میں کیا کیا؟"

"وہ امریکی تھے" عالیان بولا۔

"وہ ظالم تھے۔ اور ظالم کسی قوم سے نہیں ہوتا اور یہ سب بھی ظالم ہیں۔" اس نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

آنسوؤں کا دریا اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔

"ٹرانسلیشن پلیز۔" آواز پھر آئی۔ امرحہ نے ایک قہر آلود نظر سب پر ڈالی اور اس بار انگلش میں بولی۔

"اس مذاق سے اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ اگر میں مر جاتی۔ اتنا گھٹیا مذاق۔ تم لوگ اتنے ظالم ہو کہ مذاق بھی ایسا ظالمانہ سوچا۔ تف ہے تم پر۔ کتنے چھوٹے ہو تم سب۔ اتنی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتے اور یہ سب سیکھتے ہو۔ گندے ہو تم۔ جاہل۔ تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ مر جاؤ سب کے سب تم۔ اتنے چھوڑو تم نے دھماکوں پر لگا دیے اگر وہی پونڈز تم۔"

"کوئی پونڈ نہیں لگے۔ وہ تو ایسے ہوئے ہیں۔" ڈی جے نے ایک بٹن دبایا اور ایک اور دھماکا ہوا یعنی وہ مذاق ہی ہو رہا تھا۔ اللہ انہیں نظر بد سے بچائے کس قدر جاہلانہ تھے۔

"وہ سب۔ جو شیشے کی کرچیاں اڑ کر آئی تھیں۔" "ہارڈ کرسٹل شیٹ کی تھیں۔" امرحہ نے شدید غصے میں اپنے قریب ہی گرا ہوا ایک گلاس اٹھا کر اوپر ڈی جے کی طرف اچھالا۔

"انگلیاں ٹوٹ جائیں تمہاری بہرے ہو جاؤ تم"

"ریلیکس۔ کافی ہو گیا۔ چلو اب بس کرو۔" عالیان نے نرمی سے کہا۔ اسے اور غصہ آیا۔

"بکواس بند رکھو اپنی۔" اس کی آواز ڈی جے کے کیے دھماکے سے زیادہ دھماکا انگیز تھی اس بار۔ اس نے ایک نظر پھر سب پر ڈالی بے عزتی کے احساس سے اس کا سارا وجود جلنے لگا اور جیسا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ دھاڑیں مار مار کر روتی ہی رہتی تھی۔ تو وہ سب ہی دھاڑیں اس کے اندر پھر سے جاگ اٹھیں۔ وہ گھاس پر بیٹھ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر ان سب دھاڑوں کو آواز میں لا کر رونے لگی۔ سب نے دور سے ہی اس کے گرد گھیرا سا بنالیا۔ کسی میں اب اتنی جرات نہیں تھی کہ شیرنی بنی امرحہ کے پاس آئے اور اسے چپ ہی کروائے۔ محض مذاق تھا اور کچھ زیادہ ہی

عملی ہو گیا تھا۔ اب وہ رو رہی تھی اور وہ سب شرمندہ شرمندہ اسے سن رہے تھے۔ عالیان اٹھا اور چل کر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"مذاق کچھ زیادہ ہی ہو گیا نا۔ ان کی غلطی ہے۔ انہیں معاف کر دو۔" وہ بدستور ہچکیاں لیتی رہی۔

"پلیز۔ انہیں معاف کر دو۔ پلیز۔"

اس نے ساحل ترپ تڑپ کر چھپ چھپ کر روتی رہی۔ آنکھوں کو اٹھا کر عالیان کو دیکھا۔ عالیان وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں وہ آنکھوں میں اتنی تڑپ' تکلیف' دکھ اور غصہ سمٹا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سیاہ مشرقی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان مشرقی آنکھوں میں طیش و شکوے کے ایسے بادل نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسے شکایت سے دیکھ رہی تھی کہ اردو بولنے والا نام سے مسلمان لگنے والا وہ بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔

عالیان چپ کا چپ ہی رہ گیا۔ اس کی بھوری آنکھوں نے اس سے بھرپور شکایت کی۔ اسے نہیں ان دو سیاہ آنکھوں کے اتنے قریب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب اگر وہ ایسا کر چکا تھا تو اس کا خمیازہ اسے ہی بھگتنا تھا۔ اکیلے۔

عشق مجازی کا اگر کوئی لارڈ کا نام ہوتا تو محبوب کی آنکھ کا فکس ہوتا اور اگر روتی ہوئی اندھیری آنکھوں کا کوئی لارڈ کا نام ہوتا تو وہ امرحہ ہوتا۔

عالیان کو یہ یاد کرنے میں دقت ہوئی کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دشواری اسے اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کے پانیوں میں غرق ان آنکھوں سے ہٹانے میں ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ قدم پیچھے کو چلا اور پھر سے بھاگ پڑنے جیسے انداز سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ماسٹر بالی کلارنٹ پہ بسنت بہار بجا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ سب باری باری گھر آتے رہے اور دروازے کے پاس ہی پھول رکھتے گئے۔ رات اس نے ان کا سوری قبول نہیں کیا تھا۔ ڈر کے مارے وہ اندر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی سب کا تماشا دیکھتی رہی۔ سب سے بڑا گلدستہ ڈیرک کی طرف سے تھا' یہ وہی تھا۔ جس نے امرحہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس ڈرامے کے لیے۔ بھرا ایک لمبا چارٹ ملا۔ جس پر ان سب کے دستخط تھے اور چارٹ پر ایک روتا ہوا موٹے موٹے آنسو والا سوری لکھا تھا۔ چارٹ کے ساتھ ہی وہ ویڈیو بھی بھیجی گئی تھی جو کل رات بنائی گئی تھی۔ اس نے وہ ویڈیو دیکھی اور اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ واقعی۔ وہ ایک مکمل بے وقوف لگ رہی تھی۔ ان سب کے تاثرات کمال تھے اس۔ وہ ویڈیو لیڈی مہر اور سادھنا کو بھی دکھائی۔ وہ لوٹ پوٹ ہوا ایک بار ویڈیو کو چلا کر دیکھتی رہیں۔

بعد میں اسے معلوم ہوا کہ کام کرنے کے لیے جتنے بھی لوگوں کا گروپ وہاں موجود تھا۔ ان سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ کیا جاتا تھا۔ وہاں موجود سب ہی اسٹوڈنٹس مانچسٹر یونیورسٹی میں پچھلے چار سال سے پڑھ رہے تھے اور یہ ایک روایت ہی تھی کہ وہ ہر سال کچھ نہ کچھ کرتے لیکن امرحہ کے ساتھ مذاق کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا۔

اس واقعے سے اتنا ہوا کہ وہ یونیورسٹی میں کافی مقبول ہو گئی۔ اس کے کافی سے زیادہ دوست بن گئے جو اسے دیکھ لیتا رک کر اس کا حال احوال ضرور پوچھتا۔ اسے کافی۔ لنچ کے لیے بلاتے۔ کوئی نہ کوئی اس کی مدد کے لیے تیار رہتا۔ جو اسٹوڈنٹس مانچسٹر کے ہی رہنے والے تھے وہ اسے اپنے گھر شام کی چائے یا ویک اینڈ ڈنر پر مدعو کرتے۔ اس کے رونے دھونے کا ان سب فنکاروں پر ایسا اثر ہوا کہ اسے ننھی منی بچی کی طرح ٹریٹ کرتے کہ بے بی چاکلیٹ کھاؤ۔ آئس کریم کھاؤ۔ اچھا یہ لو باربی۔ چلو رو لو۔ بس رونا نہیں۔

ایک وسیع حلقہ اسے جاننے لگا۔ جس سے چاہتی پڑھنے میں مدد لے لیتی۔ ان دنوں مشغلہ تھے ان میں ایک روسی ویرا اور ایک جاپانی این اون (Fam

En) آتی۔ جاپانی تو بہت خاموش طبع تھی۔ سال میں ایک بار بولنے والوں جیسی تھی۔ اس نے لیڈی مہر کو کمال سٹائل پر لیڈی مہر نے اسے خود ہی روک دیا کہ وہ بس چپ چاپ گھر میں رہتی رہے۔ البتہ ویرا نے اپنے شہر سوچی میں ہونے والی ہائیسویں سرمائی اولمپکس کی وہ وہ کہانیاں سنائیں کہ خود امرحہ کا بھی چاہا کہ کاش وہ کوئی ایتھلیٹ ہوتی۔ کاش فارغ اوقات میں ویرا مانچسٹر کی سڑکوں پر دکھائی دیتی۔ اس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا۔ پل کر سے بہت نیچے تک لمبے تھے یا سکائی کلنگ کرتی یا اسکیٹنگ۔ جب وہ یہ دونوں کام کرتی تو لگتا کہ کوئی پری پہاڑوں کے سڑکوں پر نیچی پرواز پر اڑ رہی ہے۔ اس کے بال جو اونچی پونی کی صورت میں بندھے ہوتے لہراتے اڑتے۔ ایک بار ویرا نے اسے اسکیٹنگ شوز پہنا دیے اور امرحہ منہ کے بل سڑک پر گری۔ ناک کی ہڈی آتی بچ گئی کہ بس سرجری کی ضرورت نہ رہی۔ باقی ساری کسر پوری ہو گئی۔ امرحہ کا بس کا کرایہ بھی بچا۔ وہ ویرا کے ساتھ ہی اس کی سائیکل پر بیٹھ کر یونیورسٹی چلی جاتی۔ لیکن ویرا کے ساتھ سائیکل پر بیٹھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا ڈولر کو شرپر بیٹھنا قبول کروانے کا کام تھا۔ کرایہ بچانے کے لیے وہ اسے قبول کر رہی تھی روز تھپڑ لگاتی۔ وہ سائیکل بھی ہزار ہزار کرتب دکھاتی۔ ویل جاتی۔ ویرا چند اخبارات کے لیے کالم لکھتی تھی۔ اس لیے اسے نوکری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے نشنل کاک ہاؤس میں چھوٹے موٹے مرمت کے کام آسانی سے کر دیے تھے۔ جس کی اسے لیڈی مہر نے اجرت بھی دی۔ اس کا سرشت میں پلاتے امرحہ نے کم ہی دیکھا تھا۔ اسے جیسے سب ہی کام کرنے آتے تھے۔

ڈیرک کی مدد سے اسے جوتوں کے ایک اسٹور میں کام مل گیا۔ اس کا کام بلنگ کرنا تھا۔ بس کافی آرام دہ کام تھا اور اس کی ہفتہ وار تنخواہ بھی اچھی تھی۔ ہفتے میں ایک بار وہ کینٹ ضرور جاتی اور اپنے سابقہ باس سے کافی کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی بات چیت کر کے آتی۔

اب تو دادی اور اماں بھی اس سے بات کرتے اب دیدہ ہو جاتی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی۔ اس نے پہلی بار دادی کو اپنے لیے آنسو صاف کرتے دیکھا۔ حماد اور علی اسے کافی تمیز سے مخاطب کرتے۔ دانیہ اسے خاندان میں ہونے والی تقریبات کی ویڈیوز بھیجتی رہتی جس میں اسے تو دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ سلومتا لیڈی مہر اور ویرا کافی شوق سے ان ویڈیوز کو دیکھتیں۔

☆ ☆ ☆

ویسے تو موسم ابر آلود رہتا ہی تھا اور ہلکی پھلکی بارش بھی ہو ہی جاتی تھی۔ لیکن اس دن ہلکی لیکن مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ویرا کو کسی اخبار کے دفتر جانا تھا۔ اس لیے وہ اکیلی ہی آکسفورڈ روڈ پر واک کرتی سست روی سے چلتی رہی۔ اسے کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ گیلی گیلی عمارتیں۔ نم نم درخت۔ سب کچھ الگ رہا تھا اور جھلے سے وہاں کے مقامی اس موسم سے عاجز آ چکے ہوں پر غیر ملکی خاص کر گرم ملکوں کے باشندوں کی جان تھی اس موسم میں۔ اس نے گہرے گلابی رنگ کے ویرا کے اسٹول کو گردن میں دو بل دے رکھے تھے۔ انہیں کھول کر اس نے سر پر اوڑھ لیا۔ پھر اس نے واپس گردن میں بل ہی دے دیے۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار سر پر پڑتی اچھی لگ رہی تھی۔ ایک دم سے پیچھے سے ایک نیلی چھتری جس پر گل لالہ کے پھول بکھرے تھے۔ اس کے سر کے اوپر تن گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر چھتری پکڑنے والے ہاتھ کو۔ وہاں عالیان کھڑا تھا۔

"تمہیں اپنا ڈوپٹہ واپس نہیں چاہیے۔ آج میں تمہیں بدلے میں کھلا سکتا ہوں اور کافی بھی۔"

"اتنی پرانی بات۔ انہیں اب نہیں چاہیے۔"

"کیوں۔ اب کیوں نہیں چاہیے؟" چھتری بدستور وہ اس کے اوپر رکھے ہوا تھا۔ خود وہ بھیگ رہا تھا۔

"تم سے نہیں چاہیے۔ تم بہت بدتمیز ہو۔"

"میں نے تم سے کب بدتمیزی کی؟"

"کب نہیں کی۔ ویسے تم مجھ سے اتنی نرمی سے کیوں بات کر رہے ہو؟"

"مجھے خود نہیں پتا چل رہا۔ میرا دماغ کھسکتا ہی جا رہا ہے۔"

"علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں تمہارے پاس؟ ایسا کرو علاج کی بھی ٹریٹ لے لو۔"

"علاج تو میں کروالوں۔ لیکن اس بیماری کا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔"

"ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ کے ساتھ تم اتنی اونگی بونگی باتیں کیسے کرسکتے ہو؟"

"اور یہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ بھی تو سب اونگا بونگا کرتی ہے۔"

"سب کیا۔؟"

"سب مطلب سب۔" وہ جھکے سے مسکرایا اور یہ کرتے وہ ایسا لگا کہ امرحہ نے سوچا۔

"کیا اس نے خدا سے الگ سے اپائنٹمنٹ لی تھی۔"

امرحہ نے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے دی۔ "کھاؤ تمہاری کیلوریز تیزی سے کم ہو رہی ہیں۔"

"تمہیں ڈراپ کردوں۔" وہ چاکلیٹ لے کر کھانے لگا۔

"تمہارے پاس گاڑی ہے۔"

"نہ سائیکل۔"

"میں ویرا کے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں بیٹھتی۔"

"میں کرواؤں گا نہیں۔"

"پر میں تمہیں ضرور کرلوں گی۔ بہ الگ بات جو میرا سر کھاؤ۔"

"یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔"

"خاص تمہارے لیے۔"

"میرے لیے کچھ خاص ہے۔ تو۔ ٹھیک ہے۔ تم نے سینما دیکھے ہیں یہاں کے؟" اس کے بھورے سر پر بارش کے قطرے تتلی بیٹی کھیل رہے تھے۔

"ہاں ویرا کے ساتھ گئی تھی۔"

"اس نے یقیناً تمہیں ہنگر گیمز دکھائی ہوگی۔ اس کا ماننا ہے کہ وہ جینفر سے مشابہ ہے۔"

"لیکن وہ جینفر سے زیادہ خوب صورت ہے۔"

"میں تمہاری کلاس فیلو جینفر کی بات نہیں کررہا۔ ویسے میں تمہیں ایک اچھی انڈین مووی دکھا سکتا ہوں۔"

"میں انڈین موویز نہیں دیکھتی۔"

"پاکستانی۔؟"

"وہ تین تو جاری ہیں۔ میں پاکستان سے دیکھ کر آئی ہوں۔"

"بنگالی۔؟"

"مجھے بنگالی نہیں آتی۔"

"ایرانی۔ افغانی تاجکستانی ترکمانی عراقی مصری اور یہاں انگلش میڈیا کیا تم نے کبھی سینما میں Animated فلم دیکھی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا تم نے Ratatouille 2 دیکھی ہے؟ دیکھو اگر تم نے اتنی عظیم فلم نہیں دیکھی تو میں تمہیں پہلے اس کی کہانی سنا سکتا ہوں۔ یقیناً خود تمہارا دل چاہے گا کہ تم فلم دیکھو۔ یہ ایک ننھے فرنچ چوہے اور اس کے محسن کی کہانی ہے۔ چوہا جس کے ہاتھ میں کمال کا ذائقہ ہوتا ہے اور وہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے شیف سے زیادہ اچھا اور لذیذ کھانا بنا سکتا ہے۔ ایسا کھانا جس کی کھانے والے کو نظیر نہیں ملتی اور ایسی ترکیب اور سلیقے سے۔"

"چوہا شیف ہوتا ہے؟ مطلب جو کھانا بناتا ہے؟"

"ہاں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ کھانا بنانے سے پہلے ہاتھ دھوتا ہے۔ اس کے ہاتھ صاف ہوتے ہیں۔ بالکل تمہاری طرح۔"

"چوہا اور کھانا۔ آخ تھو۔ تھو۔" امرحہ نے سر کو زور زور سے جھٹکا۔ "آخ تھو۔ چوہا۔ اور میرے ہاتھوں جیسے صاف ہاتھ۔" عالیان نے چھاتے کو بند کیا۔ اس کا ہاتھ تھک چکا تھا اور چلتے چلتے وہ رک گیا اور اسے بھی روک لیا۔ اب بارش کے قطرے دونوں کے بالوں میں الگ چھپ جا رہے تھے۔

"پھر کرنا۔"

"کیا۔۔۔؟"

"یہ جو ابھی کیا تھا۔"

"کیا کیا تھا؟"

"وہی جو چوہے کے نام پر کیا تھا۔"

"آخ۔۔۔ خ۔۔۔" امرحہ کو پھر سے چوہے کا خیال آگیا۔

"ایک بار پھر کرنا۔۔۔ بس۔۔۔ بس۔۔۔ پلیز۔"

"تم پاگل ہو' کیا کہہ رہے ہو۔"

"جب تم یہ آخ کرتی ہو تو تمہاری بھنویں اور آنکھیں بچگانہ سا رقص کرتی ہیں۔۔۔ اور تمہاری ناک۔۔۔ یہ دائیں بائیں لہرا کر اکساتی ہے کہ اسے پکڑ کر اس پر چٹکی بھری جائے۔"

"تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔" امرحہ کو لگا وہ اس کی ناک کی چٹکی بھرنے لگا۔

"اچھا تمہارا وقت بھی اب قیمتی ہو گیا ہے؟ اچھا چلو پھر فلم کے لیے پکا؟"

"اگر ویرا جانے کے لیے تیار ہو گئی۔"

"ویرا؟"

"ہاں۔۔۔ دادا نے کہا ہے' ہو سکے تو ساتھ لے کر جاؤں۔"

"دادا جی کو یہاں ساتھ لے آتیں وہ پھر بھی اچھا تھا۔"

"تم میرے دادا کا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"چلو ویرا کو بھی لے آنا۔"

☼ ☼ ☼

اور وہ ویرا کو بھی لے گئی۔ ویرا تو جاتے ہی سو گئی۔۔۔ کیونکہ اسے خالص ایکشن فلمیں پسند تھیں' جن میں ہر دو منٹ بعد ایک بم بلاسٹ ہو اور کم سے کم دو تو کئی مر جائیں۔۔۔ اور ہیرو بس بڑی بڑی کاروں میں بھاگتا رہے۔۔۔ اور کسی زمین پر کھڑا ہو ہی جائے تو چاروں اطراف فائر کھول دے۔

جب چوہے نے پہلی بار کھانا پکانا شروع کیا تو اس نے منہ ہی منہ میں کتنی ہی بار۔۔۔ آخ۔۔۔ آخ۔۔۔ کیا۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ وہ دلچسپی سے فلم دیکھنے لگی۔۔۔ اور اختتام پر اس نے تالیاں بجائیں۔ اس نے اس قسم کی فلم پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہیرو ہیروئن کے سب جھمیلوں سے ہٹ کر۔۔۔ ایسی شاندار فلم۔۔۔ کمال ہو گیا۔

جب وہ ویرا کی سائیکل پر بیٹھ رہی تھی گھر جانے کے لیے تو عالیان نے بہت آہستگی سے اس سے فرمائش کی۔

"ایک بار کہہ دو۔۔۔ آخ۔۔۔ خ۔۔۔" اور وہ قہقہہ لگا کر ویرا کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

وہ وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ لوگوں کا ہونا ہی خوشی دیتا ہے۔ ان لوگوں کا جانا اتنی ہی تکلیف دیتا ہے۔ وہ اس وقت ایسی ہی کسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

وہ عالیان مارگریٹ جو جب سیٹی بجاتا ہے۔ دونوں ٹانگوں کو ہوا میں اچھال کر ان کی تالی بجاتا جاتا ہے تو کم سے کم پچاس لوگ اسے مڑ کر دیکھنا ضرور پسند کرتے ہیں۔ اگر وہ غصے سے بھی کسی کو دیکھتا ہے تو بھی اس پر پیار ہی آتا ہے۔

☼ ☼ ☼

لیڈی مہر شادی کے دس سال تک بے اولاد رہیں۔۔۔ پھر جب دونوں نے بچہ گود لینے کا سوچا تو ان کے شوہر احمد حسین کا کار کے حادثے میں انتقال ہو گیا۔ احمد حسین دل کے سرجن ڈاکٹر تھے۔ وہ ایک کامیاب انسان تھے اور ایسے کامیاب مرد خواتین کے چلے جانے کے بعد ان کی بیوی اتنی کامیابی سے زندگی نہ گزار سکیں۔ پہلے فالج سے ان کا آدھا جسم مفلوج ہوا۔ وہ دو سال پرائیویٹ ہسپتال میں رہیں۔۔۔ میکے کے نام پر ان کے خاندان میں صرف ایک باپ تھے جو ان کی دو سالہ بیماری کے دوران چل بسے۔۔۔ احمد حسین کے تین بھائی تھے۔ لیکن وہ اس صورت مہر سے ملنا چاہتے تھے۔ اگر وہ احمد حسین کی جائیداد ان کے نام

کرو دیتیں۔ ایک گھر اور میڈیسن کمپنی کے شیئرز۔

مہر بچہ گود لینا چاہتی تھیں۔ اب وہ بھی نہیں لے سکتی تھیں۔ ان کی حالت ہی ایسی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتی تھیں۔ بچے کو کیسے... اور اس حالت میں انہیں کوئی بھی لاوارث بچہ نہ دیتا۔ تو انہوں نے بچوں کو ان اداروں میں رکھ کر ہی پالنا شروع کر دیا۔ ایک ادارہ تھا "اور کڈز" (ہمارے بچے) جو بچہ پالنے کے خواہش مند افراد کو ایک بچے سے ملوا دیتے اور پھر اس کے اخراجات کے پیسے لیتے رہتے اور اسے اپنے پاس رکھ کر ہی اس کی تعلیم و تربیت کرتے۔

مہر نے یہاں ایک نہیں پورے دس بچوں کو لے کر پالا۔ وہ کمپنی سے ملنے والے منافع میں سے اپنے اخراجات کے لیے رقم نکال کر باقی سب اس ادارے کو دے دیتیں۔ بچے مہینے میں ایک بار ان سے آکر مل جاتے۔ ایک پورا دن ان کے پاس گزار کر جاتے۔ مہر کو ماما کہتے۔

یہ مختلف قوم و نسل سے تعلق رکھنے والے بچے تھے اور سب مہر کو بہت پیارے تھے۔ کرسمس ... سال وہ مہر کے ساتھ گزارتے۔ ان میں سے ایک مسلمان تھا۔ وہ اپنی عید مہر کے گھر گزارتا۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے وہ مہر کے پاس رہنے بھی لگے۔ وہ سب نہ صرف اپنے کام خود کرتے تھے بلکہ مہر کے بھی کئی کام کر دیتے۔ مہر مہینے کے اس ایک دن اور رات کا انتظار کرتیں جب وہ سب ان کے پاس ہوتے۔

یہی بچے بالغ ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے مختلف شہروں، ملکوں اور یونیورسٹیوں کی طرف بڑھتے گئے۔ کچھ شادی کر چکے تھے... کچھ نوکری کرتے تھے۔ کچھ ابھی بھی پڑھ رہے تھے۔ یہ سب دنیا کے کسی بھی کونے میں، کسی بھی حالت میں ہوتے مہر کو فون کرنا نہیں بھولتے تھے۔ لیڈی مہر ہمہ وقت ان کے فون سنتیں یا انہیں سالگرہ کے تحائف بھیج رہی ہوتیں۔ ان کی طرف سے بھیجے جانے والے فون میسجز یا کارڈز پڑھتی رہتیں۔ مہینے دو مہینے میں کوئی نہ کوئی ان سے ملنے آیا بھی ہوتا۔ جس کی آمد پر وہ ایسے خوش ہوتیں جیسے پاکستان میں مائیں اپنے بیٹوں کو سہرا باندھے دیکھ کر ہوتی ہیں۔

گاہے بگاہے یہ سپیشل کال آتے رہتے تھے۔

اسی لیے یہاں چار، پانچ سے زیادہ لوگوں کو پے انگ گیسٹ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ایک، دو دن وہ گروہ چلے جاتے۔ کوئی ڈاکٹر تھا، کوئی انجینئر، کوئی اپنا بزنس کر رہا تھا۔ کوئی نرس بھی، کوئی اسٹوڈنٹ، لیکن یہاں آتے ہی وہ سب لیڈی مہر کے بچے بن جاتے۔ ان کے سارے کام خود کرنا پسند کرتے۔ انہیں کھانا کھلاتے، منہ دھلواتے، چیک اپ اور میڈیکل چیک اپ کے لیے لے کر جاتے۔ انہیں مختلف پارکوں میں لیے گھومتے رہتے اور رات کو انہیں کہانیاں سناتے، لیڈی مہران کے لیے مقدس ہستی جیسی تھیں۔

ان ہی بچوں میں سے ایک مورگن کیمبرج سے ایم فل کر رہی تھی۔ وہ اپنے فرینڈ جوش کو دکھوانے کے لیے اسپیشل کال لائی کہ اگر ماما ہاں کہتی ہیں تو وہ بھی جوش کو ہاں کہہ دے۔

"یہ جوش کیوں تمہیں واقعی پسند ہے مورگن؟"

"اچھا انسان ہے ماما۔" مورگن مسکرائی۔

"کیا سوویت یونین کے برفیلے پہاڑوں میں کام کر رہا ہے۔ بہت ہی برفیلا سا ہے۔"

"اگلے سال جوش کی پی ایچ ڈی مکمل ہو جائے گی۔"

"مورگن! کسی ہیرو شیرو کو پسند کرتیں نا، سنا ہے کیمبرج میں بہت سے فلم اسٹارز پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ میرا تو خواب ہی رہا کہ میرے کسی بچے کی کسی فلم اسٹار سے شادی ہو۔"

"تو میں جوش کو انکار کر دوں ماما...؟"

"تمہارے انکار سے تو یہ مر مرا جائے گا۔" انہوں نے بے چارے سے نظر آتے جوش کو دیکھا۔ جو ٹی وی پر ایک ڈاکومنٹری دیکھ رہا تھا۔ سادہ سا اور امرد سا۔ اسے ایسے دیکھ رہی تھیں [illegible] تھا۔ دراصل دونوں جان بوجھ کر اسے حواس باختہ

کررہی تھیں۔

بس ایویں ہی۔ خوامخواہ کا شوقیہ شغل۔

"ہاں تھوڑا ڈر تو ہے۔" موہر گن نے ماما کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے ہاں کہہ دو پھر اسے۔ کب کرو گی شادی۔؟ میں چاہتی ہوں تم بہار کی دلہن بنو۔ لیکن کرسمس کی چھٹیوں کے علاوہ تم کہاں فارغ ہو گی شادی کے لیے۔"

"نہیں۔ آپ کہہ رہی ہیں تو میں بہار ہی میں کرواں گی۔"

"نہیں۔ کرسمس ٹھیک ہے۔ ہم کرسٹینا کو بہار کی دلہن بنا دیں گے۔ آج کل میں بس وہ بھی آنے ہی والی ہے۔ ایسے ہی کسی نمونے کو لے کر۔"

امرحہ اور سادھنا نے بلند بانگ قہقہے چھوڑے نمونے کے نام پر۔ لیڈی مہر نے جوش کو رست واچ دی تو بے چارہ نم سا ہو گیا۔ لیڈی مہر نے موہر گن پر ایک خائف سی نظر ڈالی۔

"پھر سوچ لو موہر گن۔ مجھے تو لگتا ہے یہ ایک دن بار رونے سے ہی یہ پگھل کر ختم ہو جائے گا۔"

اس بار وہ دونوں اتنا ہنسیں کہ انہیں نشست گاہ سے باہر جانا پڑا۔

جس دن سادھنا کو معلوم ہوا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کو ایسی خطرناک بیماری ہو گئی ہے تو دونوں میاں ' بیوی کئی دن اور راتوں تک روتے رہے۔ اس کا شوہر ایک کمپنی میں چند ہزار پر ملازم تھا۔ وہ اتنی بڑی بیماری کا علاج کیسے کرواسکتے تھے۔ حیدر آباد میں ایک چھوٹا سا گھر ان کا اپنا تھا۔ لیکن اسے بیچ کر بھی ان کے بیٹے کا علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ گھر کو بیچ کر سادھنا کا شوہر یورپ کی طرف نکل جائے اور وہاں کام کرے' انہوں نے گھر بیچ دیا' لیکن اس کے شوہر کو ویزا نہ ملا۔ ویزا ایجنٹ نے ہی بتایا کہ آدمی کی نسبت عورت کو ویزا ملنے کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں تو سادھنا نے ویزے کے لیے اپلائی کیا اور اسے ویزا مل گیا۔ وہ یہاں ایشیائی گھرانوں میں کام کرتی تھی۔

پاکستانی' ہندوستانی' سعودی گھرانوں میں جا کر وہ گھریلو کام کرتی۔ گھریلو کام کے لیے ہر گھر ہفتے میں دو دن اسے بلاتا اور فی گھنٹہ کے حساب سے پیسے ملتے۔ لیڈی مہر کے گھر وہ پہلے کرائے دار تھی۔ پھر لیڈی مہر نے اس کے حوالے سارا گھر کر دیا۔ وہ لیڈی مہر کو بھی دیکھتی اور گھر کو بھی۔ دو سالوں میں اس نے کافی کمایا تھا۔ سنگاپور کے اسپتال میں آریان کے دو آپریشن ہو چکے تھے۔ ایک آخری آپریشن ہونا تھا۔ پھر تین تین ماہ کے میڈیکل چیک اپ۔ ڈاکٹرز بہت پر امید تھے۔ آریان کی صحت یابی کے لیے اور ڈاکٹرز سے زیادہ سادھنا خود تھی۔

جن گھروں میں وہ جاتی تھی وہ سب آریان کے لیے الگ سے پیسے دیتے تھے۔ لیڈی مہر بھی ہر آپریشن کے لیے ایک بڑی رقم دیتی تھیں۔

"آپ بہت بہادر ہیں۔" امرحہ کو جس دن ساری کہانی معلوم ہوئی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ہاں۔ میں بہادر ہوں' اسی لیے اللہ نے میرا انتخاب کیا کہ میں اس مشکل کو آسان کروں۔ مجھے اپنے منتخب کیے جانے پر خوشی ہے۔"

"آپ کا بیٹا بہت بڑا انسان بنے گا۔"

"میں اسے بڑا ڈاکٹر بناؤں گی اور اچھا ہی ہوا کہ وہ اس تکلیف سے گزر رہا ہے۔ اس طرح اسے یاد رہے گا کہ تکلیف سے گزرنے والوں کی اس نے کیسے مدد کرنی ہے اور ان سے غفلت نہیں برتنی۔ قدرت کے ہر اقدام میں ایک گہرا راز ہوتا ہے۔ میں کچھ کچھ رہی ہوں اس راز کو۔ کچھ سمجھ جاؤں گی۔"

"اگلا آپریشن کب ہے آریان کا؟"

"چھ ماہ بعد۔ اس سے زیادہ وقت میں بھی ہو سکتا ہے۔" سادھنا نے اطمینان سے کہا۔

امرحہ بہت متاثر تھی سادھنا سے۔ جب وہ پاکستان میں تھی تو خود کو دنیا کی دکھی اور مظلوم ترین لڑکی سمجھتی تھی۔ سوورات کو بائن اہل کی پلیٹ بھر کر کھاتی جاتی اور روتی جاتی۔ اسے لگتا دنیا میں اس سے زیادہ مشکل اور مصیبت میں کوئی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ تھکن میں

کوئی نہیں، سو دیکھ سب سے زیادہ تکلیفیں اسے ہی مل رہی ہیں۔ مل رہی ہیں۔ اگر انسان دنیا میں چل پھر کر دیکھے تو اسے خبر ہو کہ جس دکھ پر وہ ایسے واویلا مچاتا ہے 'دہائی دیتا ہے' وہ تو کوئی دکھ ہے ہی نہیں۔ لوگ تو کیڑے پڑے زخموں کے ساتھ بھی گنگناتے ہیں۔ مسکراتے ہیں اور اصل میں وہی انسان بھی ہیں۔ جو سر کو آسمان کی طرف شکوے کے لیے نہیں شکر کے لیے اٹھاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک گاہک شو اسٹور میں پچھلے ایک گھنٹے سے گھوم پھر رہا تھا۔ لیکن کوئی جوتا اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔ ہر بار وہ کاؤنٹر کا چکر لگا کر ذرا آگے نکل جاتا اور پھر سے گھوم کر کاؤنٹر کے پاس آ جاتا۔ امرحہ کو بہت مصروف تھی۔ لیکن اسے دیکھ بھی رہی تھی۔

"میں تمہیں یہ بتا دوں کہ یہاں اس اسٹور میں جوتوں کی نوٹیفکیشن نہیں ملتی۔" امرحہ اس کے پاس آ گئی۔
"اچھا۔ تم نے انہیں سکھایا نہیں نوٹیفکیشن دینا۔"
"تمہیں کیا چاہیے... تمہیں کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا؟"
"جو اچھا ہے وہ مہنگا ہے 'جو مہنگا نہیں... وہ اچھا نہیں۔"
"مجھے نہیں لگتا کہ تم یہاں کسی خریداری کے موڈ میں آئے ہو۔"
"ہاں۔ کچھ کچھ ایسا ہی ہے۔"
"اچھا دیکھو 'ہمارے اسٹور روم میں کچھ نقص والے جوتے رکھے ہیں۔ ہم ورکرز چاہیں تو انہیں لے سکتے ہیں۔ میں ان سے بات کر لیتی ہوں 'تم میرے ساتھ آ کر اچھے والے لیکن سستے والے جوتے لے سکتے ہو۔"
"کتنی اچھی ہو تم۔ لیکن آج نہیں... شاید کل..."
"پھر تم آج کیا کرنے آئے تھے یہاں۔"

"آج... پتا نہیں... میں پتا کر کے کل بتاؤں گا۔" گھڑی کو دیکھتا وہ چلا گیا جیسے مقصد پورا ہو گیا۔
شیشے کے پار سے امرحہ نے اسے جاتے دیکھا۔ وہ "ہاؤ ٹیپ ان لو" کی دھن سیٹی پر بجا رہا تھا اور ایسے چل رہا تھا جیسے راک اسٹار اپنا کامیاب شو کر کے گھر لوٹ رہا ہو۔

کل وہ پھر آ گیا۔ لیکن جوتے لے کر پھر بھی نہیں گیا۔ جب وہ اسے اسٹور روم میں لے گئی اور اس نے اس کا وہاں کافی وقت لے لیا تو عین وقت پر اسے یاد آیا کہ اس کے پاس تو کافی اچھی حالت میں دو تین اچھے جوڑے ہیں... جو بن گئے ہیں پھر وہ نئے کیوں لے۔
"پھر تم یہاں آئے کیوں؟" وہ زچ ہو گئی۔
"پتا نہیں... بس کبھی کبھی میری یادداشت ایسے ہی چلی جاتی ہے۔ جب یادداشت گئی تو میں آ گیا اب واپس آ گئی ہے تو مجھے جانا ہو گا۔"
"پاکستان میں ہم تم جیسے لوگوں کو باؤلا کہتے ہیں۔"
"باؤل... آ...؟"
"ہاں باؤل... آ... چلو جاؤ اب۔ کتنا وقت ضائع کیا میرا۔"
جاتے جاتے وہ پھر رک سا گیا۔ "میرا خیال ہے اگر میں ایک جوڑا جوتا لے ہی لوں گا تو یو این اسمبلی میں اسے یقیناً "زیر بحث" نہیں لایا جائے گا۔" وہ پھر سے جوتے پہن پہن کر دیکھتا رہا۔
"ویسے مجھے یہ خیال بھی آ رہا ہے کہ ایک اسٹوڈنٹ کو اتنا شاہ خرچ نہیں ہونا چاہیے... اوہاں یاد آیا... میں نے سنا ہے کہ ایشیا میں لوگوں کے پاس اتنے کپڑے اور جوتے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کپڑے 'جوتے دنیا بھر کے انسانوں میں تقسیم کرنے لگیں تو ہر ایک کو دو دو جوتے اور کپڑے مل جائیں... کیا تمہارے پاس بھی اتنے ہی ہیں؟"
وہ گڑبڑا گئی۔ "پتا نہیں۔"
"یعنی اتنے ہی ہیں... ہر وقت تم لوگ کپڑوں اور ایسی چیزوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہو اور پھر اصل باتوں پر سوچنے کے لیے دماغ میں لو جگہ ہی

نہیں رہتی۔"

"میرے دماغ میں بھی اور جگہ نہیں رہی' تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں سن سن کر۔"

کندھے اچکا کر وہ چلا گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور سڑک کو پار کرتے فٹ پاتھ پر چلتے اس نے کمرے کی پانچ بار مڑ کر شیشے کے اس پار تھوڑی تھوڑی دیر پر سر جھکائے کمپیوٹر میں بلزی انٹری کرتے امرحہ کو دیکھا۔

اس بار اس نے سیٹی کی دھن بدل ڈالی۔ وہ ایک مشرقی دھن بجا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈیرک آرٹ کا اسٹوڈنٹ تھا اور اس نے ایک مقامی چینل کے لیے دو منٹ کی ڈاکومنٹری بنائی اور ڈبنگ کے لیے امرحہ کو بلایا۔ امرحہ جانتی تھی کہ وہ اب تک شرمندہ ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ اس کی مدد کرتا ہے۔ دو منٹ کی ڈبنگ کے اسے اچھے خاصے پیسے مل گئے تھے اور کلفی سے زیادہ معلومات بھی۔ صرف ایک کیمرے کے ساتھ ڈیرک نے وہ ڈاکومنٹری بنائی تھی اور اچھے خاصے پیسے بنا لیے تھے۔ ڈیرک نے اسے اپنی پہلے سے بنائی گئی دوسری ڈاکومنٹریز بھی دکھائیں۔ اسے وہ سب اچھی لگیں۔ خاص کر ڈیرک کی کوشش اچھی لگی۔

چند دن سوچنے کے بعد اس نے ڈیرک سے مشورہ کیا۔ وہ مانچسٹر یونیورسٹی میں ایڈمیشن سے متعلق ایک تفصیلی ڈاکومنٹری بنوانا چاہتی تھی۔ تاکہ پاکستانی اسٹوڈنٹس کو اچھی طرح سے اپ ڈیٹ رکھا جائے۔ ڈیرک نے اسے بتایا کہ ڈاکومنٹری کے لیے بھی اسکرپٹ لکھا جاتا ہے۔ پہلے وہ اسکرپٹ لکھے۔ اس نے اپنے لکھے اسکرپٹ اسے دے دیے۔ تاکہ وہ ان سے سیکھ لے۔ انہیں کئی دن پڑھنے کے بعد اس نے پانچ منٹ کا اسکرپٹ لکھ لیا۔ ڈیرک نے کچھ بنیادی تبدیلیاں کیں اور انہوں نے ایڈمیشن سے متعلق ایک جامع ویڈیو بنالی۔ ڈیرک نے اس کی انگلش میں ڈبنگ کی اور امرحہ نے اردو میں۔ ویڈیو اس نے پاکستان کے

چند نئی ٹی وی چینلز کو بھیج دی اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑا وقت لگا اور جواب آ گیا۔ وہ ویڈیو خریدنے کے لیے تیار تھے۔ پر وہ بہت ہی کم پیسے دے رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اسے کم پیسوں پر ہی دے دینی چاہیے۔ لیکن ڈیرک نے روک دیا۔

"کبھی فیصلوں میں اتنی جلدی نہیں کرتے۔ جلد بازی ایک بڑے نقصان کا باعث بے شک نہ بنے۔ لیکن بڑے فائدے سے ضرور محروم کروا دیتی ہے۔ میری پہلی ڈاکومنٹری ایک سال میرے پاس پڑی رہی تھی۔ کوئی اسے خریدنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ ٹرائل کے لیے میں نے پھر اسے ایک جرنلسٹ کو دے دیا۔ اس نے اسے اپنی ویب سائٹ پر پوسٹ کروا دی۔ بس پھر مت پوچھو۔ جن چینلز نے انکار کیا تھا۔ وہ اس کے پراجیکٹ لینے کے لیے تڑپنے لگے۔ فیصلہ اس طرح کے لوگ ذہین ہیں۔ ایک جنہیں اچھی چیز چاہیے۔ دوسرے جنہیں اچھی بکنے والی چیز چاہیے' جو انہیں فائدہ دے۔ تمہیں ایک سے انکار ہوا ہے۔ تم دوسرے کے پاس جاؤ۔"

ڈیرک نے ہی اس کے ساتھ مل کر تھوڑی بہت ریسرچ کی اور اس بار انہوں نے ان پاکستانی چینلز کو ویڈیو بھیجی جو اسٹوڈنٹ ویزا کا کام کرتے تھے۔ انہیں ایک دوسرے درجے کی ویزا کمپنی نے ہاں کہہ دی اور نسبتاً "اچھی رقم" آفر کی۔ امرحہ نے ہاں کہہ دی۔ یہ ہاں اچھی رہی۔ کیونکہ اسی کمپنی نے چند اور ایک ایک دو منٹ کی ویڈیوز کے لیے امرحہ سے بات کی۔ انہیں مانچسٹر یونیورسٹی کے چند دوسرے ڈیپارٹمنٹس کی تفصیلات چاہیے تھیں۔ جو وہ اپنے اسٹوڈنٹس کو دکھا سکتے۔ امرحہ اور ڈیرک نے وہ بھی بنا کر بھیج دیں۔ امرحہ کو اچھا خاصا فائدہ ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر یہی رفتار رہی تو وہ بہت جلد اپنا تھرڈ پرسنٹ کا قرض دائم کے ہاتھ میں تھما دے گی۔

☼ ☼ ☼

[illegible]

خرچی کا نہ ہونے کے برابر۔ سردیاں آچکی تھیں تو اس نے اپنے لیے صرف گرم کوٹ لیے تھے۔ جو وہ پاکستان سے لائی تھی۔ وہ یہاں بےکار تھے۔ یہاں کی سردی اس کی سوچ سے بڑھ کر تھی۔

رات گئے ایک دن دادا کا فون آیا۔ اسے وہ کافی پریشان لگے۔

"پریشان نہ ہونا امرحہ۔ دھیان سے سنو تمہارے بابا ہسپتال میں ہے۔ تمہاری پوری اعظم مارکیٹ میں آگ لگی تھی۔ بس واجد خود کو سنبھال نہ سکا۔"

"کیا ہوا دادا؟" وہ چلا اٹھی۔

"وہ ٹھیک ہے۔ سینے میں درد ہوا تھا اس کے۔"

"میری بات کروائیں۔"

"ابھی وہ ہوش میں نہیں ہے تم دعا کرو۔"

وہ کمرے سے نکل کر باہر کا دروازہ کھول کر آسمان تلے آگئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ایسے جیسے دنیا کا بوجھ اسے دباؤ سے مار ڈالے گی۔ سادھنا اس کے پیچھے آئی۔

"پاکستان میں سب ٹھیک ہے امرحہ؟"

"میرے بابا ہسپتال میں ہیں۔" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ "وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔"

وہ منہ اٹھا کر سادھنا کو دیکھنے لگی۔

"تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔ دو دن پہلے تم مجھے کہہ رہی تھیں۔ تم بہت بہادر ہو۔"

"میرے اندر گھبراہٹ بڑھ رہی ہے۔ میرا دل پھٹا جارہا ہے۔"

"یہ گھبراہٹ نہیں مایوسی ہے۔ جب انسان مایوس ہوتا ہے اس کے اندر ایسے ہی ابال اٹھتے ہیں۔ اسے بےچین کردیتے ہیں۔ یہ مایوسی ہی ہے۔ ورنہ تم ایسے نکل کر باہر کو نہ بھاگتیں۔ اپنی عبادت کرتیں۔ پہلا کلمہ رونے کا نہ کرتیں دعا کا کرتیں۔ خود کو سنبھالو۔ اپنے گھر والوں کا حال احوال لو۔"

وہ سادھنا کی طرف دنگ سی دیکھتی رہ گئی اور اندر کی طرف لپکی۔ فون کیا اور دادی، اماں سب کو ہی جان لگا کر تسلی دی۔

"گھبرائیں نہیں، وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔" اس کا انداز مضبوط تھا۔

"اگر انہیں کچھ ہوگیا تو۔" اماں روتی جاتی تھیں۔

"میرے پاس آپ کی مایوسیوں کے جوابات نہیں ہیں۔" دادا اس کی مختلف ڈاکٹرز سے بات کرواتے رہے۔ ٹھیک تین گھنٹے بعد انہیں ہوش آگیا اور دو دن بعد وہ گھر چلے گئے۔

دکان میں موجود بیس پچیس لاکھ کے قالین جل کر راکھ ہوچکے تھے۔ بابا کے سینے میں تکلیف کیوں نہ اٹھتی۔ کیونکہ بہت سے نام پر وہ کنگال ہوچکے تھے۔

پاکستان میں سب بےحد پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا۔ برنارڈ چیسٹر میں وہ تن تنہا ہی سے ان معاملات کا حل نکالنے میں مصروف تھی۔ وہ فکرمند ضرور تھی۔ لیکن بےکل یا پریشان نہیں۔

"واجد سود پر قرض لے رہا ہے۔" دادا نے فون پر بتایا۔

"سود پر؟" اسے دھچکا لگا۔

"ہاں۔ میری کوئی بات نہیں سن رہا۔ بنا سود کے قرض کہیں سے نہیں مل رہا۔"

"سود حرام ہے دادا۔" اسے دکھ ہوا یہ جان کر۔

"یاد ہے مجھے اور واجد کو بھی یاد دلایا ہے۔ کہتا ہے سود نہیں ہے۔ بس وہ قرض پر منافع لیں گے۔" دادا آبدیدہ ہوگئے۔ "یا وہ گھر بیچے گا یا قرض لے گا۔ ورنہ دکان کیسے چلائے گا۔"

"بابا سے کہیے گا قرض نہ لیں، میں کچھ کرتی ہوں۔"

"تم کیا کروگی؟" دادا حیران ہوئے۔

"کیوں۔ بہت کچھ کرسکتی ہوں میں۔ جہاں ایک مشکل آتی ہے وہاں دائیں بائیں سو حل آتے ہیں۔ میں دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھتی ہوں حل ضرور کہیں نہ کہیں ہوگا۔"

اس نے اب تک کی اپنی جمع کی گئی۔ تنخواہ اور ڈاکومنٹریز سے ملنے والے پیسے بابا کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیے۔ وہ پاکستانی چند لاکھ تھے۔ فی الحال اتنے بھی کافی تھے۔ پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے لیڈی مہر کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

انہوں نے خاموشی سے ایک چیک کاٹ دیا۔ وہ حیران چیک دیکھتی رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ لیڈی مہر اسے مشورہ دیں گی کہ ایسے کرلو یا ویسے کرلو۔ لیکن انہوں نے مناسب رقم کا ایک چیک اسے لکھ دیا۔

"یہ قرض ہے۔" انہوں نے اسے باور کرایا۔

"جی بالکل۔" اس نے سر ہلایا۔

"تمہیں معلوم ہے امرحہ! کہ میں تمہیں اور تم جیسی کئی لڑکیوں کو یہاں مفت بھی رکھ سکتی ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرتی۔ اگر ایسا کیا میں نے تو تمہیں بے کار اور ناکارہ بنادوں گی۔ میرا ایک بیٹا اسی شہر میں رہتا ہے اور وہ میرے ساتھ نہیں رہتا۔ میں نے اسے کوشش اور مسلسل کوشش کرتے رہنا سکھایا ہے۔ میرے اس آرام دہ گھر کے شاہانہ بستروں پر لیٹے مجھے نیند نہیں آتی۔ میں اپنے بچوں کو اس دنیا کے کامیاب ترین انسان بنے دیکھنا چاہتی ہوں اور ایسا انسان بننے کے لیے انہیں ایک شاہانہ نہیں محنت کی زندگی گزارنی پڑے گی۔ انہیں زیرو ہونا ہے تاکہ وہ زیرو کے آگے اعداد لکھ کر اپنے نمبر بڑھا سکیں۔ میرے بابا ایک کسان تھے۔ اسکاٹ لینڈ میں ان کا ایک فارم ہاؤس تھا۔ وہ کہا کرتے تھے "محلوں میں زندگی گزارنے والے بدقسمت ترین لوگ ہیں کیونکہ وہ ناکارہ ہیں۔ پھر وہ اپنے مٹی سے اٹے ہاتھ اٹھا کر اعلان کرتے "خوش قسمت تو ہم ہیں۔ کیونکہ ہم کارآمد ہیں۔ زندگی ہم میں سانس لیتی ہے۔ زندگی ہم میں دھڑکتی ہے۔" میں یہ رقم تمہیں ویسے بھی دے سکتی ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت دیا ہے۔ لیکن یہ قرض اس لیے ہے۔ تاکہ اسے واپس کرنے کے لیے تم خود کو کارآمد بناؤ۔ ٹھیک ہے؟"

"جی۔ ٹھیک ہے۔"

اس نے چیک بھی بابا کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیا۔ بابا کا فوراً فون آیا۔

"امرحہ۔۔۔ اتنے پیسے۔۔۔ کہاں سے آئے اتنے پیسے؟"

"میں نے اپنی لینڈ لیڈی سے پانچ سو کے ادھار لیے ہیں۔۔۔ اور کچھ میرے اپنے جمع کیے گئے ہیں۔"

"تم نے کیسے جمع کیے؟" دادا کے سوا کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں جاب کرتی ہے۔ ایک' دو بار دادا نے بابا سے کہا کہ امرحہ کو پیسے بھیجنے چاہئیں' تاکہ وہ اپنی چھوٹی بڑی ضروریات پوری کر سکے تو بابا نے چند ہزار پاکستانی دادا کے حوالے کیے کہ اس سے اس کے تین' چار ماہ آرام سے گزر جائیں گے۔ امرحہ نے وہ پیسے دادا کے پاس ہی رہنے دیے۔

"میں جاب کرتی ہوں بابا۔"

"جاب۔۔۔ تم کام کرتی ہو وہاں۔۔۔ تم نے تو کبھی پاکستان میں چھوٹی سی بھی جاب نہیں کی۔"

"نہیں کی۔ غلطی کی۔۔۔ اب کر رہی ہوں اور بہت خوش ہوں۔ بابا! یہاں سب کرتے ہیں۔"

بابا آبدیدہ ہو گئے۔ زندگی میں پہلی بار ان کے لیے "امرحہ! تم اب اتنی سمجھدار ہو گئیں۔ علی اور حماد کو کھیلنے کودنے سے فرصت نہیں ہے اور تم نے مجھے وہاں سے لاکھوں بھیج دیے۔ میں نے تو تمہیں وہاں جانے کے لیے ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔"

"علی اور حماد کو کھیلنے کودنے سے اس لیے فرصت نہیں ہے بابا کیونکہ آپ نے انہیں کھیل کود میں مصروف رکھا ہے۔ ان پر سختی کریں۔ اگر وہ پڑھنا نہیں چاہتے تو انہیں کوئی ہنر سکھائیں۔ ہم خود ہی تو اپنے بچوں کو ایسی آرام و آسائش کی زندگی دیتے ہیں۔ ہم خود ہی تو انہیں ناکارہ بنا دیتے ہیں۔"

بابا خاموشی سے سنتے رہے۔ "تمہارے دادا نے کہا۔ تم وہاں بڑی کلاس میں پڑھ رہی ہو۔ مجھے یقین آ رہا ہے کہ واقعی تم بڑی کلاس میں پڑھ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں اور کیا کیا کروں؟"

بابا کی یہ بات "مجھے بتاؤ میں اور کیا کیا کروں" نے اس کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ خوشی سے اس کا برا حال ہو گیا۔

"بابا! پہلے تو سب کو کفایت کی عادت ڈالیں۔ فضول خرچی ترک کر دیں۔ علی اور حماد سے کہا کریں صبح جلدی اٹھا کریں۔ دانیہ سے کہیں کہ وہ ساتھ ساتھ کوئی جاب کرے۔ بابا! اپنے ذہن پر کوئی دباؤ نہ رکھیں۔ جو نقصان ہو گیا ہمارا اسی میں فائدہ ہو گا۔ ایک چھوٹا نقصان ہمیں بڑے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ بس یہی کافی ہے۔ آپ بس محنت سے نئے سرے سے اپنا کام کریں اور میری خواہش ہے کہ آپ یتیم خانے کے بچوں کو بلوا کر انہیں دکان میں بٹھا کر کھانا کھلائیں۔"

"میں خود جا کر انہیں لاؤں گا اور کھانا کھلاؤں گا۔۔۔ اور تم۔۔۔"

وہ آبدیدہ سی ہو گئی اور بابا سے کہہ نہ سکی کہ یہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ جو اپنی اولاد کو وہ کل پرزے بناتے ہیں جو زندگی کی گاڑی میں شان سے فٹ ہو جاتے ہیں اور گاڑی چھکا چھک دوڑتی چلی جاتی ہے اور اگر والدین ان ہی پرزوں کو کند کر دیں تو زندگی کی گاڑی جام ہو کر بند ہو جاتی ہے اور بہر حال اس کا وبال سر پر آتا ہے' کیونکہ نا۔ لو اولاد اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

"بس بابا! اپنا خیال رکھیں اور کبھی دل چھوٹا مت کیجیے گا۔"

"میری دکان پھر سے چل نکلی تو میں تمہیں پیسے بھیجا کروں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے بابا۔۔۔! میرے پاس میری ضرورت کے لیے کافی پیسے ہوتے ہیں۔"

"تم تھک جاتی ہو گی؟"

"بالکل نہیں۔۔۔ مجھے اچھا لگتا ہے سب کرنا۔"

☆ ☆ ☆

کرسمس آنے میں ابھی وقت تھا۔ موسم اس کی سوچ سے زیادہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی میں وہ ہر

وقت مونگ پھلی کھاتی ہوئی پائی جاتی اور جس تعداد میں اس کی پسندیدہ پھلی تھی یونیورسٹی میں اسی حساب سے جتنی مونگ پھلی منہ میں جاتی تھی اس سے کہیں زیادہ دوسروں کے ہاتھوں میں جاتی تھی۔ اب روز کی کلو دو کلو مونگ پھلی تو وہ نہیں لے سکتی تھی نا۔ اس لیے جہاں ذرا سا سناٹا سا دیکھتی منہ میں ڈال لیتی۔ ایک دن ایسا کرتے اسے اپنے پیچھے عالیان کا قہقہہ سنائی دیا۔

"کتنی چالاک ہو تم' کیسے چھپ چھپ کر کھا رہی ہو۔"

"نہیں تو....." وہ صاف مکر گئی۔

امرحہ انگلش لٹریچر کی اسٹوڈنٹ تھی اور عالیان بزنس کا۔ اور امرحہ تو پھر اپنی عادت کے مطابق پوری یونیورسٹی کا ہفتے میں ایک چکر ضرور لگا لیتی۔ ورنہ حصوں میں تو ضرور ہی چکر کو مکمل کر لیتی۔ لیکن عالیان کم ہی کہیں چلتا پھرتا کھڑا ہنستا نظر آتا۔ ہاں' کبھی کبھی وہ ایسے ہو جاتا کہ ہر وقت ہر ایک کو نظر آتا اور کبھی ایسے کہ ہر کوئی اس کا پوچھ رہا ہوتا کہ وہ کہاں ہے۔

اب وہ پھر ایسے اچانک سے نمودار ہوا تو امرحہ تو اچھل گئی۔ اس نے جیب سے مونگ پھلی نکال کر اسے دی اور ساتھ ساتھ وہ اسے بتاتی رہی کہ لاہور میں مونگ پھلی کیسے بکتی ہے۔ کیسے اسے گرم کیا جاتا ہے۔ کیسے ریڑھی کے پاس بیٹھ کر اسے بیچا جاتا ہے۔ پھر اس نے اسے بتایا کہ بچپن میں وہ مونگ پھلی کے چھلکوں کے ڈھیر کو چیچے چیچے کھنگالا کرتی تھی کہ اس میں سے اسے کوئی مونگ پھلی مل ہی جائے۔ عالیان دیر تک ہنستا رہا۔

"میں یقین کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے تم نے ہی کیا ہو گا۔"

وہ ہنستا رہا۔ پھر اپنی انگلی کی پور سے اپنی آنکھ کی نمی صاف کی اور اپنے کراس بیگ میں اس سے مونگ پھلی بھروا کر اپنی کلاس لینے چلا گیا اور پھر وہ اسے ایک ایسے وقت نظر آیا کہ اس نے حیرت سے کتاب بند کر دی۔ رات بارہ بجے سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے ذرا دور کھڑکی کے دوسرے کنارے کی طرف اسے وہ نظر آیا۔ پہلے اس نے سر کو اٹھا کر جیسے سارے گھر کا بھرپور جائزہ لیا۔ پھر وہ ایک کھڑکی کی طرف بڑھا۔ امرحہ نے جھٹ اپنے کمرے کی بتی بجھا دی اور کھڑکی سے سر نکال کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کھڑکی سے اچھل اچھل کر اندر جھانک رہا تھا۔ پھر اس نے یہی کام دوسری کھڑکیوں کے ساتھ کیا۔ پھر وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑا ہو کر پائپ کا سہارا لے کر اوپر کی منزل کے ایک بیڈروم کی کھڑکی میں جھانکنے لگا۔ امرحہ کا حیرت سے برا حال تھا۔ وہ اتنی مشاقی سے یہ سب کر رہا تھا جیسے اسپائیڈرمین ہو اور ایک عرصے سے ایسے کرتب کر رہا ہو۔ پھر وہ اس کھڑکی سے زمین پہ کود گیا اور ہنسنے سا لگا۔ امرحہ نے سر ذرا پیچھے کر لیا۔ اب وہ اسی کھڑکی کے پاس آ رہا تھا۔ امرحہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ اسی کی کھڑکی کے نیچے کھڑا تھا۔ اب وہ کھڑکی بھی بند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے چند منٹ انتظار کیا اور کھڑکی سے نیچے جھانکنے کے لیے آگے ہوئی اور اس کی چیخ نکل گئی۔ عالیان ایک دم سے اس کے سامنے آیا۔ وہ کھڑکی پر چڑھ چکا تھا۔

"امرحہ!" عالیان نے سرگوشی سی کی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

"کتنی عجیب بات ہے۔" اس کی پوری بات تفصیل سے سننے کے بعد تاسف سے سرہلاتے ہوئے میں محض اتنا ہی کہہ سکا۔ اگرچہ کہنے کو دل میں بہت کچھ ابل رہا تھا۔

"اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب میں نے اپنا پرس کھولا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہاں میری لپ اسٹک، فیس پاؤڈر، برش اور سیل فون کے علاوہ ایک سکہ تک نہیں۔ کریڈٹ کارڈ تک میں لے جانا بھول گئی تھی۔ اف! فاخر۔ میرے تو مارے شرمندگی سے پسینے چھوٹ گئے۔" اس وقت کے

کوشش کی اور پھر جیسے اچھل پڑی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔ کیا تم نے اس کی جیبیں ٹٹول کر دیکھی تھیں۔ نہیں نا۔ اس نے بھی یہی سوچا ہوگا۔ اس لیے جو جی میں آیا بول دیا۔ کیونکہ اسے پتا ہے تم آنکھیں بند کرکے یقین کرلوگی۔"

"اگر ویسا ہی کچھ ہوتا تو کبھی اپنی مہنگی رسٹ واچ اتار کر نہ دیتا۔" وہ تنک کر بول اٹھی۔

"تو اس کے پاس اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔

عائشہ نصیر احمد



شرمندگی کے اثرات بخوبی اس کے چہرے پر دیکھ سکتا تھا۔

"تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو۔ شرمندہ تو اسے ہونا چاہیے تھا۔ لڑکی کو لنچ پر لے جا رہا ہے اور جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ یعنی کہ حد ہے کنگلے پن کی۔" ایک ضبط مسلسل سے بیٹھ کر اس کی کہانی سنتے سنتے مجھے اس کی آخری بات پر غصہ ہونا ہی پڑا۔ وہ ٹھٹک کر میری صورت دیکھنے لگی۔

"اس کا کیا قصور فاخر۔ اس کی تو جیب کٹ گئی تھی۔" اس نے پھر سے مجھے یاد دلایا۔

"مجھے تو اس بات میں بھی شک ہے۔" میں نے یقین سے کہا۔ اس نے چند لمحے میری بات سمجھنے کی

اینڈلیٹ کی رومانٹیڈ یو کہ یہ واچ بھی اسے تم ہی نے گفٹ کی تھی۔" میں بڑی کوشش کررہا تھا۔ اس

خبیث انسان کے لیے اس کے سامنے میرے منہ سے کوئی گالی نہ نکلے۔ مگر اس کے باوجود میں اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہیں رکھ پایا اور وہ بگڑتے تیوروں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"فاخر۔ بس بھی کرو۔ تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تم کیا بول رہے ہو۔ یقیناً" تم میرے پیٹھ پیچھے میرے بارے میں بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہو گے۔ میں ہی پاگل ہوں تاکہ ہر بار اپنی پرسنل باتیں تم سے شیئر کرنے لگ جاتی ہوں۔" اس نے انتہائی غصے سے کرسی سے لٹکا اپنا پرس کھینچا۔

"اور اس سے بڑا پاگل میں ہوں جو بیٹھ کر تمہاری باتیں سنتا ہوں۔" میں نے بھی کوئی لحاظ نہ رکھا۔

"تو مت سنو نا۔ کس نے کہا ہے سننے کے لیے اور اب تو میں تم سے یہ باتیں کروں گی ہی نہیں۔ بلکہ میں تم سے بالکل ہی کوئی بات نہیں کروں گی۔" ٹیبل پر رکھا سیل فون اٹھاتے ہوئے اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور اپنی اونچی ہیل کی سینڈل سے کھٹ کھٹ کرتی میری نظروں سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر بالوں میں ہاتھ پھنسائے۔

مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ ناراض ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کی ناراضی مجھ سے زیادہ دیر نہیں چلتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس مسٹر فراز ویلے کے ساتھ واقعی سیریس ہو رہی تھی۔ یہ بھی اپنے طرز کی ایک انوکھی اور عجیب و غریب ہی کہانی تھی۔ میں کسی اور سے سنتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ فی الحال یہ میری اپنی ہی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کردار بننے پر مجبور تھا۔

اور اس وقت جب میں ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آیا تو میرے سیل نے مجھے کسی کال کی اطلاع دی۔ میں نے دیکھا کال ریسیو کی اور بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کی ناراضی پانچ منٹ بھی نہیں چل سکی تھی۔

"کہاں ہو تم؟" اس کی پریشان سی آواز ابھری۔

"جہاں تم چھوڑ کر گئی تھیں۔" جواب دیتے ہوئے

مجھے تھوڑی حیرت بھی ہوئی اور آس پاس بھی نظر دوڑائی۔

"او کے۔ آکر مجھے پک کر لو۔ میں یہیں ہوں مطلب اس سڑک پر سیدھے۔ ذرا آگے آؤ گے تو میں رکشے میں بیٹھ گئی تھی۔ مگر بیٹھنے کے بعد اسے پیسوں کا معاملہ طے کرنے کا خیال آیا۔ اس پر ہمارا جھگڑا ہوا اور وہ مجھے بیچ سڑک پر اتار کر چلا گیا۔" اس کا شرمندہ سا لہجہ روہانسا ہو گیا۔

"تو تم سے کس نے کہا تھا اتنی ضد دکھانے کو۔"

میں نے بروقت خود کو یہ کہنے سے روکا کہ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ ریسٹورنٹ میں بھی وہ میرے ساتھ آئی تھی۔ پھر یوں ناراض ہو کر بنا سوچے سمجھے جانے کا تو یہی نتیجہ نکلنا تھا۔

"اچھا۔ میں آرہا ہوں۔" اسے تسلی دے کر میں فون بند کر کے گاڑی میں آبیٹھا۔ میرے بغیر اس کا گزارا نہیں ہوتا تھا اور شادی وہ اس فراز ویلے سے کرنا چاہتی تھی۔ خیر میں نے بھی سوچ لیا تھا۔ جب تک اس نوابزادے کا پورا بائیو ڈیٹا معلوم نہ کر لوں، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میری اچھی بھلی زندگی میں کسی تھرڈ کلاس ڈرامے کے بریکنگ ٹوئسٹ کی طرح آنے والے اس رقیب کا فیصلہ اب میرے ہی ہاتھوں ہونا تھا، یہ طے ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

علیزے آفس میں کام کرتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ میں اس کے آفس میں کام کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی کمپنی کے مالک کی بھتیجی تھی۔ شوقیہ جاب کرتی تھی۔ جیسے اس جیسے نوے فیصد اپر کلاس لڑکے لڑکیاں کیا کرتے تھے۔ ناکامیوں کے لیے اور اس کے لیے ان کے باپ، "تایا" چچا اور ماموں کے آفسز کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

اگرچہ وہ میری اسسٹنٹ تھی۔ مگر ہمارے درمیان رعب و تکلف والا کوئی رشتہ نہ تھا اور وجہ صاف ظاہر ہے۔ پھر وہ خود بھی بہت دوستانہ مزاج کی تھی اور بہت

جلد گھل مل جانے والوں میں سے تھی اور۔ میں تو ویسے بھی دن کا زیادہ حصہ اسی کے ساتھ گزارتا تھا۔ یوں مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کب اس کا دوست کم پہلی سہیلی بن گیا اور وہ مجھ سے ہر وہ بات کرنے لگی جو وہ اپنی کسی بھی لڑکی دوست سے کر سکتی تھی۔ غیبتیں، چغلیاں ادھر ادھر کی ڈھیر ساری گوسپ۔ پریشانی مجھے تب ہوئی جب اس کی گفتگو میں کسی برائن کا تذکرہ تواتر سے ہونے لگا۔ برائن نے یہ کیا، برائن نے وہ کیا۔"

براؤن ایسا ہے' براؤن ویسا ہے' ایک بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس سے پوچھا تھا۔ اسے اپنے لیے کیسا لڑکا چاہیے؟

"ٹال۔۔۔ ڈارک اینڈ ہینڈسم۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا اور میں اندر سے بجھ سا گیا۔ یعنی وہ میرے منہ پر مجھے ریجیکٹ کر رہی تھی۔ کیونکہ نہ تو میں اتنا ٹال تھا اور نہ اتنا ڈارک' خالی خولی ہینڈسم سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ڈھیٹ بن کے دوبارہ پوچھا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا۔ ٹال اور ڈارک سے کم پر معاملہ طے نہیں ہو سکتا۔" میرا انداز اس سیلز مین جیسا تھا جو کسی گاہک کو اس کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی کی چیز خریدنے پر مجبور کر رہا ہو۔

"بالکل نہیں۔۔۔ اگر مجھے براؤن کا را نہیں مل سکتا تو کم از کم براؤن ارا جیسا تو کوئی ہو۔" اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ ہالہ بھی ان پاگل اور سر پھری لڑکیوں میں سے ایک ہے جو کسی بھی انٹرنیشنل اسٹار کو اپنا آئیڈیل بنا لیتی ہیں اور پھر اسی طرح کی بے وقوفیاں کرتی ہیں جو ہالہ کر رہی تھی۔ وہ براؤن جو کوئی بھی تھا اسے میں نے بس ایک پرائی نام سے ملا تھا اور ہالہ صرف اس کے نام پر ہی ریجیکٹ کی اور میں جو اس کی محبت میں کرہ مکرل بھی بننے کو تیار تھا۔ صرف دیکھتا رہ گیا۔

ان کا یہ تعلق بہت تیزی سے آگے بڑھا تھا اور یہ دونوں فیس بک کے علاوہ فیس ٹو فیس بھی ملنے لگے تھے اور ہر ملاقات کا احوال اپنی جزئیات سمیت میرے علم میں بھی بنا کسی تعطل کے آتا رہا۔ اس کے بیان کردہ

اس براؤن کی باتوں اور حرکتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ فلرٹ اور فراڈ شخص ہے۔ مگر ہالہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ میرے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ہالہ اتنی بھولی اور بے وقوف لڑکی تھی کہ اسے کوئی بھی آسانی سے دھوکا دے سکتا تھا۔ یہ میری ہی قسمت تھی کہ جذبے کھرے اور نیت صاف رکھنے کے باوجود میں اسے اپنے سچے پیار کی قدر

بلکہ خبر بھی نہیں کروا لیا تھا اور اب تو بات ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔

مجھے جلد ہی کچھ کرنا تھا' مگر کیسے؟ پہلے میں اس سوال کا جواب ڈھونڈ لیتا۔۔۔ پھر ہالہ کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ یہ خالصتاً" فلمی ولنوں والی بڑھک تھی' مگر میرے ارادوں کی مضبوطی ظاہر کرنے کے لیے بہترین تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! یہ کیا ہے؟" اسے دیکھ کر اگر میں اچھل نہیں پڑا تو یہ میرے ضبط کی اعلا ترین مثال تھی۔

"موبائل ہے۔" انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دے کر ٹیبل سے چائے کے برتن سمیٹنے شروع کر دیے۔

"یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ مگر اتنا زیادہ۔۔۔" اسے دیکھ دیکھ کر میرا بلڈ پریشر خون بلند ہونے لگا۔

"ہاں۔۔۔ اس میں پیسے ڈالو کال بھی شامل ہے۔" بنا پلٹے ہی جواب دے کر وہ کچن کی سمت بڑھ گئیں۔

"مگر کیوں۔۔۔ پچھلے ماہ تو بل جمع کروایا تھا نا؟" میں بھی اٹھ کر ان کے پیچھے چلا آیا۔

"اف فاخر۔۔۔ کتنی جلدی باتیں بھول جاتے ہو تم۔ پچھلے ماہ کی بات ہے۔ پچھلے سال کی تو نہیں' جب ولید بل کے پیسوں کے ساتھ ساتھ اپنا موبائل بھی لٹا کر گھر آگیا تھا۔"

انہوں نے میری یادداشت پر ماتم کرتے ہوئے مجھے یاد دلایا۔ میں ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ واقعی میں کیسے بھول گیا۔ جب پیسوں اور موبائل پر لعنت بھیجتے ہوئے ہم نے ولید کے صحیح سلامت آنے پر شکر ادا کیا تھا۔ جبکہ ولید کئی دن اداس رہا تھا۔ اپنے مہنگے موبائل فون کے لیے جو اس کی تیسویں سالگرہ پر میں نے اسے گفٹ کیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی میں اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ صبح آفس جاتے ہوئے جمع کروا دوں گا۔" میں

نے ڈوبتے دل سے ایک نگاہ اس رقم پر ڈالی۔ بالہ کی برتھ ڈے آنے والی تھی اور میں اسے کوئی اچھا اور قیمتی گفٹ دینے کا سوچ رہا تھا۔ مگر اب لگ رہا تھا' کسی سستے گفٹ پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ پتا نہیں وہ بیچاری اس کا بچہ اسے کیا دے گا اور کچھ دے گا بھی کہ نہیں۔

"فاخر!" امی کی آواز نے مجھے چونکایا۔ "آج کل ولید کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں۔ کیا ہوا اسے؟" میں حیران ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگا۔

"اسے کیا ہونا ہے۔ اسے تو بلکہ اور بھی ڈھیل مل گئی ہے۔ جب سے اس کا موبائل چھنا ہے۔ میں تو عاجز آگئی ہوں۔ یوں لگ رہا ہے۔ جیسے اسے اسی موقع کی تلاش تھی۔ سارا سارا دن آوارہ گردیاں کرتا پھرتا ہے۔ صبح کا گیا رات کو شکل دکھاتا ہے۔ موبائل ہے نہیں' ناکہ کوئی خیر خبر ہی رکھ سکوں۔ کتنی بار کہا تم سے۔ اسے کوئی سستا سا فون دلا دو مگر نہیں۔" وہ پھر سابقہ لہجے بولتی چلی گئیں۔

"امی! آپ بھول رہی ہیں۔ میں کئی بار اسے کہہ چکا ہوں۔ مگر اسے اسمارٹ فون چاہیے' سستا والا نہیں۔ دوستوں میں بیٹھ کر شو آف کرنے کے لیے وہ میری جیب کا کباڑا کر رہا ہے۔ مگر ابھی دنوں میں ایسا خرچا برداشت کرنے کا ابھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے چاہیے تو میرا فون۔ لے لے۔ تین' چار ماہ بعد میں اس کی پسند کا سیل فون لے دوں گا۔"

مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی غصہ آگیا۔ اگرچہ میں جانتا تھا' وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ کچھ دن پہلے ہی اس نے کہا تھا۔ گھر والوں کی پل پل کی روک ٹوک سے دور رہتا ہے تو موبائل فون سے دور رہو۔

"خیر۔ آج اسے آنے دیں۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔" انہیں تسلی دے کر میں لاؤنج میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ولید کی آمد ہوئی۔

"ہائے برو۔ آج تو بڑی جلدی گھر آگئے۔"

دروازے اور صوفے کا درمیانی فاصلہ ایک جست میں پھلانگ کر وہ میرے قریب آبیٹھا۔ جو ابھی کا ہونے والا تھا۔ مگر حرکتیں سولہ' سترہ سال کے کسی ٹین ایجر سے کم نہیں تھیں۔ اس کے پاس سے اٹھتی بل فریب سی مہک نے میرے اندر تک تازگی کی لہر دوڑا دی۔

"یہ بات تو مجھے تم سے پوچھنی چاہیے۔ کہاں ہوتے ہو سارا سارا دن۔ فون بھی نہیں رکھتے اور یہ پرفیوم۔ کیا پوری بوتل انڈیل لی تھی خود پر۔" یہ خوشبو مجھے حقیقتاً" اچھی لگی تھی۔ اسی لیے ایک گہری سانس لے کر دوبارہ سانسوں میں اتاری۔

"ہاں۔ واقعی۔ پوری نہیں تو آدھی تو ضرور ہی انڈیلی۔ گفٹ دوست کی تھی نا۔ اپنی ہوتی تو صرف چھڑک کر کام چلاتا۔ آپ کو اچھی لگی کیا۔ بتائیں ناں؟" اس نے جس سادگی سے پوچھا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"تم اسی قابل ہوتے تو میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوتا۔" اس بھونڈے مذاق پر میرا جی چاہا میں اسے ناک آؤٹ کر دوں۔ اس کا بے اختیار سا قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاں۔ تیرے بیٹے کو نوکری مل گئی ہے۔ اب تجھے کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ماں کھلے بیٹے ڈائیلاگ سے وہ میرا جی مزید جلا گیا۔

"بھائی! میں نے کب کہا کہ میں کسی شاپ سے لا کر دے رہا ہوں۔ میں نے تو عدیل سے لانے کی بات کی تھی۔" وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"ایک نمبر کا کمینہ اور ڈھیٹ انسان ہے تو۔ کیسے دوست ہیں تیرے جو تجھے اتنی بے دردی سے اپنی چیزیں برباد کرنے دیتے ہیں۔" میں اسے گھور رہا تھا۔

"آپ ہوں گے اپنی چیزوں کے معاملے میں کنجوس۔ ہم دوستوں میں کوئی تیرا' میرا نہیں ہے۔ سنا نہیں آپ نے۔ پکی یاری سب پہ بھاری کنجوں میں حساب کیسا۔" شرارت سے مسکراتے ہوئے اس نے دونوں بازو پھیلا کر انگڑائی لی۔

"تو ایسا کرو۔ اپنے ان ہی دوستوں میں سے کسی کے

موبائل پر امی کو اپنے آنے جانے کی اطلاع بھی دے دیا کرو۔ وہ پریشان ہوتی رہتی ہیں۔ "تمہیں کوئی شرم ہے یا نہیں۔" ذمہ داری تو بڑی بات تھی۔ وہ تو سنجیدگی کو بھی پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔

"آپ نے کبھی غور کیا ہے بھائی۔ پرانے زمانے کے لوگ اتنے بڑے بڑے کام کیسے کر گئے؟" اس نے جس انداز میں پوچھا تھا میں حیران ہو گیا۔

"کیا مطلب؟"

"کیونکہ اس زمانے میں موبائل نہیں تھا۔ آج کل کے نوجوانوں کو تو موبائل سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں وہ کیا خاک اپنا حصہ ڈالیں گے۔"

"کیا بات ہے۔ پچھلے ایک مہینے سے تو تو بھی اپنے موبائل سے فارغ ہی ہے نا۔ کون سا کشمیر آزاد کرا لیا تو نے۔" میں سنگ اٹھا اس کی بے تکی بات پر۔ "دیکھ ولید۔ بہت ہو گئی تیری مسخری۔ میرا موبائل اٹھا اور اسے اپنے پاس رکھ۔"

"واہ بھائی ہو تو ایسا۔ مگر ایک مسئلہ ہے نا آپ۔ اس پر آپ کے فرینڈز اور خاص الخاص فرینڈز کے فون بھی آئیں گے تو میں ان کا کیا کروں گا۔" وہ بھولپن سے پوچھنے لگا۔

"کمینے۔ اس میں اپنی سم رکھ۔" میں نے دانت پیسے۔

"مگر میری سم تو موبائل کے ساتھ ہی گئی۔ خیر آپ وہ سب چھوڑیں۔ مجھے چار ہزار دیں۔ میں خود ہی اپنے لیے کوئی سستا سا سیٹ خرید لیتا ہوں۔" کیا شان بے نیازی تھی۔ میں نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔

"چار ہزار اور سستا۔ آج کل چار ہزار میں اچھا خاصا فون آجاتا ہے۔"

"مگر مجھے چائنا مال نہیں چاہیے۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔

"کیوں۔ چائنا تو ہمارا بہترین دوست ہے اور تھوڑی دیر پہلے تو خود ہی تو کہہ رہا تھا۔ پکی یاری میں حساب کیسا۔ اگر عدیل اپنی الیکٹرونکس کی دکان چھوڑ کر مٹھائیوں کی دکان کھول لے تو کیا تو دس گلوں کے لیے تب بھی رمضان حلوائی کے پاس ہی جایا کرے گا۔" میں نے اس کی بات اسے لوٹائی تھی۔ اس کا منہ بن گیا۔

"بھائی! آپ کہاں کی بات کہاں لے کے جا رہے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ چار نہ سہی تین ہزار ہی دے دیجئے۔ میں اسی سے کام چلا لوں گا۔" میں بغور اسے دیکھنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا اسے واقعی پیسوں کی ضرورت تھی۔ جو وہ اس بہانے مجھ سے نکلوانا چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر اگلے چھ ماہ تک۔ تم دوبارہ مجھ سے موبائل کے لیے کسی رقم کی کوئی ڈیمانڈ نہیں کرو گے۔"

اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو الجھن ابھری پھر بے تابی سے بولا۔ "اور چھ ماہ بعد؟"

"ہماری نوکری لگ چکی ہوگی۔ پھر تم اپنی کمائی سے اپنے لیے جیسے چاہو فونز خریدو۔"

"تو یوں کہیے نا۔ مجھے اپنی ساری زندگی اسی موبائل کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔" بے دلی سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تجھ جیسا ڈھیٹ انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" والٹ نکالتے ہوئے میں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"کیا خیال ہے۔ گنیز بک میں نام آسکتا ہے۔" جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے وہ ذرا آگے کو جھکا۔

"تیرا نہیں میرا آنا چاہیے جو تجھے برداشت کرتا ہوں۔" تپ کر کہتے ہوئے میں نے ہزار ہزار کے چار نوٹ اس کی طرف پھینکے۔ وہ حیران ہوا۔

"رکھ لے کیا یاد کرے گا تو بھی۔" میرے یہ کہتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"واہ بھائی میرے۔ جگ جگ جیو۔" نوٹوں کو جیب میں ٹھونستے ہوئے اس نے پرجوش ہو کر نعرہ

لگایا۔

"شام تک تیرے پاس موبائل آجانا چاہیے۔" میں نے لتے جاتے دیکھ کر ہانک لگائی۔

"بے فکر رہیں' ایسا ہی ہوگا۔" وہ بڑی جلدی میں لگا تھا۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔

وہ حد سے زیادہ کھلنڈرا تھا۔ کچھ اس نے طبیعت ایسی پائی تھی۔ کچھ میری بے جا ڈھیل نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ پھر اس کی یہ عمر فکریں اور ذمہ داریاں اٹھانے والی تھی بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عمر میں جو کچھ میں نے سہا تھا وہی سب ویسا ہی وہ بھی برداشت کرے۔ بابا کی وفات کے بعد بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میں نے وقت سے پہلے ہی بہت سی ذمہ داریاں اور پریشانیاں اپنے کاندھوں پر لے لی تھیں۔ میری تو مجبوری تھی مگر ولید کا تو بڑا بھائی موجود تھا اور ویسے بھی یہ کچھ ہی عرصے کی بات تھی۔ اس کا ماسٹرز کمپلیٹ ہو جاتا تو میں اپنے ہی آفس میں اس کی جاب کا بندوبست کرنے والا تھا اور یہ میں نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جو پوسٹ میرے پاس تھی وہ میں اپنے بھائی کو نہ پہنچاتا تو اور کسے پہنچاتا۔

☆ ☆ ☆

"میں اندر آجاؤں؟" وہ تشریف اندر گھس کر اجازت مانگ رہی تھی۔ میں نے فائل بند کر کے اس کی سمت دیکھا۔

"تم اندر آچکی ہو۔"

"ہاں۔ تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اجازت مانگ کر آیا جائے یا آکر اجازت مانگی جائے۔" چکنے فرش پر اس کی ہیل کی ٹک ٹک نے میرے دماغ پر ہتھوڑے برسائے۔ ایک یہی چیز تھی اس کی جس سے میں بے زاری کی حد تک چڑتا تھا۔ اچھی خاصی قد و قامت رکھنے کے باوجود اسے نجانے ہیل والی سینڈل پہننے کا کیا خبط تھا۔

"تمہارے چاچو کا آفس نہ ہوتا تو تمہیں پتا چل جاتا کہ اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے اور تم سے کتنی بار کہا ہے یہ ہیل والے جوتے پہن کر آفس مت آیا کرو۔" میں بھی کبھی اسے یہ جتانے پر مجبور ہو ہی جاتا تھا کہ میں اس کا باس ہوں۔ یہ الگ بات کہ وہ میری یہ بات ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کی طرح اڑا دیتی تھی۔

"چھوڑو بھی۔ زیادہ رعب مت جماؤ۔ اب کیا تم آفس میں بھی مجھ سے اسکول والے رولز فالو کرواؤ گے۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے وہ میرے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتا ہے۔ آج ڈیٹ کیا ہے۔" سبز رنگ کے سوٹ میں کھلی کھلی رنگت لیے وہ میز پر ذرا جھک کر چمکتی آنکھوں سے پوچھنے لگی میں الجھ گیا۔

"کوئی خاص تاریخ ہے؟" ایک نگاہ کیلنڈر پر ڈالتے ہوئے میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری برتھ ڈے تو نہیں ہے۔" اس کی ڈیٹ تک برتھ مجھے پتا تھی۔ اس کے باوجود میں نے احمق بن کر یہ پوچھ لیا۔

"نہیں بھئی۔ آج چودہ فروری ہے۔" اس کا بے تاب سا لہجہ چھلکا تھا۔

"تو۔ کیا ہوتا ہے چودہ فروری کو؟ کہیں اس برائن کی برتھ ڈے تو نہیں؟" مجھے یکایک ہی خیال آیا تو میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"اف فاخر! کتنے فضول ہو تم۔" وہ جھنجلا گئی۔ "چودہ فروری مطلب ویلن ٹائن ڈے۔"

"اچھا۔ تو ویلن ٹائن ڈے چودہ فروری کو ہوتا ہے۔" میں نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

"تم مذاق کر رہے ہو نا؟" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"دراصل میں نے منائی نہیں کبھی۔" میں نے بے زاری سے کندھے اچکائے۔

"تمہاری کوئی ویلن ٹائن ہوگی تو تم یہ دن مناؤ گے نا۔" طنز سے کہتے ہوئے اس نے ابرو چڑھائے۔

"تم یہی بات کرنے کے لیے آئی تھیں؟"

"نہیں ___ بتانے کو تو کچھ اور تلی تھی۔ مگر کیا فائدہ ___ جب تمہیں اس بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے تو ___" جھلاہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم اپنی ٹیبل پر جاؤ اور مجھے بھی میرا کام کرنے دو۔ میں فارغ نہیں ہوں۔" دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے رکھائی سے کہا تو اس کے چہرے پر خفت چھا گئی۔

"ہمہ ___ تم انتہائی سڑیل مزاج آدمی ہو ___ تم دیکھنا ___ تمہیں کبھی کوئی لڑکی نہیں ملے گی۔" غصے سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تب ہی میری نظر اس گلاب پر پڑی۔

"کیا تم یہ پھول میرے لائی تھیں؟"

"نہیں ___" اس نے جلدی سے وہ پھول اٹھا لیا۔ گویا میں اسے جھپٹ ہی لیتا۔

"یہ مجھے برائن نے دیا ___ یو لو واشٹ ___ زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے ویلنٹائن ڈے وش کیا۔" اس کا جوش دیدنی تھا۔

"تو صرف یہ ایک پھول ___" میں اپنے لہجے کا استہزاء چھپا نہیں پایا۔

"ہاں تو ___ کیا پوری نرسری میرے نام کر دیتا۔ میرے لیے یہ ایک چھوٹی سی بات ہے۔ جو اس نے گھر کے باغیچے سے صرف اور صرف میرے لیے توڑ کر لایا۔" اترا کر کہتے ہوئے وہ اس بچے سے گلاب کو پوروں سے سہلانے لگی۔

"ہمارا آفس اس کے راستے میں پڑتا ہے ___ صبح ہی صبح میرے آنے سے بھی پہلے وہ یہ پھول لے کر آفس کے باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو حیران ہو گئی۔ اس نے پہلے سے مجھے کچھ بتایا بھی نہیں۔ ایک تو جب سے اس کا موبائل چھنا ہے 'یہ بڑی مصیبت ہو گئی ہے۔"

"کیا ___ کیا ___ کیا؟" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی ___ "اس کا موبائل چھن گیا ہے۔"

"ہاں ___ اسی وجہ سے تو ہم آج کل آن لائن چیٹ کرتے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ اس کا برتھ ڈے تو

ابھی بہت دور ہے۔ کیوں نہ آج کے دن کے بہانے میں اسے ایک اچھا سا موبائل گفٹ کر دوں۔" پُرسوچ لہجے میں کہتے ہوئے وہ تائید طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی اور میں سناٹے میں آ گیا۔

"ہالہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔" شرٹس' پرفیوم' گھڑی سے بات اب موبائل تک آ گئی تھی۔ میں بے یقینی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔ کیا ہم اپنے فرینڈز کو گفٹس نہیں دیتے۔ میں بھی اپنے فرینڈ کو یہ گفٹ دوں گی اوکے۔" دبے لہجے میں ایک کمزور سی دلیل دے ___ کر وہ مزید رکے بغیر باہر گئی۔ مبادا میں کچھ اور نہ کہہ دوں۔ میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ یہ بات اب حد سے بڑھ رہی تھی۔ مگر میں کیا کرتا۔ کیا صدیقی صاحب سے بات کرتا ___ نہیں ___ یہ تو نری حماقت ہوتی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیسے بچاؤں اس کمینے کا یہ نہایت بھولے سے ایک لڑکی سے مال سمیٹ رہا تھا۔

ایسے لڑکے تو بہت دیکھے تھے جو خوشی خوشی اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں لٹتے تھے مگر یہ ___ اس نے بے غیرتی کی انتہا کر دی تھی اور میری بے بسی کی انتہا تھی کہ میں اس کے لیے نت نئی گالیاں ایجاد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

"قاخر ___ تم نے کیا سوچا؟"

شام کی چائے امی کو لان میں لانے کا کہہ کر میں خود بھی باہر چلا آیا تھا اور اس وقت جب میں گلاب کے پودے کے پاس الجھا ہوا کھڑا تھا۔ امی نے آ کر جس طرح بات شروع کی۔ مجھے چونکنا ہی تھا۔

"صبح جب میں جا رہا تھا تو اس میں لاتعداد ادھ بند کلیاں تھیں۔ اب ایک بھی نہیں۔" میں ان کے سوال کا مقصد تو نہیں سمجھا مگر اپنی سوچ ضرور بتا دی۔ ان کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھری۔

"مجھے کیا پتا ___ کہاں گئیں کلیاں ___ میں کیا سارا

دن چوکیداری کرتی رہتی ہوں۔ تم مجھے میرے سوال کا جواب دو۔"

"کون سا سوال ہے۔؟" مجھے ان کی برہمی پر حیرانی ہوئی۔

"سبرین کے لیے تین اچھے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ سعید بھائی تو ایک کے بارے میں سنجیدہ بھی ہو گئے ہیں۔ آپا کو جلد از جلد جواب چاہیے۔ پہلے ہی تمہاری اس ٹال مٹول نے انہیں خاصا برگشتہ کر دیا ہے۔ ایسا نہ ہو وہ سبرین کی بات کہیں پکی کر دیں۔" ان کے لہجے میں اندیشے آسمائے۔ میں نے ایک نظر ان کے متفکر چہرے پر ڈالی۔

"تو کر دیں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک ڈال جھکائی۔ وہ بھی خالی۔ اف۔ کہاں گئیں وہ ساری کلیاں۔ میرا پارہ پھر سے چڑھنے لگا۔

"تو آخر۔ تمہیں شادی کرنی ہے یا نہیں۔" امی کو یقیناً میری بے نیازی پر غصہ آگیا تھا۔ "تیس برس کے ہو گئے ہو۔ کب تک کنوارے بیٹھو گے۔ اپنا نہیں تو میرا ہی کچھ خیال کر لو۔"

"کیا ہو گیا ہے امی۔ کر لوں گا شادی بھی۔ مگر ابھی نہیں۔ آمنہ خالہ کو جلدی ہے تو وہ جہاں چاہیں سبرین کا رشتہ طے کر سکتی ہیں۔ انہیں مزید انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ترجیحات صاف کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ ان کی آنکھوں میں تاسف و بے یقینی مجتمد ہو گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ پہلے دن سے میں آپ سے کہہ رہا ہوں' مجھے سبرین میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ مگر آپ مان ہی نہیں رہیں۔ الٹا خالہ کو بھی فضول میں آپ نے اتنا عرصہ امید دلائے رکھی۔ اب ان تک میرا انکار پہنچائیں گی تو انہیں کتنا برا لگے گا۔ یہ سب صرف آپ کی غلطی ہے۔" جھنجلا کر کہتے ہوئے میں کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ تو تم نے کون سا مجھے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہی کہتے رہے کہ ابھی شادی نہیں کرنی۔ ابھی شادی نہیں کرنی۔ اگر اسی وقت کہہ دیتے کہ سبرین سے ہی شادی نہیں کرنی تو میں کیوں انہیں لٹکائے رکھتی اور اب الزام میرے سر تھوپ رہے ہو۔" ملامت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے مجھے شرمندہ کرنے کی پوری کوشش کی۔

"تو ٹھیک ہے۔ بگڑا تو اب بھی کچھ نہیں۔ کون سا سبرین کی عمر نکل گئی ہے۔ کسی بھی اچھی جگہ رشتہ طے کر دیں' بات ختم۔" میں لمحہ بھر کو شرمندہ ہو کر پھر سے ڈھیٹ بن گیا۔

دراصل دو سال پہلے جب امی نے میرے سامنے سبرین کا نام لیا تو تب مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ تب تک میری زندگی میں نہیں تھی۔ آئی تو خیر اب بھی نہیں تھی۔ مگر میں اپنی سی کوشش تو کر رہا تھا۔ بس یہ برائے نام کا روڑا درمیان سے نکل جاتا۔

"تو تم کب کرو گے شادی۔ کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے تو مجھے بھی بتا دو۔"

میرے واضح انکار کے بعد تو انہیں یہی خیال آنا تھا۔ مگر میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ اب تو سوچ رہی ہوں۔ ولید کے لیے ہی لڑکی دیکھنا شروع کر دوں۔ میرا اکیلا پن تو دور ہو گا ہی۔ لوگوں کی زبانیں بھی بند ہو جائیں گی۔ جسے دیکھو ایک ہی سوال پوچھتا رہتا ہے۔ بہو کب لا رہی ہو۔ ارے میں تو گھر ہی لے آؤں' مگر بیٹا راضی تو ہو۔" ان کا لہجہ تاسف و ناگواری سے بھرپور تھا۔ میں مسکرا دیا۔

"ہاں۔ واقعی۔ یہ ٹھیک کہا آپ نے۔ ایسا کریں ولید کے لیے ہی لڑکی دیکھ لیں۔ مجھے جب شادی کرنی ہوگی میں خود آپ سے کہہ دوں گا' پرامس۔" میں نے ان کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کا موڈ بری طرح تک ہو چکا تھا۔ سو وہ زیادہ نہیں ٹھہریں اور میں حیران ہو کر سوچ رہا تھا۔ کیا ولید واقعی شادی کے قابل

ہو گیا ہے۔

✿ ✿ ✿

"بھائی پلیز۔ ذرا نیں اسپورٹس تو لگائیں۔ ریسلنگ شروع ہو گئی ہو گی۔" وہ صوفے کے پیچھے سے چھلانگ لگا کر دھم سے میرے برابر آبیٹھا میں اچھل پڑا۔

"ولید۔ حرکتیں ٹھیک کرو اپنی۔ تم بچے نہیں رہے۔" مجھے شدید غصہ آیا تھا۔ اتنے انہماک سے اپنے پسندیدہ اینکر کو اس حکومتی نمائندے کے بخیے ادھیڑتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مداخلت پر بی بھر کے بدمزا ہوا۔

"کس لیے تو ریسلنگ لگانے کا کہا ہے۔ سی این این لگانے کا نہیں کہا اور آپ کو بتا کیا ہے بالکل ہی قسم کے بور سیاسی ٹاک شوز دیکھ دیکھ کر۔ ان زبانی کلامی جھگڑوں سے اچھا ہے "حقیقی" والو نچ دیکھ لیں۔ آج بڑا زبردست میچ ہونے والا ہے۔ انڈی اور ڈینیل برائن کا۔"

"کس کا؟" میں یکدم ہی چونکا تھا۔ اس کا نام سن کر میرے کان تو کیا بال تک کھڑے ہو جاتے تھے۔

"ارے وہی۔ جسے دیکھ کر آپ نے کہا تھا کہ اس کی شکل آپ کے مینیجر سے ملتی ہے۔ ایسے ایک بات کہوں "آج آپ کے مینیجر کو میں نے پھولوں کی دوکان میں دیکھا۔"

"تو تم وہاں کیا کر رہے تھے؟" مینیجر کی بات تو میرا دھیان کیا کھینچتی اس نے مجھے کھٹکا دیا۔

"میں۔" وہ قدرے بوکھلایا۔ "میں تو وہاں پھولوں کے ریٹ معلوم کرنے گیا تھا۔"

"کس خوشی میں۔ کسی دوست کی برتھ ڈے سجانی تھی یا پھر اپنے سہرے میں پھول لگانے تھے۔" گھور کر کہتے ہوئے میں اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے لگا۔

"وہ تو اویس نے کہا تھا۔ آپ کو پتا ہے ایک نمبر کا ڈھگاڑی ہے وہ۔ کہہ رہا تھا۔ آج کے دن ایک گلاب وہ دو تین ہزار سو کا ملتا ہے اور احمق لڑکے تیار بھی ہو جاتے ہیں۔ اتنے پیسے دینے کے لیے۔ تو میں وہی دیکھنے گیا تھا۔" وہ وضاحت دے کر معصوم سی شکل بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔ مگر میں معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔

"اچھا۔ تو میرے پیارے بودے کا وہ حشر تم نے کیا تھا۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے اپنے اشتعال پر قابو پایا۔

"ہاں۔ میرے منہ سے نکل گیا تھا اس کے سامنے کہ ہمارے گھر بڑے گلابوں والا پودا ہے۔ بس پھر وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے سارے گلاب بیچ ڈالے اور جانتے ہیں مجھے کیا دیا۔ صرف ایک جوس اور ایک برگر۔" اس نے منہ بناتے ہوئے شکایت کی تھی اور میرا سمجھ نہیں آ رہا تھا میں اس کے لیے کن گالیوں کا انتخاب کروں۔

"تم کمینے۔ گھٹیا ہوتے جا رہے ہو ولید۔" میں بمشکل بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"ہاں واقعی۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے آپ کے لیے ایک کلی چھوڑ دینی چاہیے تھی۔"

ندامت کا اظہار وہ بھی اس انداز میں۔ میرا پارہ تو چڑھنا ہی تھا۔ "شٹ اپ"

"آئم سوری۔" وہ لب مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔ اس وقت اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ولید۔ کسی لڑکی کا چکر تو نہیں ہے نا؟"

"توبہ کریں بھائی۔ میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔" وہ یوں بدکا جیسے میں نے پتا نہیں کیا کہہ دیا ہو۔

"تم مجھے کیسے لگتے ہو۔ جس دن تمہیں پتا چل گیا۔ شرم سے ڈوب مرو گے۔" ریموٹ اس کی طرف اچھالتا میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر تو کبھی مت بتائیے گا۔" میرے اٹھتے ہی اس نے فوراً چینل چینج کیا تھا۔

✿ ✿ ✿

میں اس وقت اپنے دوست کے ساتھ باہر ڈنر کر رہا تھا۔ جب مجھے ہالہ کا میسج موصول ہوا۔ میں نے اسی

وقت اسے کال ملائی تھی اور اس کی روتی ہوئی آواز سن کے بری طرح ڈسٹرب ہو گیا۔

"بالے"

"ہم اسپتال میں ہیں۔" اس کا لہجہ بھرایا۔

"کیوں۔ کیا ہوا سب خیریت تو ہے نا؟" پریشانی سے کہتے ہوئے میں ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

"پھپھو۔ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ ہم ابھی ابھی انہیں اسپتال لے کے آئے ہیں۔"

"ہم کون؟" میں الجھ گیا۔

"میں اور رشید۔ چاچو بھی یہاں نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں کیا کروں۔ اس لیے تمہیں میسج کر دیا۔" وہ رو پڑی۔

"تم نے بہت اچھا کیا۔ رونا بند کرو بالے۔ میں آ رہا ہوں۔" اسے تسلی دیتے ہوئے میں نے فون بند کر کے دوست سے معذرت کی اور اسی وقت وہاں سے نکل گیا۔ بے چاری بالے۔ اس کا تھینیا" اکیلے میں کسی ایسی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا ہو گا جب ہی وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ پھر صدیقی صاحب بھی کسی کام کے سلسلے میں دو دن کے لیے دبئی گئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی پریشانی میں اگر سب سے پہلے مجھے پکارا تھا تو میں کیسے لبیک کہتا ہوا نہ جاتا۔

میں وہاں پہنچا تو پتا چلا زیادہ خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس کی پھپھو کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ مگر اب وہ بہتر تھیں اور تھوڑی دیر میں انہیں چھٹی ملنے والی تھی۔ اس کا گھریلو ملازم اس کے ساتھ تھا۔ مگر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود انہیں گھر چھوڑنے جاؤں۔

"میں بہت زیادہ گھبرا گئی تھی ناحب۔ جب تمہیں میسج کیا تو یقین نہیں تھا کہ تم آ جاؤ گے۔"

سفید لباس میں ستا ہوا چہرہ لیے وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس وقت جب میں اس کے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کی پھپھو مجھ سے چند باتیں کرنے کے بعد ادویات کے زیر اثر سو گئی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"تم بالو اور میں نہ آؤں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" یہ

بات میں نے دل سے کہی تھی۔ مگر وہ اسے ایک ہمدرد دوست کی ہمدردی سمجھی اور اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پھپھو کہتی ہیں، میں کبھی کبھی بچوں کی طرح ری ایکٹ کر جاتی ہوں۔ مگر میں کیا کروں، ان کے معاملے میں میرا دل بہت کمزور ہے۔ میرا ان کے سوا اور ہے ہی کون ہے۔"

"میں بھی تو ہوں۔ تم بھروسا کر کے تو دیکھو۔" میں اظہار کے معاملے میں ہمیشہ سے اناڑی رہا تھا۔ اب بھی صرف سوچ کر رہ گیا۔ اس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھتے ہوئے مجھے اس لیے حقیقتاً "بہت دکھ ہوا تھا۔

اس کا تعلق ایک بروکن فیملی سے تھا۔ اس کی ماں نے اسے سات سال کی عمر میں ہی چھوڑ کر اس کے باپ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس کے باپ نے بیوی کی جدائی کا غم ایسے دل سے لگایا کہ اسے بھی بھول کر ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے نکل گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے وہیں کہیں شادی کر لی تھی۔ سو وہ بھی انہیں بھول بھال کر پھپھو اور چاچو کے ساتھ خوش رہنا پڑا۔ اس کے چاچو یعنی میرے باس صدیقی صاحب نے بھی ایک بار شادی کی تھی کیا کہ اس معاملے میں گویا یہ پورا خاندان ہی بدقسمت واقع ہوا تھا۔ کیونکہ جس عورت سے انہوں نے شادی کی تھی' جب اس نے اپنی اصلیت ظاہر کی' صدیقی صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس بلا سے چھٹکارا پانے کا کوئی باعزت طریقہ اختیار کرتے' وہ خود ہی ان کا قیمتی سامان سمیت کر انہیں کنگال بنا کے گئی۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس کے بعد صدیقی صاحب نے پھر کبھی کسی عورت پر بھروسا نہیں کیا اور دوبارہ شادی نہیں کی اور اس کی پھپھو۔ مجھے لگتا تھا بھائیوں کا حشر دیکھ کر انہوں نے توبہ کر لی تھی۔

"تمہاری پھپھو مجھے جانتی ہیں۔" مجھے حیرت ہوئی سن کر۔ "اسے اس موڈ سے نکالنے کی خاطر میں نے بات بدلی' وہ چونک گئی۔

"ہاں۔ میں ان سے تمہاری باتیں کرتی رہتی ہوں۔ چاچو بھی ذکر کرتے ہیں تمہارا۔ مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ میں تمہیں کسی دن گھر پر بلاؤں۔" وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔

"مگر تم نے تو مجھے آج تک نہیں بلایا۔" میں خفگی سے شکوہ کر بیٹھا۔

"اُف۔ مجھے یاد کہاں رہتا ہے۔" وہ ہلکا سا جھنجلائی۔

"ہاں۔ تمہیں برائن سے فرصت ملے تو کچھ اور یاد رہے۔" طنز سے کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر لگ رہا تھا' وہ اس وقت بھی کہیں اور ہی الجھی ہوئی تھی۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تم نے اپنی پھپھو کو برائن کے بارے میں بھی بتایا ہوگا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے۔

"بالکل نہیں۔ میں ابھی اس کے بارے میں کچھ [illegible] نہیں جانتی۔" اس نے فوراً ہی میرے خیال کی نفی کی۔

"تو میرے بارے میں کیا جانتی ہو۔" مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے خیال میں تو برائن اس کے لیے مجھ سے زیادہ تھا۔ اگر وہ واقعی اس کے ساتھ سیریس تھی تو اسے میرے بجائے برائن کے لیے راہ ہموار کرنی چاہیے تھی۔

"بہت کچھ جانتی ہوں۔ سب سے بڑھ کر چاچو تمہیں جانتے ہیں۔ تمہاری ایک پوزیشن ہے۔ تمہاری کریڈیبلٹی پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔"

اس نے جس طرح کہا' میں ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ یعنی وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔ میں نے دروازے کی سمت قدم بڑھائے تھے۔ وہ اٹھ کر میرے پیچھے آئی۔

"میں اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ مگر میں جب بھی اس کے گھر والوں سے ملنے کی بات کرتی ہوں' وہ ٹال دیتا ہے۔"

"وہ ہمیشہ ایسا ہی کرے گا۔" میں پھر سے سلگا۔ یہ ایک تضاد تو تھا ہمارے بیچ۔ وہ اپنے گھر والوں سے

میرے تذکرے تو کر سکتی تھی مگر اس نے کبھی میرے گھر والوں سے ملنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔

"تم نے اسے موبائل گفٹ کیا۔" ہم پورچ تک چلے آئے تھے کہ اچانک مجھے پوچھنا یاد آیا۔

"زیادہ مہنگا نہیں۔ بس ایک سمپل سا کیمرہ موبائل۔" دھیمے سے اعتراف کرتے ہوئے وہ مجھے مزید جچا گئی۔

"بس کرو۔ مجھے برانڈ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتنا بے شرم انسان ہے۔ لڑکی نے گفٹ دیا اور اس نے رکھ بھی لیا۔" میں نے ایک جھٹکے سے اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا تھا۔

"ایم سو سوری فاخر۔ بجائے تمہیں روکنے کے میں تو خود بھی اٹھ کر تمہارے ساتھ یہاں تک چلی آئی۔" آس پاس نظر دوڑاتے ہی وہ جیسے کسی نیند سے جاگی اور چہرے پر شرمندگی بکھر گئی۔

"ہاں۔ تم جیسا میزبان ہو تو مہمان کو سوکھے منہ ہی رخصت ہونا پڑتا ہے۔" میں نے ذرا رک کر اسے مزید شرمندہ کیا۔

"چلو چھوڑو نا۔ اندر چلو۔ میں تمہیں اپنے ہاتھ کی بنی اچھی سی چائے پلاتی ہوں۔" وہ اپنا تذبذب ہی کے اثرات زائل کرنے کی کوشش میں تھی۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"تمہارے ہاتھ کی چائے نہ ہوئی تو اچھی کیسے ہو سکتی ہے اور ویسے بھی نو بج رہے ہیں اور میں ناشتے سے پہلے ڈنر کرنے کا عادی ہوں۔" جتا کر کہتے ہوئے میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"او مائی گاڈ۔" اس کی آنکھیں پھیلی تھیں اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"تم کھانا کھا کر نہیں آئے تھے؟"

"نہیں۔ مگر اب گھر جا کر میں سب سے پہلا کام یہی کرنے والا ہوں۔ میرا خیال ہے تم صبح آفس تو نہیں آؤ گی۔ بلکہ میرا مشورہ ہے پرسوں بھی مت آنا۔ جب تک کہ تمہاری پھپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی۔ میں تمہارے بغیر کام چلا لوں گا۔ او کے خدا حافظ۔"

رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے جلدی جلدی میں الوداعی کلمات ادا کیے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ جب میں وہاں سے نکل کر مین روڈ پر آیا تو میرے موبائل کی تھرتھراہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ شاید ماہ رخ ہو۔ یہی سوچ کر میں نے سیل نکالا تھا مگر اسکرین پر کسی اجنبی نمبر سے کالنگ آ رہی تھی۔ کچھ الجھتے ہوئے میں نے کال ریسیو کر ہی لی۔

"بھائی! کہاں ہیں آپ؟" ولید کی پریشان سی آواز ابھری تھی۔

"اوہ۔ تو یہ تم ہو۔"

"بھائی! آپ کے بنائے گئے رولز کو فالو کرنے کی کوشش میں، میں نو بجے سے پہلے ہی گھر پر موجود ہوں۔ مگر آپ کہاں ہیں جناب۔" وہ آواز سے خاصا چڑا ہوا لگ رہا تھا اور وجہ بھی اس نے بیان کر دی۔ بے ساختہ میرے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"آ ہی رہا ہوں یار۔ اب فون پر کیا قصے سناؤں۔ گھر آ کر بتاتا ہوں۔ یہ بتاؤ تم نے موبائل خرید لیا؟" میں نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ ایک خاص ایڈوانس سسٹم کے تحت یہ ہم کسی بھی الیکٹریکل آلے میں چل جاتی ہے۔ اور اس آلے سے بات کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔"

"کیا۔" اس بے تکی بات پر تو مجھے چلانا ہی تھا۔

"آف کورس۔ خرید لیا ہے بھائی۔" وہ میرے ری ایکشن پر ہنسنے لگا۔

"اچھا۔ میں امی کو آپ کے آنے کا بتا دوں۔ تھوڑی دیر اور گزر گئی تو وہ آپ کی تلاش پر کسی ڈیٹیکٹو (سراغ رساں) کو ہائر کرنے والی تھیں۔" اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور میں نے اپنی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے؟" پلیٹ میں پڑے اس عجیب و غریب ملغوبے کو دیکھتے ہی میں نے حیران ہو کر امی کی سمت

دیکھا۔

"بینگن کا بھرتہ۔" وہ جواب دے کر سامنے والی کرسی پر آ بیٹھیں۔

"اف۔ یہ بن موسم کے بینگن کب تک چلتے رہیں گے۔"

"تو تم یہ بھنڈی کھا لو نا۔" امی نے دوسری پلیٹ سامنے کی۔

"ہاں۔ بھنڈی تو جیسے میری پسندیدہ ترین سبزی ہے۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں ویجیٹیرین بن گیا ہوں۔ کوئی ایک ڈش تو چکن یا مٹن کی بنا لیں۔" ایک تو ویسے ہی اتنی دیر ہو گئی تھی۔ بھوک سے میرے معدے میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔ کتنی بے تابی سے میں کھانے کی ٹیبل پر بیٹھا تھا اور اب۔

"کیا ہو گیا ہے فاخر۔ تم نے تو کھانے میں کبھی اتنے نخرے نہیں کیے اور تم تو آنے والے تھے بھی نہیں۔ یہ سبزی تو میں نے اپنے لیے بنائی تھی۔" انہیں میری بات پر غصہ آ گیا۔ "ایک فون کر دیتے تو بنا دیتی تمہارے لیے کچھ۔"

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ میں کیوں یہ بھول گیا تھا کہ میرا آج کا ڈنر تو ہادی کے ساتھ تھا۔ جسے کنفرم کرتے ہوئے میں خود چھوڑ کر آیا اور جس نے لیے پھوڑ کر گیا۔ اس نے سوچی کہاں کے۔ ہادی اس وقت سامنے صوفے پر بیٹھے اپنے فون سے چھیڑ چھاڑ کرتے ولید نے جیسے میری سوچ پڑھ لی۔

"کیوں بھائی۔ جس حسینہ کی مدد کو آپ سپرمین کی طرح اڑ کر گئے تھے۔ اس نے آپ کو چائے پانی نہیں پوچھا۔"

"چائے پانی پوچھا تھا۔ میرے لیے دسترخوان سجا کر نہیں بیٹھی تھی۔" اندر ہی اندر کھسیانے کے باوجود میں بظاہر بہت تپ کر بولا۔

"چلو۔ اب بس کرو۔ کھانا کھاؤ۔ رزق کی یوں ناقدری نہیں کرتے۔" امی نے ڈپٹا تھا۔ میں بے دلی سے لقمہ توڑنے لگا۔

"ولید۔ جا کر ذرا چائے کا پانی تو چڑھا دو۔" وہ گردن موڑ کر ولید سے مخاطب ہوئیں۔

"کس پر۔" وہ سر اٹھا کر معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"چولہے پر اور کس پر۔ کیا تم نے کبھی تندور میں چائے ابلتی دیکھی ہے۔" مجھے غصہ آ گیا۔

"اف۔ آپ لوگوں نے بالکل ہی مجھے چھوٹا بنا دیا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کسی ڈھابے میں نوکری کر لوں۔ تنخواہ تو ملے گی۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھر آئی۔

"چھوٹا۔" میں نے ایک طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی۔ اسی پل وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں چونک سا گیا۔ بلیک جینز اور گرے کلر کی شرٹ میں اس کی دراز قامت کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ گندمی رنگت پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ پیشانی پر بکھرے سیاہ بال مجھے ایک خوش گوار سے احساس نے آ گھیرا۔

"کمال ہے۔ میرا بھائی اتنا ہینڈسم ہے۔ میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔"

"فاخر۔ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟" امی کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"کھا چکا۔ بس۔" میں نے کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھایا۔

"اتنا سا۔" وہ حیرت سے بولیں۔ "کچھ اور بنا دوں؟" انہیں اب افسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں رہنے دیں۔ ناشتے میں کسر نکال لوں گا۔" میں اٹھ گیا۔ بھوک ویسے بھی ختم ہو چکی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر پڑے ولید کے موبائل کو دیکھنے کی خاطر میں اس طرف آیا۔ اسی وقت اس پر کوئی کال آنے لگی۔

"ولید۔ تمہارا فون ہے۔" میں نے باآواز بلند پکارا اور میری بات پوری ہونے سے بھی پہلے وہ ہاتھ میں چھلنی لیے جس طرح بھاگتا ہوا آیا تھا میں ہکا بکا رہ گیا۔

"آرام سے۔"

"میں کافی دیر سے اس کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔"

کھسیا کر کہتے ہوئے اس نے جھپٹ کر فون اٹھا لیا۔

"مس کال تھی۔" میں نے تصحیح کی۔ فون اب خاموش ہو چکا تھا۔ "تھوڑا انتظار تو کر لیتے یار۔ فون ہے بھی یا تمہارے کنگلے دوستوں کی مس کال ہے۔" طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کا جائزہ لیا۔ "یہ چار ہزار کا موبائل تو نہیں ہے ولید۔" مجھے حیرت بھی ہوئی اس کے جدید سے اسمارٹ فون کو دیکھ کر۔

"ہاں نہیں ہے مگر اس کی کوئی وارنٹی بھی نہیں ہے۔ دوست نے کچھ عرصہ یوز کیا۔ اب بیچنا چاہ رہا تھا تو میں نے خرید لیا۔" وضاحت دے کر وہ سیل فون کو جیب میں ڈال کر واپس کچن کی طرف پلٹ گیا تھا۔ میں الجھا ہوا سا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی! ایک منٹ رکیں۔" صبح مجھے آفس کے لیے تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ عجلت میں تیار ہو کر میں گاڑی تک آیا ہی تھا کہ ولید نے بھاگتے ہوئے مجھے روکا۔

"مجھے دس بجے ایک ضروری لیکچر اٹینڈ کرنا ہے۔ میری بائیک خراب ہو گئی ہے۔ آپ مجھے اپنے آفس تک چھوڑ دیں۔ آگے سے میں خود چلا جاؤں گا۔" ہانپتے ہوئے کہہ کر وہ اگلا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر گر سا گیا۔

"کیا ہوا تمہاری بائیک کو۔ کئی دنوں سے دکھائی نہیں دے رہی۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔ اسٹارٹنگ میں مسئلہ کر رہی تھی۔ میں نے ظفر کے حوالے کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا آج شام تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میں تمہیں یونیورسٹی ڈراپ کر دیتا مگر آج پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ تم چاہو تو گاڑی لے کر جا سکتے ہو۔" میں نے اسے آفر کی۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تھوڑا سا ہی تو راستہ ہے۔ میں مینج کر لوں گا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق بالیہ نہیں آئی تھی۔ امید ٹوٹنے تو برا لگتا ہے۔ کوئی توقع اس طرح سے پوری ہو جائے تو اور بھی برا لگتا ہے۔

پتا نہیں۔ میں کسی ٹین ایج عاشق کی طرح اس دلی چھپی خاموش محبت سے کیا حاصل کرنے کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ عمر کے جس حصے میں میں تھا وہاں ایسی یک طرفہ احمقانہ بچگانہ محبت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں سنجیدہ تھا۔ تمنائی تھا اور بھرپور کوشش کرنے کا قائل بھی۔ تو پھر وہ کیا چیز تھی جو مجھے روک رہی تھی۔ میں جو زبان تک نہیں لا پا رہا تھا میں جو بڑے بڑے مشکل مرحلوں میں فائٹ کر لیتا تھا اس لڑکی کے سامنے آ کر گنگ ہو جاتا تھا۔ میں کیوں یہ سوچتا تھا کہ وہ انکار ہی کرے گی۔ وہ اقرار بھی تو کر سکتی تھی۔

جانے کیسی خوش گمانی تھی یہ کہ اس دن اسی خیال کے زیر اثر میں بے اختیار اسے فون کر بیٹھا۔

"تم۔ فاخرہ یہ تم ہو ناں۔ کام کیسا چل رہا ہے میرے بغیر۔" اس نے کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ لہجہ بشاشت سے بھرپور تھا۔

"ٹھیک چل رہا ہے۔ تم بتاؤ۔ پھپھو کی طبیعت اب کیسی ہے؟" میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"اب تو بہتر ہیں اور... میرے چھٹی کرنے کا کوئی جواز تو نہیں تھا مگر تم نے کہا تھا مت آؤ اسی لیے نہیں آئی۔ کل تک آف ہے اور میری سالگرہ بھی ہے تو میں نے سوچا کچھ شاپنگ ہی کر لی جائے۔ ابھی میں یہاں ہوں شاپنگ مال میں۔"

اب مجھے اس کے لہجے کی تازگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ اور ایک لمحے کے لیے دل میں برھمی کی بڑی بھرپور لہر اٹھی۔

"میں نے تمہیں آفس نہ آنے کا کہا تھا کہ تم اپنی پھپھو کے ساتھ رہ سکو اس لیے نہیں کہ اپنی سالگرہ کی خریداری کے لیے بازاروں کی خاک چھانتی پھرو۔

حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی بھی۔"

میرے لہجے میں روکھائی آئی کہ وہ یکدم خاموش سی ہوگئی۔ یہی تو مسئلہ تھا جہاں کہیں اسے حال دل کہنے کا موقع آتا میرے اندر کا وہ درشت اور سخت گیر باس بیدار ہو جاتا۔

"مجھے تمہیں یہ بات بتانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ تم لمحوں میں جھاڑ کر رکھ دیتے ہو۔ خود ہی تم نے کہا میں نہ آؤں۔ اب میری مرضی۔ میں اپنے اس دن کا استعمال جیسے بھی کروں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"ہاں!" میں نے ایک گہری سانس کھینچی۔ "آئی کس کے ساتھ ہو؟"

"اکیلی آئی ہوں۔ مگر اس بات پر مجھے ڈانٹنے مت لگ جانا۔ تم آفس کی حد تک میرے باس ہو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ میرے سرپرست بننے کی کوشش مت کرو۔" میرے یوں پوچھنے پر وہ مزید چڑ گئی۔

"اچھا بس مجھے بتاؤ تم کہاں ہو۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ شام ہونے ہی والا تھا۔

"کیا!" اس کی آواز بلند ہوگئی۔ "تم آرہے ہو، تم کیوں آؤ گے؟"

"وہ آکر ہی بتاؤں گا۔" میں سنجیدہ ہوا تو وہ ایک پل کو چپ ہوگئی۔ کچھ قدرے توقف سے اس نے مجھے شاپنگ مال کا نام بتایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے؟" وہ حیرت بھری نظروں سے سامنے رکھے کیس کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا برتھ ڈے گفٹ۔" میں نے کہتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں اسے مال کے فوڈ کورٹ لے آیا تھا۔

"مگر میری سالگرہ تو کل ہے۔" اس نے ابھی تک اسے اٹھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

"کل تک وقت ہے۔ شاید میں تم سے نہ مل سکوں۔ اسی لیے سوچا۔ آج ہی تمہارا گفٹ دے دوں۔"

"تم مل سکتے تھے۔" اس نے کیس اٹھا کر کھولا۔ ایک پل کو امڈنے والی حیرت ستائش میں بدلی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "یہ بہت ایکسپینسیو ہے فاخر۔" اس نے اس خوبصورت بریسلٹ کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔

"نہیں۔ اتنا زیادہ بھی نہیں۔" یہ سچ تھا اسے خریدنے میں میری ایک مہینے کی سیلری چلی گئی تھی۔ اور اسے خرید کر میں نے آفس ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا تھا کیونکہ مجھے پتا تھا اس کی سالگرہ چھٹی والے دن آئی ہے۔ سوچا تھا پہلے ہی اسے دے دوں گا۔

"تم کوئی چھوٹا موٹا گفٹ دے دیتے۔ کیا میں اسے پہن لوں؟" کہتے ہوئے اس نے اچانک میری طرف دیکھا۔ میں مسکرا دیا۔ یعنی اس نے میرا تحفہ قبول کر لیا تھا۔

"ضرور۔"

"بہتر ہے تم ہی پہنا دو۔" اس نے بریسلٹ میری طرف کھسکا کر ہاتھ بھی میری طرف بڑھا دیا اور میں ساکت رہ گیا۔ وہ کبھی کبھی حیران کر دیتی تھی۔ بریسلٹ اٹھا کر اس کی کلائی میں ڈالتے ہوئے میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"برائن کو پتا ہے تمہاری سالگرہ کا؟" یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ میں اس کا نام لیتا مگر میں خود کو یاد دلانا چاہتا تھا کہ فاخر اپنی اوقات میں رہو۔

"ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا اس نے میری سالگرہ کے لیے کچھ الگ سے پلان کیا ہے۔" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ اپنی کلائی کا جائزہ لینے لگی۔

"کیا مطلب۔ کیا وہ تمہیں کہیں کھانے پینے کے لیے جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی امید سے تو نہیں۔ لے بھی گیا تو بل تم ہی سے ادا کروائے گا۔" ان کی سابقہ ملاقاتوں کی روشنی میں یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جلال سا ابھرا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے ایسا ہوا ہوگا ایک دو بار۔"

"ہر بار۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر یاد دلایا۔ "اور جب جب ایسا نہیں ہوا تب تب وہ لنچ اور ڈنر کے

لیے تھے۔ میں برنس روڈ کی فوڈ اسٹریٹ لے گیا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل سے ڈائریکٹ فوڈ اسٹریٹ امیزنگ۔" میں لاکھ خود کو قابو میں رکھتا اس لپکے کے نام پر تلخی امڈ امڈ پڑتی تھی۔

"ہاں۔ تو کیا ہوا۔ برنس روڈ کی نہاری اور تکہ کباب تو پورے پاکستان میں مشہور ہیں۔" وہ اپنی خجالت اسی طرح مٹا سکتی تھی۔ میں چند لمحے اس کے چہرے کی سرخی دیکھتا رہا۔

"تم نے اس سے اس کی پلاننگ نہیں پوچھی؟"

"نہیں۔ سرپرائز بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ ایسا کرے جس سے میں حیران رہ جاؤں۔" کچھ سوچ کر کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں ہنس پڑا۔

"وہ ہر بار ہی کچھ ایسا کرتا ہے جس سے تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی حیران رہ جاتا ہوں۔ ہاں وہ تمہیں تھڑے پر لے کے جا رہا ہے یا وزیر پر؟"

"کیا ہاں۔ مجھے نہیں پتہ۔" وہ قدرے جھنجلا گئی۔

"اور لے کے جائے گا کس پہ؟"

"کاش اس کے پاس ایک گاڑی ہوتی۔ ایک پرانا کھٹارا بائیک ہے تو وہ بھی خراب۔" وہ پر تاسف ہوئی تھی۔

"کمال ہے۔" استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے میں نے سر جھٹکا۔ "جیب کٹی ہوگی یا پھر چلتا ہوا بائیک خراب۔ کیا چیز ہے یہ بھی۔ کہیں اب تمہارا ارادہ اسے گاڑی دینے کا تو نہیں؟"

کہتے کہتے میری چھٹی حس کا الارم بڑے زوردار آواز میں بجا تھا۔ میں یک لخت خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" اس نے لہرا کے پکارا۔

"میں نے ابھی کیا کہا؟" ذہن تو مجھ سے کہہ رہا تھا دل اسے ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"تم نے کہا۔ میں اسے تحفے میں گاڑی دوں گی اور میں کہتی ہوں نہیں۔" وہ پر زور انداز میں بولی۔

"اس کا۔۔۔ اس کا نام کیا ہے یار!" میں اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ "اس کا پورا نام؟"

اس کی آنکھوں میں الجھن سمٹ آئی۔ "کاشف۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں۔" میں ایک دم ہی سرپٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ ہاں! تم ٹیکسی سے گھر چلی جانا۔ منڈے کو آفس میں ملاقات ہو گی۔" میں اس سے نگاہیں ملائے بغیر عجلت میں کہتا وہاں سے چلا آیا۔ پیچھے میں نے اس کی کئی پکاریں سنیں۔

☼ ☼ ☼

میں اس وقت ولید کے کمرے میں اس کے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ خود کو انتہائی احمق محسوس کر رہا تھا بلکہ کسی حد تک چور بھی حالانکہ میں پہلے بھی کئی بار اس کا کمپیوٹر استعمال کر چکا تھا مگر آج تو مجھے میری طبیعت ہی یہاں کھینچ لائی تھی۔ کسی کی ٹوہ لینا جو مجھے ہمیشہ گھٹیا ترین کام لگا کرتا تھا۔ آج میں خود وہی کر رہا تھا۔ مجھے کم گمان سا تھا کہ شاید وہ فیس بک سے لاگ آؤٹ نہ ہوا ہو۔ دل میں عجیب سی جذباتی طوفان لیے میں نے اس کا کمپیوٹر آن کیا تھا اور میری دھڑکنیں تھم تھم گئیں جب فیس بک آتے ہی میں نے اسے لاگ آن پایا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے اپنے آپ پر قابو پا کر اسکرین کی سمت دیکھا۔

اس کی آئی ڈی میرے سامنے کھلی پڑی تھی مگر ولید ہمدانی۔۔۔ ولید ہمدانی؟ جھنجلاہٹ ایک دم ہی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ یہ وہ چیز تو نہیں تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔

ہونٹ کاٹتے ہوئے میں خالی خالی نظروں سے کچھ دیر تو اسکرین کو دیکھتا رہا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے میسجز چیک کرنے شروع کیے۔ مگر کوئی سرا ہاتھ نہ لگا۔ اس کے وہی دوست۔۔۔ جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ مگر یہ کوئی بڑی بات تو نہ تھی۔ اگر اس نے جعلی نام سے کوئی آئی ڈی بنائی بھی تھی تو وہ اسے یوں کھلا چھوڑ کر کیوں جائے گا جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کی غیر موجودگی میں اس کا کمپیوٹر یوز کرتا ہوں۔

مایوسی سے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے میں نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے مجھے... یقیناً" یہ میرا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔" میں خود کو سمجھا رہا تھا۔

"مگر یہ سارے اتفاقات محض اتفاقات تو نہیں ہو سکتے۔" پھر سے آیا یہ خیال میرے ذہن و دل میں اضطراب بھر گیا۔

"کیا یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جن دنوں ولید کا موبائل چھنا' برائن بھی اسی صورت حال کا شکار تھا اور پھر چوہدری فروری کا ... کیا وہ بھی اسی یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہے جہاں ولید پڑھنے جاتا ہے۔ ولید کی منگنی منگنی شرٹس اس کے پاس سے اٹھنے والی دلفریب مہک ... جنہیں وہ دوستوں کی وریاولی قرار دیتا ہے۔ ولید کا محض چار ہزار میں خریدا جانے والا اتنا مہنگا سیل فون ... ٹھیک اسی دن جب ہالہ نے برائن کو سیل فون گفٹ کیا۔ ولید کی بائیک خراب ہوئی تو برائن کی بھی ہو گئی۔ ہالہ نے اس کا نام عاشر بتایا تھا۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے اس بات سے جب یہ سارے شواہد چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ ولید اور برائن ایک ہی شخص کے دو الگ نام ہیں۔ جس طرح وہ ہالہ کو بیوقوف بنا رہا ہے' وہ اسے اپنا نام بھی کچھ اور بتا سکتا ہے۔

میرا چھوٹا بھائی ... میرا پیارا چھوٹا بھائی ... جو کل تک میری نظر میں کسی فرشتے کی طرح معصوم تھا۔ کیا نکل آیا۔ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ اسی وقت میرا سیل بجا۔ اٹھا کر دیکھا تو ہالہ کال کر رہی تھی۔ میں جس طرح وہاں سے اٹھ کر آیا تھا' اسے پریشانی لاحق ہو گئی ہو گی پھر بھی میں نے اس کی کال ڈسکنکٹ کر دی اور ولید کے کمرے سے نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

"اف... آج تو میں بہت ہی تھک گیا۔" تھکے نڈھال سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ آ کر صوفے پر نیم دراز ہوا تھا۔ میں نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں مسل رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا گدھوں سے اظہار یکجہتی کے لیے آج کے دن کی بار برداری کا کام تم نے سنبھال لیا تھا۔" میرے الفاظ خود بخود تیکھے ہو گئے... وہ چونکا تھا۔

"کون ہوتا ہے آپ کو میری خبر ہے۔"

میں نے اپنی جھلاہٹ پر بمشکل قابو پایا۔ اس پر کسی بات کا اثر ہونا مشکل تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کسی فولادی ریوالور کو پتھر ماریں اور وہ اس سے ٹکرا کر واپس آپ کے منہ پر آ لگے۔

"کہیں کسی نے میری ویڈیو تو نہیں بنالی۔ عدیل کی گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے۔ اف عدیل کی گاڑی کو دھکا لگانا عدیل سمیت ... کسی گدھا گاڑی کو گدھے سمیت کھینچنے سے کم نہیں ہے اس کے بعد وہ گھنٹے کی ایکسرسائز کی لائن میں لگنا ... اگر وہاں سے گھر تک کا فاصلہ ذرا زیادہ ہوتا تو میں تین حرف بھیجتا عدیل پر بھی اور عدیل کی گاڑی پر بھی۔" اس نے بتا کر کے پوری کتھا سنائی۔

"تمہاری بائیک ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ تم تو کل کہہ رہے تھے کہ شام تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ہاں وہ..." وہ گڑبڑا سا گیا "وہ تو ٹھیک ہو گئی ہے۔ اویس کو کوئی کام تھا سو لے گیا..." وہ سر جھکائے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔

"بائیک اویس لے گیا تو ہالہ کو لینے کیسے جاؤ گے؟" یہ سوال میری نوک زبان پر مچل گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا مار مار کر اسے اس کی ساری ایکٹنگ بھلا دوں۔ وہ حیثیت ہی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

"امی کہاں ہیں؟" وہ جوتے اتار کر اٹھتے ہوئے بولا

"خالہ کی طرف گئی ہیں۔ شام تک گھر میں ہوں گی۔ اگر ایک گھنٹے میں تم انہیں لینے جاؤ گے۔" سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اس کا بدلتا واضح طور پر محسوس کیا۔

"میں... میں تو انہیں لینے نہیں جا رہا۔"

اس کے چہرے پر پریشانی پھیلی تھی۔ یہی تو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ آج ... سے تھا جنہیں ہالہ کی سالگرہ کا دن برائٹ سیدین ہالہ کے ساتھ گزارنے والا تھا تو ولید کیسے کہیں اور پروگرام بنا سکتا تھا۔

"کیوں نہیں جاسکتے۔ میری گاڑی لے جاؤ۔ وہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ ایک گھنٹے کے اندر واپسی ہو جائے گی۔"

"میں نہیں جاسکتا ناں بھائی! میرے سب دوست آج بیچ پر جانے والے ہیں۔ اور ایک گھنٹے میں فریش ہو کر مجھے بھی نکلنا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی بھائی ... پلیز آپ چلے جایئے۔"

اس کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔ میں اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی حد تک حقیقی تھے اور ظاہر ہے عین وقت پر کسی کی ڈیٹ کینسل ہونے لگے تو وہ اتنا ہی بوکھلائے گا جتنا کہ اس وقت ولید۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا "کیا یاد کرو گے تم بھی۔ چلا جاتا ہوں۔"

"تھینک یو بھائی۔" وہ مسکرایا تھا اور یقیناً اطمینان کی سانس بھی لی ہوگی۔ وہ اپنے کمرے کی سمت بڑھا تھا۔ شاید اب وہ ہالہ کو فون کر کے اپنے آنے کا بتائے گا۔ مگر وہ جائے گا کس پر؟ اس سوال کا جواب ہنوز اندھیرے میں تھا کہ یکایک ہی ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوندا۔ عدیل کی گاڑی ... ہاں یہ ممکن ہے بلکہ یقینی ہے اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔

میں نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ ہالہ اب تیار ہو رہی ہوگی۔ دل یکدم ہی بجھ سا گیا۔

وہ شام میری زندگی کی سب سے بری شام تھی۔ امی کو گھر لانے کے بعد میں کتنی ہی دیر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ ذہن و دل پر مستقل ایک ہی خیال حاوی تھا۔ ہر گھڑی صرف ایک ہی سوچ بے قرار کر رہی تھی۔ وہ اب کہاں ہوں گے۔ وہ اب کیا کر رہے ہوں گے۔ میرے تخیل نے ہالہ کے ساتھ اس ہیولے کی جگہ اب ولید کو دے دی تھی۔ شام سات بجے کے قریب میں گھر آیا تھا اور آتے ہی اپنے کمرے میں آکر پڑ گیا۔ مجھے نہیں پتا میری آنکھ کب لگی۔ مگر کھلی میرے سیل فون کی بجتی ٹون سے تھی۔ میں نے بنا سکرین کی طرف دیکھے کال ریسیو کی تھی۔

دوسری طرف سے سسکیاں ابھریں اور میں تعجب میں گھر گیا۔ ایک نظر سیل کو دیکھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔

"فاتح ... سیوی۔" ہالہ کا گلوگیر لہجہ مجھے اچھلنے پر مجبور کر گیا۔

"ہالہ ... تم کہاں ہو؟ کیا ہوا ہے؟" میں از حد بوکھلا گیا۔

"میں یہاں ہوں ..." آگے ... اس نے جو کچھ بھی کہا، میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

پھر مجھے نہیں پتا۔ میں کیسے اٹھا اپنی گاڑی تک آیا اور کتنی دیر میں متعلقہ تھانے پہنچا۔

میرا دل ... وہاں اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ میں وہاں کیا دیکھوں گا۔ مگر اتنا ضرور یقین تھا کہ جو بھی ہوگا وہ خوشگوار ہرگز نہیں ہو سکتا اور ہوا بھی یہی ... میرے بدترین اندیشے سچ ثابت ہوئے جب میں نے وہاں ولید کو اپنے دوستوں سمیت دیکھا اور ہالہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی رو رو کر آنکھیں سجا چکی تھی۔ مجھے معاملے کا کوئی آئیڈیا نہیں تھا مگر یہ صورت حال دیکھتے ہی میرا خود پر سے اختیار اٹھ گیا تھا اور میں نے ولید کے قریب جا کر پوری قوت سے اس کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔ وہ سکتے میں آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی باقی سب بھی۔

۞ ۞ ۞

اس دن ایس ایچ او سے معاملات طے کرتے کرتے اور تھانے سے نکلتے نکلتے ہمیں رات کے دس بج گئے تھے۔ ہالہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بجائے میں اپنے گھر لے آیا تھا۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ حسیات سن سی ہو رہی تھیں۔ اور اس وقت جب میں صوفے پر نڈھال سا بیٹھا تھا ولید میرے قدموں میں آ بیٹھا۔

"آئم سوری بھائی... آئم رئیلی ویری سوری۔" اس کا لہجہ ندامت سے چور تھا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "میں آپ کو بتانا چاہتا تھا مگر بتا نہیں پایا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ پتا نہیں آپ کا کیا ری ایکشن ہو۔ اس لیے بہانے بناتا رہا۔ یہ کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی۔"

میں نے ہالہ کی سمت دیکھا۔ ابھی اس کے پاس بیٹھی شاید موبائل سپورٹ دے رہی تھیں حالانکہ اسے دیکھ کر لگ نہیں رہا تھا کہ اسے اس کی کوئی ضرورت ہو۔ اس مشکل صورت حال سے نکلتے ہی اس کا کروفر لوٹ آیا تھا۔

"وہ ساری زندگی جیل میں سڑتا رہے گا۔ آپ دیکھیے گا۔ میں اس چیٹر کا جینا حرام کردوں گی۔"

"میں نے تھانے میں چوری کی رپورٹ بھی درج کروادی تھی۔ مگر مجھے امید نہیں تھی کہ بائیک مل بھی جائے گی شاید ایک دو دن بعد میں آپ کو بتا بھی دیتا کہ بائیک چوری ہوگئی ہے مگر آج اچانک ہی جب بازار کی طرف جاتے ہوئے ہماری گاڑی اس جنرل اسٹور پر رکی تو واپس اسی بائیک پر یہ دیکھا جس پر محترمہ اور ان کے دوست سوار تھے۔ نمبر پلیٹ تبدیل تھا مگر مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ میری ہی بائیک تھی۔ بس پھر ان سب نے کہا تھا "ہی گاڑی سے اتر کر اس لڑکے کو پیٹنا شروع کردیا۔ نجانے کس نے پولیس کو فون کیا اور یوں ہم سب تھانے پہنچ گئے۔" کہتے کہتے اس کا لہجہ دھیما ہوگیا۔

تو یہ تھا اس ساری کہانی کا لب لباب جس نے میرا چین و سکون غارت کررکھا تھا۔ آج شام کو جب میں تھانے جارہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صورت حال یہ رخ اختیار کرجائے گی۔ ولید کو تھپڑ مارنے کے پیچھے میری بھرپور ذہنی اذیت اور راستے بھر کا غصہ تھا وہ سمجھا کہ میں اس کے ہالہ کو چھیڑنے اور اس الزام میں پولیس کسٹڈی میں آنے پر آپے سے باہر ہوا۔ بے چارہ میرا بھولا بھائی اور اس لمحے میں جب روتی ہوئی ہالہ میرے کندھے سے آلگی تو وہ ہکا بکا رہ گیا تھا اور تب ہی میں نے حقیقی برائن کو بھی دیکھ لیا۔

سچ تو یہ تھا شکل و صورت میں وہ ولید کے پاسنگ بھی نہیں تھا اور اس وقت ان کے مارے گئے پنچوں کی بدولت تو اس کے چہرے کی حالت اور بھی بگڑ گئی تھی۔ وہ رو رو کے چلا چلا کے پولیس والوں کو بتانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ بائیک وہ اپنے دوست سے مانگ کر لایا تھا اور اسے بالکل نہیں پتا تھا کہ یہ چوری شدہ بائیک ہے مجھے تو خیر اس کی بات پر ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا اور پولیس والے... انہیں تو تلاش ہی ایسے کیسوں کی ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا وہ اب اس معاملے کو لمبا کھینچیں گے۔ وہ تو ہالہ کو بھی اسی گینگ کا حصہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے اگر میں بیچ میں نہ آتا۔ درمیان میں ہی دلوا کر میں ہالہ کو نکال تو لایا تھا مگر مجھے پتا تھا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ مجھے اس کے چاچو کو یہ بات بتانی ہی تھی اگرچہ ہالہ نہیں چاہتی تھی کہ انہیں اس کی اس حماقت کا پتا چلے۔

"مجھے فاخر نے کئی بار سمجھایا... کتنی ہی بار خبردار کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں بے وقوف پتا نہیں کیسے اس فراڈ کی باتوں میں آگئی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اتنا بڑا دھوکے باز نکلے گا۔ صرف اس کی وجہ سے آج میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئی۔ اگر فاخر نہ آتا تو پتا نہیں کیا ہوتا... فاخر ہی ہر مشکل وقت میں میری مدد کو آتا ہے۔ ہی از لائیک اے ہیرو۔" وہ ممنونیت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ولید نے معنی خیزی سے کھنکھار کر مجھے دیکھا۔

"تو اب کیا ہوگا؟"

"کیا؟" میں چونک گیا۔

"مجھے میری بائیک مل تو جائے گی ناں۔" وہ امید بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"ضروری نہیں ہے۔ زیادہ امید نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔ یہاں کسی گمشدہ چیز کا واپس ملنا ہفت اقلیم کی دولت ملنے سے کم نہیں۔" مگر میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ سچ تو یہ ہے میں ان لمحات میں اس کے سامنے بہت شرمندگی محسوس کررہا تھا۔ میں سوچتا تھا جب ہالہ کو پتا چلے گا کہ برائن میرا ہی بھائی ہے تو میں

اس سے نظریں کیسے ملاپاؤں گا۔ مگر اب جب مجھے براٹن کی حقیقت پتا چلی تھی میں ولید سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ ان پے در پے ہونے والے واقعات و اتفاقات نے مجھے اتنا الجھا دیا تھا کہ میں اپنے ہی بھائی پر شک کرنے لگا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آرہی تھی۔

"ویسے ایک بات کہوں۔۔۔ آپ کی یہ کولیگ مجھے عقل سے بالکل پیدل لگتی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑایا۔ میں نے ہالہ کی طرف دیکھا۔

"اٹھو ہالہ۔۔۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے اپنی جگہ چھوڑی۔ ابھی ایک اور سفر درپیش تھا۔

"تم چاہو کہ تو تمہیں بتاؤ گے نا؟" وہاں سے نکلتے ہی وہ مجھ سے یقین دہانی چاہنے لگی۔

"بالکل بتاؤں گا۔" میری تمام تر توجہ سامنے سڑک پر تھی۔

"لیکن کیوں فاخر؟" وہ تڑپ گئی۔

"پچی مت بنو ہالہ! یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تم سے چھپائی جائے۔ بعد میں کوئی مسئلہ ہو گیا تو کافی امکان ہے تو وہ معاملہ سنبھال تو سکیں گے۔" میں اس سارے قصے سے آگاہ ہونا ضروری ہے سمجھیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات پہ زور دیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے مرے ہوئے لہجے میں کہتے سر ہلا دیا۔ "تمہیں پتا ہے میں نے تمہارا بریسلٹ بھی کھو دیا۔" اداسی سے کہتے ہوئے وہ اپنی کلائی سہلا رہی تھی۔ میں نے چونک کر ایک نظر اس کے ہاتھ پر ڈالی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ میں تمہیں دوسرا دلادوں گا۔"

"کب۔۔۔؟" وہ اچھل پڑی۔

"تمہاری اگلی سالگرہ پر۔" میں اس کی بے تابی پر کچھ حیران سا ہو گیا۔

"یعنی اگلے سال۔" وہ میری بات سنتے ہی جھاگ کی مانند بیٹھ گئی۔

"نہیں اس سے پہلے بھی دے سکتا ہوں۔۔۔ اگر تم لینا چاہو تو۔" میں مسکراہٹ دباتے بولا۔ اس نے آنکھوں میں تعجب سمو کر مجھے دیکھا۔ "میں ضرور لینا چاہوں گی۔"

"کہیں تم میں براٹن کی روح تو حلول نہیں کر گئی؟" میں نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ نام مت لو اس کمینے کا میرے سامنے۔" وہ بری طرح بگڑ گئی۔ "اس بار مجھے واقعی جھٹکا لگا۔

"تم گالیاں بھی دینے لگی ہو۔ یہ واقعی اس کی سنگت کا اثر ہے۔"

"اب اگر تم نے اس کا ذکر کیا نا فاخر۔۔۔ تو میں اس چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔" وہ انگلی اٹھائے کہہ رہی تھی۔ میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"تمہیں تو وہ بہت پسند تھا۔"

"ہاں۔۔۔ میں اسی قابل ہوں کہ مجھے اس کے نام کا



طعنہ متا رہے۔" وہ تاسف سے کہتی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ "میں اس کی باتوں میں آگئی تھی۔ مجھے لگا وہی میرا رائٹ مین ہے۔ حالانکہ وہ شروع سے ہی اپنی اصلیت ظاہر کر چکا تھا۔ پتا نہیں میں اس شاک سے کیسے نکلوں گی۔ میں کیسے خود پر یقین کروں گی جب کہ مجھ پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میں اس دنیا کی سب سے بے وقوف لڑکی ہوں۔" وہ اضطرابی کیفیت میں ناخن کترنے لگی تھی۔ میرا دل پھر سے پگھلنے لگا۔

جو کچھ بھی ہوا اس میں ساری غلطی اس کی نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ رہنمائی اور تربیت سے محروم ایک بھولی بھالی لڑکی تھی اور یہی سارا مسئلہ تھا۔ اسے وہ ماحول نہیں ملا تھا جو ملنا چاہیے تھا۔ اس کے انکل اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ اور پھپھو صرف پھوپھی ہونے کا فرض نبھا رہی تھیں۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کوئی پابندی نہیں تھی کوئی اچھا برا بتانے والا نہیں تھا۔ اس کی شخصیت کی کی یا کمزوری اس باعث تھی کہ اسے مکمل فیملی اور متوازن ماحول نہیں ملا تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی بلاشبہ؟" نجانے خود بھی نہیں جانتا میرے منہ سے یہ سوال کیسے نکل گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں نے کچھ پوچھا ہے؟" اس کا گھر آگیا تھا میں نے گاڑی روک دی۔

"تم مذاق کر رہے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے اس کی حواس باختہ صورت دیکھی۔ "ٹھیک ہے۔ میں براڈ پٹ کی طرح نہیں دکھتا مگر۔ مجھے لگتا ہے میری شکل نکولس کیج سے تو ضرور ملتی ہے۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ بات ایک دن اسی نے مجھ سے کہی تھی۔

"تم مجھ جیسی اسٹوپڈ لڑکی سے شادی کرنا کیوں چاہو گے۔"

"تاکہ تمہیں تھوڑی چالاکی سکھا سکوں۔" اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"صرف اسی لیے۔" وہ کچھ مایوس سی ہو گئی۔

"باقی کی وجوہات۔ میں بعد میں روشنی ڈالوں گا۔ تم یہ بتاؤ میں تمہارے انکل سے بات کر لوں؟" میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا پھر بھی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر اگلے ہی پل دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی۔

"ارے۔ جواب تو دو۔" میں حیران رہ گیا۔ وہ گھوم کر میری کھڑکی کی طرف آگئی تھی۔

"میں بے وقوف ہی ٹھیک ہوں — میں نہیں چاہتی کہ تم صرف اس لیے آنے کی زحمت اٹھاؤ چاچو سے بات ضرور کرنا اگر تمہارے پاس مجھ سے شادی کرنے کی کوئی اور ساؤنڈ ریزن ہو تو۔"

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے جس سنجیدگی سے کہا تھا کچھ دیر حیران سی نظروں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"واہ کیا بات ہے۔ تم بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ جلد باز بھی ہو۔ مگر ٹھیک ہے۔ جس دن تمہارے چاچو سے بات کرنے آؤں گا۔ اپنے ساتھ ایک لسٹ بھی لیتا آؤں گا۔ ایک اچھا بھلا دماغ رکھنے والا ذی ہوش انسان بغیر کسی وجہ کے تو تم سے شادی کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔" میری بات سمجھ میں آتے ہی اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان بکھری اور دوسرے ہی پل وہ پلٹ گئی۔

رات کے سناٹے میں سڑک پر اس کی ہنسی کی کھنک کھنک کانچ پیدا کر رہی تھی۔ مگر پہلی بار اس سے چڑنے کے بجائے مجھے وہ کسی دلآویز موسیقی کی طرح اپنی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی لگی۔

اس کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا لی تھی۔ دوبارہ بہت جلد واپس آنے کے لیے۔ کیونکہ مجھے اس کی مسکراہٹ میں اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

رشکِ حبیبہ

ایک گھونٹ ساتھ اک سپ

وہ بھیگی جنوری کا بھیگا بھیگا دن تھا۔ گہرے بادلوں سے ڈھکے آسمان میں کہرے کے لحاف سے کبھی چھپتا کبھی جھانکتا نرم گرم سنہرا سورج زمین والوں کے لیے خاصا لطف آمیز تھا۔ پیڑ پودوں کی "نکھرتی" تروتازگی لشکتی ہریالی نے موسم کی خوشگوارت کا سامان کر رکھا تھا۔ لیکن موسم کی یہ خوشگوارت اس گھر کے مخصوص پرتپش ماحول پر رتی بھر بھی اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ اور ہوتی بھی کیوں؟۔ گھر کے ماحول کی گرماگرمی تو افراد خانہ کے ابلتے کھولتے مزاجوں کی مرہون منت تھی۔

گئے وقتوں کی مثل مشہور ہے کہ "دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں" مگر امید واثق کہ اس گھر کی دیواروں کے اگر منہ ہوتے بھی تو اب تک حس



سماعت سے محروم ہوگئے ہوتے کہ اتنا شور شرابا اور چیخ پکار سنتے رہنا یقیناً" حسِ سماعت کے لیے نقصان دہ ہے۔

یا وحشت بخیب! حسِ سماعت کی بات ہو رہی ہے تو لگے ہاتھوں تذکرہ ہو جائے اس گھر کی سربراہ عالیہ سطوت بیگم کا جن کی حسِ سماعت محرومی کی حد تک کمزور ہے اور ان کی یہ کمزوری ان کے لیے پریشانی کا سبب ہو تو ہو مگر ان کی بہوؤں کے لیے خاصی فائدہ مند ہے۔

مرزا استاد جماعت صاحب کو دارِ فانی سے کوچ کیے سال ہونے کو ہے۔ یوں تو باپ کی زندگی میں بھی دونوں سپوت پوری طرح ماں کے تابعدار عرفِ عام میں۔ ممی میں تھے مگر والد کے انتقال نے دونوں کو جذباتی حد تک ماں کا طرف دار کر دیا تھا۔ دونوں تھے بھی خالے "منفسہ دو" لوھریاں نے کچھ جھوٹی کچی بتائی۔۔۔ ادھر بیویوں کی جان عذاب میں آگئی۔

دونوں بہوئیں بالترتیب اپنی ازدواجی زندگی کی آٹھ اور سات بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ بڑی دلہن کے بھی دو بچے منی اور گڈو تھے تو چھوٹی دلہن نے بھی مقابلہ خوب نبھایا اور بجلی اور ببلو کو مرزا منزل کی رونق بڑھانے کو لے آئیں۔

مگر قابلِ ذکر عرصہ سسرال میں گزار لینے کے باوجود آج تک دونوں بہوؤں نے ہاں سسر یا شوہر کے سامنے چوں کرنے کی بھی اہمت نہ کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں سیدھی سادھی شریف النفس عورتیں تھیں۔

دونوں آپس میں ہی لڑ بھڑ کر اچھی طرح بھڑاس نکال لیا کرتی تھیں۔

یونہی کسی چھوٹی سی بات پر پہلے ایک نے اٹھا پٹخ کی۔۔۔ "تولیا" دوسری نے چیخ پکار مچائی۔

سطوت بیگم کا نچلا دھڑ مفلوج تھا۔ سو وہ سارا وقت یا تو ٹی وی پر سیاسی ڈراموں سے استفادہ کرتیں یا تسبیحات پر توجہ استغفار۔۔۔ باہر بہوؤں نے کون سی آفت اٹھا رکھی ہے انہیں خبر نہ ہوتی۔۔۔

آج بھی بھیلے بھیگے ٹھنڈے موسم سے بے نیاز جٹھانی جی گرم تندور جیسی گفتگو کر رہی تھیں۔

دونوں مرد حضرات روزگار کی دوڑ دھوپ میں نکل چکے تھے۔ منی، گڈو، بجلی اور ببلو۔۔۔ چاروں بچے اپنے اپنے باپوں کے ساتھ صبح سویرے ہی بیدار ہو گئے تھے۔ یوں بھی بچپن اور عہدِ کمسنی میں نیند کم ہی نزدیک آتی ہے۔

چاروں بچے برآمدے میں کھلونوں کا ڈھیر لیے بیٹھے تھے۔ منی البتہ اسکول کا بیگ لیے کھلونوں کے ڈھیر سے دور تھی۔ دیورانی جی کل ہی ہفتے بعد میکے سے سسرال آئی تھیں سو میاں کو روانہ کرنے کے بعد تھکن اتارنے کی غرض سے دوبارہ محو استراحت تھیں۔

تڑاخ، تڑاخ، تڑاخ!

یہ آواز دائیں طرف والے کچن سے سنائی دیں شاید ممکنہ خدشات کے پیش نظر دونوں بہوؤں کا کچن کچھ سال پہلے ساس محترمہ کی ایما پر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

جٹھانی صاحبہ نے شدید غصے میں وہ تین پلیٹیں دانستہ پٹخ کر توڑی تھیں جن کی پہلی تین پلیٹیں منی اور گڈو کے ہاتھوں وقتاً" فوقتاً" چکنا چور ہو چکی تھیں۔ اس خاصی نازیبا حرکت کا مقصد دن چڑھے تک دیورانی صاحبہ کے کمرے میں روپوشی پر برہمی ظاہر کرنا تھا۔

طریقہ کارگر رہا کہ دیورانی جی کے کمرے سے بھی بڑبڑاہٹ بلند ہوئی۔

صحن میں پھدکتی ننھی منی چڑیاں پھر اڑ گئیں۔ برآمدے میں کھلونوں سے کھیلتے بچے پہلے چونکے پھر سہم گئے۔ منی نے فکر بیگ میں دبک کر سر اٹھایا۔۔۔ بجلی پہلے ہی ڈری ڈری نظروں سے کچن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چار اور پانچ برس کی منی اور بجلی اتنی سمجھدار تو تھیں کہ ماحول کی کشیدگی بھانپ لیتیں۔ البتہ ببلو ان سب میں سب سے چھوٹا تھا اور جو ڈرنے کی چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی بوتلوں کا بند دہانہ ننھی انگلیوں سے کھولنے کی بے کار سعی میں مصروف

تھا۔ پتیلیں ٹوٹنے کی زوردار اور متواتر آوازوں سے سہم کر اِک دم حلق پھاڑ کر چلایا۔

جھوٹنگ کا طبل بج گیا۔

"بیلی! چپ کرواؤ اس کم بخت کو۔ رونے کے لیے اس منحوس کی نانی اماں کالی ہے۔ اس کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔" ماں کیا لوتجی چنگھاڑتی آواز پر بیلی فوراً آگے بڑھ کر گڈو کے قریب بیٹھے پپلو کو بہلانے لگی۔

"سکون نہیں اس گھر میں۔ ذرا جو دو گھڑی آرام کو مل جائے۔ صبح ہی صبح جاہلوں کی طرح حلق پھاڑ پھاڑ کے اپنے اگلے پچھلوں کو کوسنے دینا ضروری ہے۔" دیورانی جی کمرے سے نکل آئیں گویا کمر کس کے میدان میں اتر آئیں۔

"ہاں ہاں ہم جاہل ہی بھلے! ہفتہ ہفتہ بھر ماں کے گھر ٹھہر کر تمیز تہذیب کی کلاسیں لینا ہمیں گوارا ہے نہ ہم ان کے مجاز۔ ہونہہ! عیاشیاں کرنے کو مہینے میں دس پندرہ دن میکے جا کر مرنا ضروری ہے۔ پیچھے چاہے یہاں سے کوئی جیے یا مرے۔ پھر آ کر بھی 'مہارانی' اٹھ جانی اور پوری رات گھر توڑنے پڑی رہتی ہیں۔"

جیٹھانی جی کا میکہ لاہور میں تھا اسی وجہ سے وہ سال میں فقط دو مہینے ہی میکے قیام کر کے لوٹتیں۔ مگر دیورانی جی کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہ تھی خیر سے ان کے میاں بھی کنڈیم کے کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون شہر ہفتہ پندرہ دن کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اس دوران دیورانی جی بھی میکے کا قصد باندھ لیتیں۔ خوش قسمتی سے سطوت بیگم وضع داری اور دنیا داری کا بڑا لحاظ رکھتیں سو دونوں بہوؤں کو میکے کی طرف سے بھی پابند نہ کیا۔ وہ تو بڑی دلہن کا میکہ ہی دور تھا سو وہ دل مسوس کر مجبور ہو جاتیں۔

اس بار دیورانی جی کے میکے سدھارنے کے بعد جیٹھانی جی بیمار پڑ گئیں اور مصیبت یہ ہوئی کہ گھر کی دیکھ ریکھ سے لے کر ساس امی کی خدمت اور میاں جی کے ناز نخرے اٹھانا اور تین بچوں کے ہزاروں کام ــــ اور ایک تھی بے چاری جیٹھانی جی وہ بھی بیمار۔ گو اس بیماری میں بھی وہ جیتے مرتے ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہوتی رہیں کہ بیماری کم تھی اور ان کی ہاسگوائے زیادہ اندر کی کھولن نکالنے کو دیورانی جی آج ہی میسر آئی تھیں۔

"بڑی دلہن! چائے نہیں آئی ابھی تک۔" ساس امی کے کمرے سے صدا بلند ہوئی۔ بڑی بہو ہونے کی وجہ سے جیٹھانی جی پر ذمہ داری بھی زیادہ تھی۔

"اٹھا پٹخ سے فرصت ملے تو کوئی کام بھی ہو۔" دیورانی جی نے موقع سے وار کیا۔ جیٹھانی جی گویا توے پر جا بیٹھیں۔

"تمہیں تو لگی ہے پلنگ توڑنے سے فرصت۔" جواب دینے کی جلدی میں جیٹھانی جی نے چائے میں چینی کا لبالب چمچہ انڈیل دیا۔ دیورانی جی کو ان کا طعنہ ہضم نہ ہوا۔ غصے اشتعال کے وقت کی چھوٹی دیگچی سنک میں پٹخی جس میں ابھی کچھ سالن موجود تھا۔ جیٹھانی جی کو بھی آؤ دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ چمچ کے ساتھ ہی کپ زمین پر دے مارا جس میں ساس امی کے لیے چائے نکالنے لگی تھیں۔

چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کپ یہاں سے وہاں تک زمین پر بکھر گیا۔ پپلو کھیلنا ترک کر چکا تھا۔ اب ٹکر ٹکر کبھی دائیں بائیں کی آوازوں پر کان دھر رہا تھا۔

"تڑاخ" "تڑاخ" "تڑاخ" اب کے برتن ٹوٹنے کی آواز چھوٹی دلہن کے کچن سے برآمد ہوئی تھی۔

"میرے بھی امی ابا نے جہیز میں برتن دیے ہیں مجھے۔" ساتھ ہی دیورانی جی کی پاٹ دار آواز بھی بلند ہوئی۔

"برتن کپڑے لتے ضرور دیے۔ نہ دیے تو شریفانہ اطوار نہ دیے۔" ساس کو دوسرے کپ میں چائے پہنچا کر کمرے سے نکلتے ہوئے جیٹھانی جی نے حساب بے باق کیا۔ ساتھ کنارے پڑی جھاڑو اٹھائی اور کچن کے فرش پر بکھرے کانچ کے ٹکڑے سمیٹنے شروع کیے۔

"صبح سے طوفان اٹھا رکھا ہے شریفانہ اطوار سے بہرہ مند لوگوں نے۔ میں باز آئی ایسی شرافت سے۔" دیورانی جی لب واش روم میں میاں کی رنگین دغا دار

شرٹ دھونے کی غرض سے موجود تھیں۔ غلطی سے شرٹ بھگونے کے لیے سرف پانی میں حل کرنے کے بعد بلیچ انڈیل دی۔ سوئے بدحواسی احساس بھی نہ ہوا۔

"جیسے سے زبان دراز کروا لائی ہیں محترمہ! اب بھلا باتوں میں کون جیت سکے ان سے۔" جیٹھانی جی نے ناک کر وار کیا۔ کانچ اٹھاتے ہوئے بے احتیاطی سے کئی بار انگلیوں میں کانچ کے ٹکڑے پیوست ہوئے مگر غصے میں درد کا احساس نہ ہوا۔

"ہاں! تو میں نے کس کو زنجیریں ڈال رکھی ہیں مگر یہاں تو پہلے ہی ماشاء اللہ سے لوگوں کی زبانیں کاری وار کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ ضرورت ہی نہیں ہے دوبارہ سے رندہ لگانے کی۔" وہ چٹخیں اور دیورانی جی کے غضب کا نشانہ بنیں۔

ایک تھا تیتر' ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر

منی نے نئی یاد کی نظم پڑھنی شروع کی۔

جیٹھانی جی نے اب کانچ سمیٹ کر دیورانی محترمہ کو کرارا جواب دینا چاہا تو بات کچھ بن نہ پڑی۔ غصہ سر پہ سوار تھا۔ بھائی نہ دیا کر کریں تو کیا کریں۔ اسی دم گڈو کی چیخ بلند ہوئی۔ ببلو اور گڈو دونوں کھینچتے گتھم گتھا تھے۔

ایک تھا تیتر' ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر

منی کی آواز مزید بلند ہوئی۔

"گڈو! چھوڑو اسے۔" جیٹھانی جی پل کے پل بچوں کے سر پہ پہنچیں اور دھاڑ دھم دھموکے گڈو کی پشت پہ پڑے اور گڈو کا حلق اونچے سروں پہ کلام کرنے لگا۔

دیورانی صاحبہ کیوں پیچھے رہتیں۔ وہ بھی جائے وقوعہ پر پہنچیں پھر تھا ببلو کا گال اور کرارے کرارے چماٹ!

چٹاخ پٹاخ کی جانوں سے استقبال کرنے کے بعد دونوں بچے بلا تکلف "راگ بھیرویں" الاپنے لگے۔

بچوں کو پیٹ کر دونوں لڑاکوں کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑا۔ دونوں گہری گہری سانسیں لینے کے بعد حواسوں میں لوٹ آئیں تو دونوں معصوم بچوں کے سرخ سرخ چہرے اندرونی حالت سے دوچار کرنے لگے۔

مگر پھر اندرونی کیفیت پر چار حرف بھیج کر پہلے دیورانی جی نخوت سے منہ پھیرے کچن میں روپوش ہوئیں۔ پھر جیٹھانی جی نے بھی کمرے میں پناہ تلاشی۔

ایک تھا تیتر' ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر

منی کے لیے یہ سارے مناظر مانوس تھے اور وہ بچوں میں سب سے بڑی بھی تھی سو سارے ماحول سے بے نیاز اپنی نظم یاد کرنے میں مگن تھی۔

بلی البتہ خوف اور ترحم بھری نظروں سے ببلو اور گڈو کو دیکھ رہی تھی۔ جن کے چہرے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔

دیورانی جی اس بار مکمل حواسوں کے ساتھ کچن میں گئی تھیں۔ سو جلد ہی انہیں قیمتی اور عزیز پتیلوں کے ٹوٹنے کا احساس ہوا۔

جیٹھانی جی نے ہاتھ کی انگلیوں پر مرہم لگاتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔ پہلے ہی بے دھیانی میں کانچ ہاتھ سے اٹھانے کی تھیں۔ نتیجتاً" ہاتھ زخمی ہوئے اور پھر گڈو کی دھلائی کی تو کٹے ہوئے حصوں میں مزید چوٹ لگ گئی۔

لڑتے لڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دم

منی نے نظم کا اگلا حصہ رٹنا شروع کیا۔ بلی جو کافی دیر سے منی کو پل پل کر نظم رٹتے دیکھ رہی تھی۔ کسی سوچ میں غرق نظر آئی۔

دیورانی جی پہلے پتیلوں کے ٹوٹنے اور پھر رات کا سالن ضائع ہو جانے کا غم تمام کر کے اب جو غسل خانے کی طرف آئیں تو ان کا دل بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے کی ضد کرنے لگا۔

اور کیسے نہ کرتا...!

میاں جی کی پسندیدہ رنگین شرٹ پر پھیلتے اور پھیکے ہوتے رنگ کے بڑے بڑے دھبے بہار دکھا رہے تھے۔ کچھ دیر کی بلیچ میں بھیگے رہنے کے باعث شرٹ اپنی

اصل حالت سے محروم بدرنگ اور بے رونق ہو چکی تھی اب تو اس شرٹ پہ آٹھ آٹھ آنسو بہانے کے علاوہ کچھ چارہ نہ تھا۔

میاں جی کے عتاب کا سامنا کیسے ہوگا۔ دیورانی جی کی حالت پتلی ہونے لگی۔

ادھر جیٹھانی مرہم لگانے کے بعد کچن میں آگرا اپنے لیے چائے نکال رہی تھیں۔ زبان ضرور رک گئی تھی مگر دل ہی دل میں صلواتیں ابھی بھی جاری تھیں۔ اسی کیفیت میں چائے کا گھونٹ بھرا۔۔۔ سرعت سے گھونٹ بھری چائے واپس پیک کی مانند پچکاری بن کر باہر آئی۔

چائے نمکین تھی نا!

شومئی قسمت۔۔۔! ساس امی کو بھی چائے پہنچائی تھی۔ فوراً ادھر کا رخ کیا۔

"امی جی! وہ چائے۔۔۔" ان کی بات ساس جی غضبناک نظروں نے بھٹولوی۔ انہوں نے آنا" فانا" چائے کا کپ اٹھایا اور کمرے سے نکل آئیں۔

"میں ابھی دوسری بنا کر لاتی ہوں۔"

منمنا کر کہتے ہوئے بھی وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ خواہ کچھ بھی کرلیں اب رات میں میاں جی کی حاضری لگنی ہے اور ان کی "تعویذ پونگ" بھی یقینی ہے۔

ساس امی کا "ساس پنا" تو پہلے بھی دیکھ چکی تھیں۔

ایک تھا تیتر ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر
لڑتے لڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دم

دوسری چائے میں دھیان سے دودھ، پتی اور چینی ڈالتیں جیٹھانی جی اور روتی صورت بھیگی آنکھوں کے ساتھ صحن کے تار پہ بدرنگ شرٹ سوکھنے کو پھیلاتی دیورانی جی۔۔۔ دونوں نے لٹک لٹک کر نظم پڑھتی منی کی آواز سنی بے دھیانی سے۔

"منی! تیتر کی چونچ گم ہو گئی تو وہ پریشان ہوا ہوگا نا؟"

بیلی کی آنکھوں میں ۔۔۔

دکھ۔

"ہاں! ہوا تو ہوگا۔" منی نے لاپروائی سے کہہ کر پھر توجہ نظم پر مرکوز کی۔

ایک تھا تیتر ایک بٹیر

"پھر تو بٹیر بھی رویا ہوگا۔ اس کی بھی تو دم کا مسئلہ ہے نا۔" وہ پھر باوجہ پریشان ہوئی۔

"ہاں! وہ بھی رویا ہوگا۔" منی نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

لڑنے میں تھے دونوں شیر

"زیادہ درد کس کو ہوا ہوگا۔ تیتر کو یا بٹیر کو؟"

بیلی کے متواتر سوالات سے منی کی پڑھائی میں خلل ڈال رہی تھی۔

"دونوں کو برابر ہوگا۔" منی نے کچھ سوچ کر بتایا۔

لڑتے لڑتے ہو گئی گم

"دونوں آخر لڑتے کیوں تھے؟" بیلی نے ایک بار پھر اس کے ردھم میں رکاوٹ ڈالی۔

"گندے تھے نا۔" منی نے اس بار تڑخ کر کہا۔

"میری ٹیچر کہتی ہیں۔ گندے بچے جھگڑا کرتے ہیں یہ دونوں بھی گندے تھے۔" منی نے اپنی معلومات اس تک پہنچائی۔

ایک کی چونچ اور ایک کی دم

منی کی نظم پوری ہو گئی۔ اس نے کتاب بند کر دی مگر بیلی ابھی بھی الجھی ہوئی تھی۔

"منی۔۔۔!" اس نے کسی سوچ سے سر اٹھا کر منی کو پکارا تھا۔

"چھنی ماما اور نکی ماما بھی گندی ہیں کیا؟" دونوں مائیں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگئیں۔

"پتا نہیں! میں اپنی ٹیچر سے پوچھوں گی۔" منی نے متانت سے کہا اور کتابیں سمیٹ کر بیگ بند کرنے لگی۔

لیکن منی اور بیلی کے معصومانہ مکالمے نے دیورانی جی اور جیٹھانی جی کی بند عقل کا قفل ضرور کھول دیا۔

اور اگر آپ کی بند عقل کا قفل کھل گیا ہے تو بلاوجہ لڑنے جھگڑنے سے توبہ کرنے میں دیر مت کیجئے۔

حالانکہ نہیں ہے کچھ بھی آگے
پھر بھی میں قدم بڑھا رہا ہوں

جب سب نے بھلا دیا ہے اس کو
تب میں اسے یاد آ رہا ہوں

بے وجہ نہیں مری خوشی
اک عمر میں بولتا رہا ہوں

بھولا ہوا یاد آ رہا ہے
یاد آیا ہوا بھلا رہا ہوں

وعدہ تھا جسے نبھا رہا ہوں
ورنہ میں کہاں ترا رہا ہوں

مت روک ظفر کہ سوئے مقتل
میں اپنی خوشی سے جا رہا ہوں

صابر ظفر

راج ہنس

پہلے پہل جب شہر کو میں نے دیکھا تھا
شہر بھلا
راج ہنس کی صورت قدم بڑھاتا تھا
شبنم کے قطرے جب صبح کو گرتے تھے
راج ہنس کی خاطر
سچے موتی ارزاں کرتے تھے
بنگلے پیارے اپنی دنیا ساتھ لیے
وہ پیہم رقص میں رہتا تھا
چترکار اپنی تختی پر اس کا روپ سجاتے تھے
دور دیس سے آنے والے
اس کی ایک جھلک پانے کو
دن کی صورت رک جاتے تھے
اور اب ایسا قہر مچا ہے
زندہ رہنے کی کوشش میں
راج ہنس کو خون کے قطرے ہی ملتے ہیں

سحر انصاری



دلِ سودائی کو پیکار میں رکھ آئے ہیں
ہم کہانی کو بھی کردار میں رکھ آئے ہیں

وہ جو اک تیرے بچھڑنے کی گھڑی تھی اس کو
کب کا ہم عمرِ طلب گار میں رکھ آئے ہیں

وہ جو اک لمحۂ بحال سو محبت کا حاصل تیرا
اس کو بھی وقت کی رفتار میں رکھ آئے ہیں

کیسے پائے گی بقا رسم شناسائی کی
جب تعلق کو بھی بازار میں رکھ آئے ہیں

اک زمانہ ہے شریکِ رہِ منزل اب تو
عزم وہ جرأتِ انکار میں رکھ آئے ہیں

نثار ترابی

میں منتظر تھا میں سفر میں ہوں تجھے قربتوں کی خبر کہاں
ترے راستے کا پتہ نہیں اسے منزلوں کی خبر کہاں

مرے بے خبر! تجھے کیا خبر کہاں کون تجھ سے بچھڑ گیا
تجھے اپنی ذات عزیز ہے تجھے دوستوں کی خبر کہاں

تو عروج ہے میں زوال ہوں تو یقین ہے میں گمان ہوں
یہ ہمارا رشتہ اٹوٹ ہے ہمیں فاصلوں کی خبر کہاں

یونہی کٹ گئے مرے روز و شب تجھے کیا کہوں کیسے بتاؤں اب
ترے ہجر میں جو ملے مجھے تجھے ان دکھوں کی خبر کہاں

مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں مجھے حوصلہ ہی ملا نہیں
مرے مہرباں! تجھے بھلا مری خواہشوں کی خبر کہاں

سید علی سلمان

مسکراہٹیں

وجہ تعاقب

ٹام کار میں اپنی بیوی کے ساتھ سسرال جا رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے ایک خاتون ڈرائیور آرہی تھیں۔ انہوں نے اوور ٹیک کرنے کے لیے ہارن بجایا اور ٹام نے بڑی سعادت مندی سے انہیں راستہ دے دیا۔ وہ خاتون آگے نکل گئیں۔ لیکن آگے جاتے ہی خاتون نے اس حد تک اپنی کار ہلکی کرلی کہ مجبوراً ٹام کو آگے نکلنا پڑا۔ خاتون نے دوبارہ اسے اوور ٹیک کیا۔

یہ کھیل دیر تک چلتا رہا۔ پہلے وہ خاتون ٹام کو اوور ٹیک کرتیں' پھر کار ہلکی کرکے اسے اوور ٹیک کرنے کا موقع دیتیں۔ وہ انہیں اوور ٹیک کرلیتا تو ایک بار پھر ان پر اوور ٹیک کا بھوت سوار ہوجاتا۔ آنکھ مچولی کے اس کھیل کے بعد کسی حلوائی کی دکان کے آگے ٹریفک جام تھا۔ خاتون اور ٹام کو اپنی اپنی کاریں روکنا پڑیں۔ کار سے اتر کر وہ خاتون کے پاس گیا اور بڑے ادب سے کہا۔

"محترمہ! میں سمجھتا ہوں کہ میری ڈرائیونگ میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی' جس کی وجہ سے آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مسلسل اوور ٹیک کیوں کرتے رہے ہیں؟"

"اوہ۔" خاتون نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں اس سوئٹر کا نمونہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہی تھی' جو تمہاری بیوی نے پہن رکھا ہے اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ تمہیں اوور ٹیک کرا کے سوئٹر دیکھوں اور دوبارہ اپنے آپ کو اوور ٹیک کرا کے سوئٹر پر نظر ڈالوں۔"

کبریٰ شیراز۔ بہاول نگر

آخری خواہش

خاتون پر نزع طاری تھا۔ زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے اس نے پاس بیٹھے اپنے شوہر سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ جب میرا جنازہ قبرستان جارہا ہو تو تم پہلی گاڑی میں میرے بھائی کے ساتھ بیٹھو۔"

"یہ نا ممکن ہے۔" شوہر نے قدرے ناراضی سے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے بھائی سے سخت نفرت کرتا ہوں۔"

"مگر یہ میری آخری خواہش ہے جان۔ کیا تم یہ بھی نہیں کرسکتے میرے لیے۔" خاتون نے آخری ہچکیاں لیتے ہوئے کچھ افسردگی سے کہا۔

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو میں اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔" شوہر نے فرماں برداری سے کہا۔ "مگر سوچو ذرا۔ جنازے کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

ممتاز بیبی۔ ناظم آباد کراچی

سوچ

ایک خاتون کمبل کی دکان پر گئیں اور کمبل دیکھنے شروع کیے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ سیلز مین انہیں کمبل دکھا دکھا کر تھک گیا ہے تو انہوں نے جھینپی جھینپی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ اصل میں۔ میں نے یہ خریدنے نہیں ہیں۔ یہ تو میں یہ اپنی سہیلی کے لیے دیکھ رہی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں میڈم!" سیلز مین نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اس میں دلچسپی رکھتی ہیں تو میں یہ آخری کمبل بھی آپ کو کھول کر دکھا دیتا ہوں۔"

غزالہ شہناز۔ ہجرت کالونی

غلط فہمی

عدالت میں جج نے ایک گونگی عورت سے کہا۔
"تم نے حیرت انگیز بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ایک ڈاکو پر یوں پل پڑیں۔ زبردست۔"
"مجھے یہ پتا ہی کب تھا" عورت نے صفائی پیش کی۔ "میں تو یہ سمجھی تھی کہ میرا شوہر دیر سے گھر آیا ہے۔"

حنا شلیب۔ ملیر

امپورٹڈ جہاز

ایک جہاز سمندر پر سے گزرتے ہوئے فضا میں ہچکولے کھانے لگا۔ جس پر مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی اور انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اسی وقت اسپیکر پر کپتان کی آواز سنائی دی۔
"خواتین و حضرات۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک بہترین امپورٹڈ جہاز ہے۔ غیر ملکی ماہرین روزانہ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ بالکل مطمئن ہو کر سفر کریں۔ کھڑکی سے باہر نہایت خوب صورت نظارہ ہے۔ شام ہونے کو ہے۔ سورج کا سرخ گولا سمندر میں غروب ہو رہا ہے۔ لوگ رنگ برنگی کشتیوں میں سمندر کی سیر کر رہے ہیں۔ آپ ایک پیلے رنگ کی کشتی بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ میں اسی کشتی سے بول رہا ہوں۔"

نورین فیاض۔ پاپوش نگر

میرا نام

ایک ریٹائر پروفیسر صاحب کو ان کے دوست نے مذاق میں ایک مشروب پلا دیا۔ پروفیسر صاحب گھر جانے کو باہر نکلے تو راستہ بھول گئے۔ آدھی رات کو انہیں سڑک پر جھومتے دیکھ کر ایک کانسٹیبل ان کے پاس پہنچا اور نام دریافت کیا۔
"معلوم نہیں۔" پروفیسر صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔
"تمہیں اپنا نام بھی نہیں معلوم؟" کانسٹیبل کو شدید غصہ آیا تو پروفیسر صاحب ڈر گئے پھر اپنے تئیں عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔
"آپ ایسا کریں۔ شاہراہ نمبر چار سو پانچ پر جائیں۔ ہاؤس نمبر چار کی گھنٹی بجا کر پوچھیں ایڈورڈ گھر پر ہے؟ اگر جواب ملے۔ نہیں۔ تو سمجھ لیجیے گا کہ وہ میں ہوں۔"

نیرانیس۔ ناظم آباد

قیمت

تین آدمی چوری کی نیت سے ایک گھر میں داخل ہوئے۔ داخل ہونے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ یہ مشہور باکسر محمد علی کلے کا گھر ہے۔ یہ جان کر وہ چور تھر تھر کانپنے لگے۔ ایک بولا۔
"چپکے سے کھسک لو۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"
"ہائے۔ محمد علی مکے مار مار کر ہماری ہڈی پسلی توڑ دے گا۔" دوسرا کراہ کر بولا۔
"گھبراؤ نہیں یارو!" تیسرا چور باہمت انداز میں بولا۔ "میں محمد علی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ جب تک پچاس ہزار ایڈوانس نہ لے لے۔ ایک مکا بھی نہیں مارے گا۔"

افشاں فرقان۔ نئی حسن

ترقی کا سفر

"تم کس جرم میں یہاں آئے ہو؟" جیل میں ایک قیدی نے دوسرے سے پوچھا۔
"میں شروع سے ہی محنت کرنے کا سخت عادی تھا۔" دوسرے قیدی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کہ بالکل نیچے سے اپنی ترقی کا سفر شروع کروں۔ دراصل میں۔ جیلر بننا چاہتا تھا۔"

یاسمین ظفر۔ لاہور

اعتراف

آمنے سامنے سے آتی ہوئی ایک خاتون اور ایک صاحب کی گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ خاتون گاڑی سے اتر کر معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔

"غلطی میری تھی۔"

"نہیں غلطی میری ہے۔" وہ صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ سامنے سے آنے والی کار کو ایک خاتون چلا رہی ہیں۔ میں چاہتا تو جلدی سے اپنی گاڑی کچے میں اتار کر کسی درخت کے پیچھے چھپا لے سکتا تھا لیکن میں نے اپنی گاڑی کو سیدھا چلنے دیا۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی تھی۔"

فائزہ صلاح الدین۔ میٹرو ول

سوال

نیلام گھر میں طارق عزیز نے ایک نوجوان سے کہا۔

"آپ تمام مرحلے جیت چکے ہیں۔ اب صرف آخری سوال رہ گیا ہے۔ اگر آپ نے اس کا صحیح جواب دے دیا تو آپ انعام کے حق دار ہوں گے اور اگر جواب نہ دے سکے تو کچھ نہیں ملے گا۔ اس سوال کے دو حصے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو یہ سوال صحیح ترتیب سے پوچھوں گا لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں دوسرا حصہ پہلے پوچھ لوں۔"

"پوچھ لیں۔ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔" جیت جانے کے زعم میں نوجوان نے بے نیازی سے کہا۔

"بتائیے یہ واقعہ کس سن میں پیش آیا؟" طارق عزیز نے دریافت کیا۔

صائمہ عمران۔ جوہر ٹاؤن

صحت مند

ہسپتال میں دماغی امراض کے چند مریض روبہ صحت تھے۔ ڈاکٹر نے ان میں سے ایک کا نفسیاتی جائزہ لینے کی غرض سے کہا۔

"تمہاری بیوی تم سے ملنے آئی ہے۔ باہر بیٹھی ہے، جا کر مل لو۔"

مریض نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ اس سے کہہ دیں کہ مجھ پر پاگل پن کے شدید دورے پڑتے ہیں۔ وہ میرے قریب نہ آئے، ورنہ میں اس کا منہ نوچ لوں گا۔"

ڈاکٹر نے اس کی یہ بات سن کر رپورٹ میں لکھا۔

"یہ مریض اب بالکل صحت مند ہو گیا ہے۔ اسے اسپتال سے رخصت کر دیا جائے۔"

مدیحہ احمد۔ گلشن اقبال

ٹماٹر

"میرے شوہر انتہائی بھلکڑ ہیں۔ کہیں جائیں تو لازماً اپنی کوئی نہ کوئی چیز ضرور بھول آئیں گے۔ دفتر میں ہم نے کوٹ بھول آتے ہیں، کبھی چھتری، کبھی ہینڈ بیگ۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے انہیں ٹماٹر لینے بھیجا ہے۔ ابھی وہ گھر آئیں گے تو تم دیکھنا... وہ ٹماٹر لانا بھول جائیں گے۔ میں یقین سے کہتی ہوں۔"

ایک خاتون بے زاری سے اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھیں۔ اسی لمحے خوشی سے بے قابو ہوتا ایک شخص گھر میں داخل ہوا اور چلایا۔

"بیگم! دیکھو تمہیں کیا ملا ہے۔ سڑک پر ایک خبطی دولت مند میرے ہاتھوں میں اتنے بہت سارے نوٹ تھما کر تیزی سے اپنی کار بھگا لے گیا۔" یہ کہہ کر انہوں نے وہ ڈھیر سارے نوٹ بیوی کے سامنے رکھ دیے۔ بیوی نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پڑوسن کو دیکھا۔

"دیکھا تم نے... میں نے کہا تھا نا، یہ ٹماٹر لانا بھول جائیں گے۔"

ارم جنید۔ پی آئی بی کالونی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو (کسی رشتہ دار کے ساتھ) احسان کے بدلے میں احسان کرتا ہے۔ بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے۔ جب اس سے قطع رحمی (بدسلوکی وغیرہ) کی جائے تو وہ صلہ رحمی (حسن سلوک) کرے۔"

(بخاری)

فائدہ: اس حدیث سے صلہ رحمی کے حقیقی تقاضے واضح ہوتے ہیں۔ جو رشتے دار ادب و احترام سے پیش آئیں اور آپ کے ساتھ اچھا سلوک کریں، ظاہر بات ہے آپ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے لیکن یہ صلہ رحمی نہیں ہے احسان کے بدلے احسان ہے۔ اس کے برعکس آپ کا ایک قریبی رشتہ بداخلاق ہے، آپ سے بدسلوکی کرتا ہے، وہ آپ سے قطع تعلقی کا برتاؤ کرتا ہے، جیسا کہ جہالت کے باعث ہمارے معاشرے میں عام ہے لیکن آپ صبر و تحمل اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں، بدسلوکی کا جواب حسن سلوک سے دیتے ہیں اور ترک تعلق کی کوششوں کے باوجود ان سے تعلق برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ہے اصل صلہ رحمی جس کا تقاضا اسلام کرتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ یہ جذبات، انا اور وقار کا مسئلہ ہے اور ان جھوٹی انا کو شریعت کے تقاضوں پر قربان کر دینا بہت دل گردے کا کام ہے۔ لیکن کامل ایمان بھی یہی ہے کہ ایسا کیا جائے ورنہ باہم حسن سلوک کے تبادلے میں تو کوئی کمال نہیں۔

موت کی یاد:

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کتنی بڑی شان والے صحابی تھے۔ انہوں نے ایک آدمی کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا اور اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ تم مجھے وقت فوقتاً موت کی یاد دلاتے رہنا چنانچہ مختلف محفلوں میں وہ موت کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

ایک دن آپ نے ان سے فرمایا۔

"اب آپ کوئی دوسرا کام کر لیجیے۔"

کہنے لگے۔ "حضرت کیا اب موت یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے!"

آپ نے اپنی ریش مبارک کی طرف اشارہ کیا جس میں کچھ سفید بال آ گئے تھے، فرمایا۔

"یہ سفید بال مجھے موت کی یاد دلانے کے لیے کافی ہیں۔ مجھے ان کو دیکھ کر موت کی یاد آتی رہے گی۔"

ماخوذ "سکون دل"

حمیدہ زمان۔ صوابی

مہکتی ہوئی بات:

- پانی ہمیشہ اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ پتھر ہمیشہ دوسروں کا راستہ روک لیتا ہے۔
- اگر غلط فہمیاں دور نہ کی جائیں تو وہ نفرتوں میں بدل جاتی ہیں۔
- اہمیت دکھ کی نہیں بلکہ دکھ دینے والے کی ہوتی ہے۔ دور رہیے ایسے دوستوں سے جو کھیل ہی کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔

استغفار کا بیان:

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں ایک مرتبہ مجھے عراق کے کسی گاؤں میں رات ہو گئی۔ میں ایک مسجد میں گیا مگر چوکیدار نے نکال دیا۔ میں مسجد کے باہر فرش پر سو گیا۔ چوکیدار نے مجھے پاؤں سے گھسیٹ کر مسجد سے دور کر دیا۔ اسی دوران ایک آدمی مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہ شخص بیٹھے بیٹھے کام کے دوران استغفار پڑھتا تھا۔ صبح میں نے

پوچھا۔

"آپ کو استغفار پڑھنے کا کیا فائدہ ہوا؟"

اس نے کہا: "جی ہاں! میری ہر دعا قبول ہوتی ہے سوائے اس کے کہ میری ملاقات امام احمد بن حنبلؒ سے ہو جائے۔"

(تو انہوں نے) کہا: "میں ہی احمد بن حنبل ہوں اور تم دیکھو کہ مجھے کیسے گھسیٹ کر تمہارے پاس لایا گیا ہے۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

باعثِ عبرت

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فرعون ایک بادشاہ تھا جس نے حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں خدائی کا دعویٰ کیا۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ فرعون دراصل ایک لقب ہے جو مصر کے بادشاہ اختیار کرتے تھے۔ ایسے سینکڑوں فراعنہ گزرے ہیں جن میں سے صرف چالیس حنوط شدہ لاشیں یعنی ممیاں محفوظ رہ گئیں۔ کیونکہ انہیں چوروں سے بچانے کے لیے بعد کے زمانوں میں پروہتوں نے اہرام سے نکال کر وادی شاہان کے ایک پہاڑ میں قدرتی غار نما ہال میں محفوظ کر دیا۔ 1898ء میں اتفاقاً ایک چرواہے کے ہاتھوں دریافت ہوئیں۔

یہ ممیاں مصری عجائب گھر کے دوسری منزل کے ایک کمرے میں رکھی ہوئی ہیں۔

ان میں اس فرعون کی ممی بھی ہے جس نے حضرت موسیٰؑ کی نبوت کو جھٹلایا تھا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے نیل میں اپنے لاؤ لشکر سمیت ڈوب گیا۔ اس کا نام فرعون منفتاح تھا۔ یہ ریمسیس دوم کا بیٹا تھا، جس نے حضرت موسیٰؑ کی پرورش کی تھی۔ منفتاح کی لاش بیسویں صدی عیسوی میں سمندر سے نکالی گئی۔ جو قرآن پاک کے فرمان کے مطابق لوگوں کے لیے عبرت ہے۔ قرآن پاک میں لکھا ہے۔

"ہم تیرے بدن کو آنے والوں کے لیے نشانی کے طور پر بچا لیں گے۔"

منفتاح کے نام کے ساتھ 1225 ق م لکھا ہوا ہے۔ قد ساڑھے پانچ فٹ ہوگا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے۔ اس کی لاش عجائب گھر میں پڑی ہوئی تمام ممیوں میں سب سے زیادہ ٹھیک حالت میں ہے۔ اور ابھی تک بالکل محفوظ ہے۔ اس کے تمام اعضاء یوں سالم ہیں جیسے ابھی ابھی حنوط کیا گیا ہو۔

اللہ کی راہ میں

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے۔ سواریاں اتنی کم تھیں کہ ہم چھ آدمیوں کو صرف ایک اونٹ ملا، جس پر ہم باری باری سوار ہوتے تھے۔ (زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے) ہمارے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ اور ہمارے پاؤں گھس گئے اور میرے دونوں پیروں میں بھی چھالے پڑ گئے اور میرے ناخن جھڑ گئے۔ ہم اپنے پیروں پر پٹیاں باندھتے تھے۔ اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام ذات الرقاع رکھا گیا کیونکہ ہم نے اپنے پیروں پر پٹیاں باندھی تھیں۔

یکسانیت

٭ اگر عقل سب میں یکساں ہوتی تو پھر سب کے سب لوگ لقمان ہوتے۔

٭ اگر سارے پتھر لعل بدخشاں ہوتے تو دنیا میں لعلوں کی قدر نہ ہوتی۔

٭ اگر موتی اولوں کی طرح ارزاں ہوتے تو ہر گھر میں ٹوکرے بھرے ہوتے۔

٭ اگر ریڑ کے پیڑ کے پتے پان ہوتے تو بیل اور گدھے بھی انہیں کھانا پسند نہ کرتے۔

(خوشحال خان خٹک)

حنا سلیم اعوان۔ ماتون باندی

تہمت

حضرت ابو عمران فلسطینیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عاصؓ کی بیوی ان کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی۔ ان کی بیوی نے اپنی باندی کو آواز دی۔ باندی نے آنے میں دیر کر دی تو ان کی بیوی نے کہا۔

"او زانیہ!"

حضرت عمروؓ نے کہا: "کیا تم نے اسے زنا کرتے دیکھا ہے؟"

ان کی بیوی نے کہا: "نہیں۔"

حضرت عمرؓ نے کہا: "اللہ کی قسم! تمہیں اس باندی کی وجہ سے قیامت کے دن اسی کوڑے مارے جائیں گے۔"

ان کی بیوی نے اس باندی سے معافی مانگی۔
باندی نے معاف کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: "یہ بے چاری تمہیں کیوں معاف نہ کرے، یہ تمہاری ماتحت جو ہے اسے آزاد کرو۔"

ان کی بیوی نے کہا: "کیا اسے آزاد کرنا کافی ہو جائے گا؟" (پھر مجھے آخرت میں سزا تو نہیں ملے گی)

حضرت عمرؓ نے کہا: "ہاں امید ہے۔"

مکافاتِ عمل

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ایک ظالم بدبخت کمزوروں پر ظلم کرتا اور ان کی لکڑیاں سستے داموں خرید کر انہیں زیادہ منافع پر فروخت کر دیتا تھا۔

ایک دن ایک نیک شخص نے اس سے کہا۔
"تو ہر ایک کو نقصان پہنچاتا ہے کیا تو سانپ ہے یا الو کہ جہاں بیٹھے وہاں ویرانی ہو، اگر تیرا زور ہم پر چلتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تیرا یہ زور اللہ عزوجل پر بھی چل جائے۔ اپنی زمین پر ظلم بند کر دے تاکہ کسی مظلوم کی بددعا آسمان تک نہ پہنچ جائے۔"

اس ظالم نے اس نیک شخص کی نصیحت پر کان نہ دھرے اور دولت کے نشے نے اسے گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا۔ ایک بار اس کی لکڑیوں کے گودام میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اب وہ نرم بستر کے بجائے گرم راکھ پر بیٹھتا تھا۔

ایک دن وہی نیک شخص وہاں سے گزرا تو اس نے اس ظالم کو کسی سے بات کرتے دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"نا معلوم آگ کہاں سے آئی جس نے میرا گودام جلا کر خاکستر کر دیا۔"

اس نیک شخص نے کہا کہ "یہ آگ ان غریبوں کے دلوں کا دھواں تھا اور یہ ان پریشان دلوں کی آہ تھی جن پر تو ظلم کرتا تھا۔
یاد رکھو کہ پریشان دل کی آہ سارے جہان کو پریشان

کر دیتی ہے۔"

خسرو پرویز کی قبر کی محراب پر لکھا تھا "چند روز تک حکومت کرنے کے بعد جب ہم خاک میں مل جائیں گے تو مخلوق ہمارے سروں پر چلے گی۔ اللہ جس طرح آج ہم حکومت کرتے ہیں اسی طرح کل دوسرے حکومت کر رہے ہوں گے۔ پس رعایا کو مظلوموں کی آہ سے بچو کہ اللہ عزوجل مظلوموں کی پکار نزدیک ہو کر سنتا ہے۔"
(حکایاتِ سعدیؒ۔ گلستان)

بجا ہے فرمایا

- کسی ایک انسان کو سب کچھ سمجھنا زندگی برباد کر لینے کے مترادف ہے کیونکہ توحید کی صفت صرف اللہ کے لیے ہے۔
- بڑا ادب جو صرف بادشاہوں کے بارے میں باتیں کرے وہ اس ماں کی مانند ہے جو اپنے بچوں کو ادب نہ سکھائے اور صرف ان کے بارے میں باتیں کرے۔ (ڈسرائیلی)
- سچ حق جو بھی خواہش کا اظہار کرو۔
- مصیبت زدوں کے لیے امید کے سوا کوئی دوا نہیں۔ (شیکسپیئر)
- جذباتِ انسانی میں سب سے زیادہ کارآمد جذبہ امید ہے۔

شفاعت بتول نین تارا۔ جام پور

سوچ سمجھ کر بولنا

جس طرح ریت میں پانی کے قطرے جذب ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہمارے چند جملے کسی کے دل میں نشتر بن کر اتر سکتے ہیں۔ اور دوسروں کے دل میں دکھ کا احساس پیدا کر سکتے ہیں۔ جس طرح پانی کے چند قطرے ریت سے نکالے نہیں جا سکتے، اسی طرح ایک دفعہ زبان سے نکلی ہوئی بات کا اثر بھی دل سے ـــ نہیں نکالا جا سکتا۔ انسان اپنی ترجیحی معاف تو کر سکتا ہے بھول نہیں سکتا۔ اس لیے سوچ سمجھ کر بولیں۔

حلیمہ زمان۔ بھوانی

خالدہ جیلانی

شبانہ سحر ——— ڈی جی خان

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

روشنی کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

عائشہ خان ——— ننکانہ صاحب

عشق تیری انتہا، عشق میری انتہا
تو بھی ابھی نا تمام، میں بھی ابھی نا تمام

افق آتش ——— چیچہ وطنی

عجیب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں

شازیہ ہاشم ——— گوندل

موسم کو بدلتا دیکھا نہیں
ہم نے انسان کو بدلتے دیکھا ہے

تحریم ——— گوجرہ

اک لمحہ ملا تھا کہنے کو
زندگی بھر کی کیا بات کرتے

شہناز اقبال ——— جھنگ

میرا خیال تھا یہ سلسلہ دنوں تک ہے
مگر یہ لوگ مرے خواب بھی بھلانے لگے

تحمینہ اکرم ——— گگو منڈی

لفظوں کے ستم، لہجوں کے آزار بہت ہیں
کہنے کو اس شہر میں غم خوار بہت ہیں

ندا یوسف ——— کراچی

شام آ رہی ہے ڈوبتا سورج بتلائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

درخشاں نور ——— فیصل آباد

کچھ اور بڑھ گئی ہے اندھیروں کی زندگی
یوں بھی ہوا ہے جشن چراغاں کبھی کبھی

انعم قمر ——— ملتان

ہم سے شکایتیں بجا، ہم کو بھی ہے مگر گلہ
چاہت ہم نہیں اگر، چاہتے آپ بھی نہیں

رخسانہ فرزانہ ——— لاہور

یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں توڑ گیا ہے کوئی
اب ہمیں خود کو بہت دیر جوڑنا ہوگا

بشریٰ ——— کراچی

بس تجھ ایک ہو تو بہت ہے
ان کو کھوتے کا اس کو رونے کا
بس یہی زندگی کا حاصل ہے
ایک احساس اپنے ہونے کا

زیتون خان ——— پشاور

سوچ لیجیے کہ نہ جانے کسی کا دل
گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں
خالدہ وہ بات تو اسے یاد بھی نہیں
ہم بھی کو خوں کر گئے جس کے ملال میں

نصرت زہرا ——— کراچی

جاگتا نہیں گیا، کبھی سویا نہیں گیا
ہم سے حساب ہجر بھی نہیں رکھا گیا
اک عمر جن پہ جاں کو نچھاور کیے رہے
ان سے ہمارا حال بھی پوچھا نہیں گیا

بشریٰ خالد ——— کراچی

جس دل رُبا کی خاطر پائی رسوائی بہت
ہم نے اپنے عشق کی سچائی دکھلائی بہت
کیا ملے گا تجھ کو زنجیر رفاقت توڑ کر
تو بھی تنہا میں بھی تنہا اور تماشائی بہت

نمرہ اقصیٰ ——— کراچی

خوشی بن کر اٹھے ہر نظر پیغام ہو جائے
ستارا اگر دے پیشے کہرام ہو جائے
شعیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کر چلتے ہیں جو راستہ عام ہو جائے

لائبہ ——— چونیاں

اگر کبھی قسمت سے ملے نکل آئیں کسی صورت
چراغ دل کی خاطر ہم بھی کوئی کام کر جائیں
کئی شامیں گزاردی یہی تم جانات میں ہم نے
تمہارے نام اک سندر سہانی شام کر جائیں

ماہ زیب ——— چونیاں

کچھ اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو ٹال دیتا ہوں
اسی سے کہتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں سے کانٹا نکال دیتا ہوں

ارم کمال ——— فیصل آباد

عمر رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے
کسیل جو بھی تھا جاناں اب یہ تیرا
جیت تو کسی کی ہو ہمیں تو ہار جانا ہے

عابد جاوڈ ——— کبیر والا

تیرے نام کی جو روشنی اسے خود ہی تو نے بجھا دیا
نہ جلا سکی جسے دھوپ بھی وہ سے پاگلی نے جلا دیا
میں ہوں گردشوں میں گھرا ہوا مجھے اب اپنی خبر نہیں
وہ جو شخص تھا مرا رہنما اسے راستوں میں گنوا دیا

حوا قریشی ——— ملتان

تیرے قریب رہ کر بھی تجھے تلاش کروں
محبتوں میں مری بدحواسیاں نہ گئیں
خدا خبر کہاں کو بجھیں کے تشنگی آئے
سمندروں کی طرف بھی تو پیاسیاں نہ گئیں

مالیہ عثمان ——— چکوال

بت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو تم نے بکھرا ہے
تیرے وصال کی تیز ہوا

ستارہ ٔ سحر ——— سوہدری شریف

ایسے ٹوٹا ہے تمناؤں کا پندار کہ بس
دل نے چھوڑے ہیں محبت میں وہ آزار کہ بس
ایک جھونکے میں زمانہ میرے ہاتھوں سے گیا
اس قدر تیز ہوئی وقت کی رفتار کہ بس

عائشہ جمیل ——— کراچی

تھا کوئی جو میرے دل کو زخم دے گیا
زندگی بھر جینے کی قسم دے گیا
لاکھوں پھولوں میں سے ایک پھول چنا تھا میں نے
جو کانٹوں سے بھی گہری چبھن دے گیا

الوین فاطمہ / سیفا بتول ——— ملتان

ری نہ جان انا تھی میری کج ادائی کے پیچھے
تجھے بھول نہیں نہ جاتے اگر خفا نہ ہوتا

کائنات اصغر / فرزانہ ——— ڈسکہ

ہم نے بیار دگر کو نہ مد جو صف دشمناں کو خبر کر دو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سر کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

عابدہ پروین ——— رحیم یار خان

سو اب بند مٹھی میں اندھیروں کی حکومت
مجھے جگنو ہتھیلی میں چھپا لینے کی عادت تھی
میں ان کو ڈال کر وانا بہت مسرور ہوتی تھی
مجھے آنگن کی چڑیوں سے دعا لینے کی عادت تھی

نوفیہ زیب جمر ——— بورے والا

شک تو تھا کہ محبت میں خسارے ہوں گے
یقین یہ تھا کہ سارے ہمارے ہوں گے

نوال افضل تبسم ——— گجرات

کیا ملے مجھے زنجیر رفاقت تو زکر
تو بجز تنہا میں بھی تنہا اور تنہائی بہت
عمر بھر کی دیا تھیں یہ نظر نظر کی مسافتیں
یہ تو روگ میں مہ و سال کا یہ تو گردشیں ہیں سفر نہیں

سونیا خان ——— نامعلوم

تیری آرزو کی نفرت سے تیری یادوں کا گماں ہے
کبھی مجھ کو تیرا خیال تھا مگر آج اپنا خیال ہے

شعاع کے ساتھ

ادارہ

یاسمین حنفی۔ کراچی

1۔ شعاع کے ساتھ وابستگی تو خیر بچپن سے ہے‘ بہنوں کو پڑھتے دیکھتے تھے باقاعدگی سے پڑھنا 3 سال پہلے شروع کیا ہے‘ ورنہ پہلے تو جو ہاتھ آیا پڑھ لیا کرتے تھے (سمجھ میں جو نہیں آتا تھا) خاص واقعہ تو خیر یاد نہیں بس اتنا کہ پہلے ابو منع کرتے تھے پر اب میرے پیارے ابو خود لا کے دیتے ہیں۔

2۔ روزمرہ کی مصروفیات بس ایک جیسی ہی ہیں‘ صبح نو بجے اٹھتی ہوں میاں کو ناشتا بنا کے دیتی ہوں پھر بھی تین کے سو جاتی ہوں لائٹ جو نہیں ہوتی‘ پھر دوبارہ بارہ بجے اٹھتی ہوں گھر کے کام کاج‘ برتن‘ مستقل کپڑے (ہفتے میں دوبار مشین لگاتی ہوں) پھر جناب ہم ہوتے ہیں اور ہماری ٹی وی۔ موڈ ہوا تو سالن بھی کر لیتے ہیں ورنہ پڑوسیوں سے کیسے لڑاتے ہیں؟ بس جی پھر شام کا کھانا تھوڑا اہتمام سے بنتا ہے۔

3۔ پسندیدہ تحریریں۔ سب سے پہلا ناول جو پڑھا کے ہم بہت روئے تھے وہ تھا ... کی کہانی۔ رائٹر کا نام یاد نہیں۔ اور بھی کتنے ناول ہیں جو دل کو چھو کے گزرے۔ جنت کے پتے۔ شہر دل کے دروازے۔ مرگ وفا زندگی اک روشنی اپنی جھلک تو خیر آج تک کسی بھی ناول میں نظر نہیں آئی۔

4۔ خوبیاں اور خامیاں۔ تو جناب بدولت کے حساب سے تو ہماری اتنی خوبیاں ہیں کہ اب اپنے منہ سے کیا کہیں پڑھ تو سمجھنا ہے (خامیاں بھی ویسے کوٹ کوٹ کے بھری ہیں) تو جناب سنیے خامیاں ..... ضدی بہت ہوں منہ پھٹ بھی کہہ سکتے ہیں اور میرے حساب سے جو سب سے بڑی خامی وہ یہ کہ میں کسی کو معاف نہیں کر سکتی جس نے مجھے تکلیف دی ہو اس سے پھر دوبارہ (آخری حد تک کوشش کرتی ہوں کہ) سامنا نہ ہی ہو تو اچھا ہے (اس کے لیے) خوبیاں تو یہ ہے کہ ہر کسی کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں‘ رازدار ہوں اور کسی کو کچھ بھی منہ پر نہیں جتاتی (میں یار بہت ہو گیا ہے)

5۔ تو سارا ہے۔ کبھی ہم بھی بڑا انجوائے کیا کرتے تھے‘ سب بہن بھائی ساتھ جو ہوتے تھے اب تو بس دور سے بیٹھ کے ہی نظارہ کر لیتے ہیں (سب بہن بھائیوں کی شادی جو ہو گئی ہے!)

6۔ پسندیدہ اقتباس۔ شازیہ چوہدری کے شہر دل کے دروازے سے۔ "پہلے سے اپنی اولاد کو ایک وقت کا کھانا کھلاؤ مگر انہیں اپنی محفوظ و معتبر محبت سے نوازو کہ انہیں کل کلاں کو یہ محرومی دور کرنے کے لیے وہ کسی غلط در پر دستک نہ دے۔" پسندیدہ شعر

وہ اچھا ہے تو بہتر برا ہے تو بھی قبول
مزاج عشق میں عیب یار نہیں دیکھے جاتے

مقدس ارشد لکھنوال کلاں ضلع گجرات

1۔ شعاع اور اپنی دوستی کے بارے میں یہی کہوں گی کہ جب سے لفظوں کو جملوں میں بولنا سیکھا تب سے شعاع کو دیکھ رہی ہوں پہلے امی پڑھتی تھیں پھر بڑی بہن (ماہا صدف) میں ان کا مذاق اڑاتی تھی کہ ہر ماہ ڈائجسٹ منگوانے کی کیا ضرورت ہے ایک جیسی ہی کہانیاں ہوتی ہیں پر جب خود شعاع کا چسکا لگا تو اس کا جواب مل گیا کہ شعاع کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔

2۔ صبح کا آغاز پرندوں کی چہچہاہٹ اور موذن کی پکار سے ہوتا ہے نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی سی تلاوت کی سعادت حاصل کر کے دن کے سکون و اطمینان (جو کہ تلاوت قرآن سے حاصل ہوتا ہے) کے ساتھ کام کا

آغاز کیا جاتا ہے آٹا تو امی گوندھتی ہیں (یہ نہیں کہ مجھے گوندھنا نہیں آتا جتنا آتا ہے بس امی کے ہاتھ سے گوندھے آٹے کی روٹیاں ذرا خستہ خستہ بنتی ہیں) پھر سب گھر والوں کو ناشتہ کروانے کے بعد امی برتن دھوتی ہیں میں لوربلاگ جھاڑو پونچھا کر لیتے ہیں پھر دوپہر کا کھانا بنانے تک میرا اور شعاع کا ساتھ ہوتا ہے۔

ایک بجے دوپہر کی ہنڈیاں چڑھا کر ساتھ ہی تندور سے روٹیاں بنا لیتی ہوں ظہر کی نماز پڑھ کے کھانا کھایا جاتا ہے (بقول نانی اماں کھانا کھا کر شیطان سستی پیدا کر دیتا ہے ''نماز پہلے پڑھ لو) پھر آرام کیا جاتا ہے عصر کے ٹائم بچے ٹیوشن پڑھنے آجاتے ہیں۔

مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد چائے پی جاتی ہے۔ اگر چاول بنے ہوں تو رات کو کھا لیے جاتے ہیں ورنہ گرمیوں میں چائے کے ساتھ فروٹ کیک وغیرہ ہی ہو جاتا ہے سات سے نو بجے تک اگر لائٹ ہو تو ٹی وی دیکھتے ہیں پھر نو بجتے ہی امی کی آوازوں کے ساتھ اٹھ کر وضو کر کے نماز عشاء ادا کرتے ہی بستر پر ''خواب خرگوش'' کے مزے اڑاتے ہیں کیونکہ صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے جناب۔

3 ۔ آج کل زیر مطالعہ ''کیا'' ہی ہے اور ''امر تعلیٰ'' میں اپنی بہن کی جھلک نظر آتی ہے۔ شعاع کی بہت سی تحریریں ہیں جو ایک خوبصورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں کبھی نہ بھولنے والی نمو احمد کی ''قرۃ قرم کا تاج محل'' جنت کے پتے ''بابا ملک'' ''جو چلے تو جاں سے گزر گئے'' پیر کامل ''دل کے موسم'' ''تیری راہ میں رُل گئی'' دے مصنف ''فائزہ افتخار'' ''اک نئی سنڈریلا''

4 ۔ کوئی بھی انسان دنیا میں ایسا نہیں جو خوبیوں و خامیوں سے مبرا ہو۔ خیر جناب بدولت میں موجود خوبی (بقول امی) خدمت گزار بیٹی ہوں دوسروں کی خواہشات کو ترجیح دیتی ہوں کبھی کسی فقیر کو خالی نہیں بھیجا (بقول باجی) ضدی ہوں غصہ جتنی جلدی آتا ہے اس سے جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ کسی بات کو بھی دل میں نہیں رکھتی۔

ساون کا موسم کسے پسند نہیں ہوگا بارش بہت اچھی لگتی ہے خصوصاً ''بارش کے موسم میں چائے کے ساتھ پکوڑے اور کانوں میں واک مین پر گانا۔ ''میرے یار بدل نہ جانا موسم کی طرح'' سننا پسند ہے۔

آخر میں بس یہ کہوں گی کہ زندگی ''محبت'' بھروسا ایک بار ختم ہو جائیں تو دوبارہ یہ چیزیں نہیں ملتیں سوچ سمجھ کے گزاریں۔

گل صفرا سہیل

سینے آئینے میں



توفیق کی بات

بھارتی اداکارہ مونیکا نے اسلام قبول کرنے کے بعد فلم میں کام کرنے کی پچاس کروڑ روپے کی آفر ٹھکرا دی۔ چنائے شہر میں ایک پریس کانفرنس میں رحیمہ (رحیمہ 'مونیکا' کا اسلامی نام ہے۔) نے کہا کہ میں فلمی دنیا کو خیرباد کہہ چکی ہوں۔ اب ایک ارب روپے کی بھی آفر قبول نہیں کروں گی۔ میری دعا ہے کہ میرے والدین بھی اسلام قبول کریں۔ (آمین)

رحیمہ نے دس برس کے دوران پچاس سے زائد ہندی اور تیلگو فلموں میں کام کیا ہے اور پانچ ایوارڈ بھی حاصل کیے ہیں۔ پریس کانفرنس میں رحیمہ (مونیکا) نے بتایا کہ ان کا اسلام قبول کرنا کسی دنیاوی مقصد یا شہرت دولت کے لیے نہیں بلکہ انہوں نے چار برس اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ پھر اسلام قبول کیا ہے۔ کیونکہ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے۔ رحیمہ کے والد عیسائی اور والدہ ہندو ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان کے اسلام قبول کرنے پر خوش ہیں۔

سازش

ہماری فنکاروں میں اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلتی نظر آتی ہیں اور اکثر بعد میں اس کی تردید کرکے ایک دوسرے کی دوست بھی بن جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں جگن کاظم بھی اداکارہ نور کے خلاف بیان بازی کرتی نظر آئیں۔ جگن کاظم اداکاری اور ماڈلنگ کے ساتھ ساتھ آج کل مارننگ شو بھی کر رہی ہیں۔





جگن کاظم نے نور کے بارے میں کہا کہ "اداکارہ نور کی اتنی اوقات نہیں ہے کہ وہ میرا مقابلہ کریں۔ میں نے ہمیشہ معیار کو ترجیح دی ہے۔ (کس چیز کا معیار؟) جبکہ نور جیسی اداکاراؤں کا معیار سب کے سامنے ہے۔ (جگن فنکار تو ایک برادری کی طرح ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی کی اوقات گنتی کی برتری جیسی باتیں سوٹ نہیں کرتیں، کم از کم آپ جیسی پڑھی لکھی اداکارہ سے۔) نور میرے خلاف شوبز حلقوں میں سازشیں کر رہی ہیں۔ لیکن وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوں گی۔ (تو پھر ڈر کس بات کا؟) کیونکہ شائقین میرے کام کو پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر سازشوں کے باوجود میں آج شوبز میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہوں۔"

اسکینڈل

ہمایوں سعید کہتے ہیں کہ فنکاروں کے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے رہتے ہیں۔ اس کو اسکینڈل بنا دینا بیمار ذہنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اداکاراؤں کے ساتھ میرے نام کو جوڑنا درست نہیں۔ سوشل میڈیا پر جعلی اور من گھڑت اسکینڈل پھیلانے والے لوگوں کو آگے آنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ (لیکن سمجھنے کی بات یوں ہے کہ صرف "ہمایوں" کا نام ہی کیوں ہی ہی؟) اشنا میری نئی فلم (وہ کون سی؟) میں اہم کردار کے لیے منتخب کی گئی ہیں شاید لوگوں کو (کون سے لوگوں کو؟) یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔ ماضی میں بھی میرے ساتھ کئی اداکاراؤں کے نام لیے جاتے رہے ہیں لیکن وہ سب غلط ثابت ہوئے۔ (تو پھر پریشانی کس بات کی اگر غلط ہوا تو پھر سب چپ ہو جائیں گے۔)

ہمایوں نے مزید کہا کہ میں اس وقت ڈراموں اور فلموں کی شوٹنگز میں اتنا بزی ہوں کہ اسکینڈل چلانے کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔ (اور اگر خود چل جائے تو؟) میرے اس اسکینڈل کا مرکزی کردار کوئی اور ہے جس کا مجھے ہی نہیں بلکہ پوری انڈسٹری کو پتا ہے۔ (کوئی نئی بات ہے ہمایوں سر پر مت اٹھائیں۔) لیکن میں کسی پر کیچڑ اچھالنے کے حق میں نہیں ہوں۔ (ہاں چھینٹوں کا شوق تو ہوتا ہے نا!)

ترجیح

اداکارہ ماریہ واسطی کو بچپن سے دیکھنے والے بچے بڑے ہو گئے لیکن ماریہ واسطی نے اپنے آپ کو بہت فٹ فاٹ رکھا ہوا اور وہ اب بھی مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ (دینے والوں کا حوصلہ ہے بھئی۔) ماریہ کہتی ہیں کہ لاہور ٹی وی پر بہت کام کیا ہے۔ (چلو جی قسمیں مان لیتے ہیں۔) اور اس شہر کے حوالے سے بہت اچھی یادیں وابستہ ہیں۔ کراچی میں ڈراموں کے حوالے سے ان دنوں زیادہ اور بہتر کام ہو رہا ہے۔ اس لیے بیشتر فنکار کراچی شفٹ ہو رہے ہیں۔ (جی ہاں جب ہی ہر چینل پر اب چند مخصوص لوگ ہی ہر ڈرامے میں نظر آ رہے ہیں۔ بعض میں تو گیٹ اپ بھی نہیں بدلا جاتا۔) لیکن کراچی میں مصروفیت کے باوجود لاہور جانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتی۔

ماریہ کا مزید کہنا تھا کہ کچھ عرصے سے میں نے منفی کرداروں کو ترجیح دینا شروع کی ہے۔ (کیونکہ ہیروئن کا



کردار اب جچتا تمھیں ہے نا) جس سے میری شخصیت میں نکھار آیا ہے۔ (کاش یہ فیصلہ آپ پہلے کرلیتیں۔) میں صاف ستھرا کام کرتی ہوں اور کام کے لیے کسی سے سفارش نہیں کرواتی۔ ان دنوں ایسی فلمیں بن رہی ہیں۔ اگر کوئی مجھے کسی اچھی فلم کی آفر کرے گا تو میں کبھی انکار نہیں کروں گی۔ (کچھ باتیں ضرور کرسکتی ہیں آخر صائمہ بھی تو کر رہی ہیں نا؟)

قسمت

آج کل فلم انڈسٹری میں فلمیں نہ ہونے کے برابر بن رہی ہیں اور ان میں بھی چند مخصوص چہرے ہی نظر آرہے ہیں۔ اس کا حل ہماری انڈسٹری کی اداکاراؤں نے یہ نکالا ہے کہ وہ ٹی وی اور تھیٹر کی طرف آگئی ہیں۔ اب جن کو یہاں بھی امید نظر نہیں آرہی ہے وہ ادھر ادھر ہاتھ مار رہی ہیں (کہ کہیں تو دال گلے۔) اداکارہ زارا شیخ بھی فلم سے مایوس ہوکر اب گلوکاری کے میدان میں قسمت آزمانے کا ارادہ رکھتی ہیں اور ان دنوں وہ گائیکی کی تربیت لے رہی ہیں اور بہت جلد اپنی ایک ویڈیو بھی بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ (یعنی گلوکاری کی آزمائش اولکری) لیکن زارا اگر یہ ویڈیو بھی آپ کی دس سال قبل بننے والی فلم "دیوداس" کی طرح ریلیز نہ ہوسکی تو پھر آپ کیا کریں گی؟

ادھر ادھر سے

شیخ رشید کو اس بات کا ابھی غصہ ہے کہ الیکشن سے قبل نواز شریف نے ان کی صلح صفائی کی تمام کوششیں ناکام بنادیں اور انہیں دوبارہ اپنی پارٹی میں لینے سے انکار کردیا۔

(رؤف کلاسرا۔ راز و نیاز)

وہی سے آئے ماڈرن طلبا نے سنجیدہ سوچ سے جس قسم کے سوال کیے۔ ان کا لب لباب یہ تھا کہ بھارت ایک ہی دفعہ پاکستان پر ایٹم بم پھینک کرا سے ایا پیٹ کیوں نہیں کردیتا۔ بھارت کیوں پاکستان پر فوج کشی کرکے اسے سبق نہیں سکھاتا پاکستانیوں پر جب تک بھارتی ٹینک نہیں چڑھائے جائیں گے تب تک دہشت گردی ختم نہیں ہوگی۔ بظاہر فیشن ایبل اور ماڈرن نظر آنے والے ان طلبا نے جس جنگی جنون کا مظاہرہ اس پروگرام میں کیا کم از کم مجھ جیسے شخص کے لیے وہ چشم کشا تھا۔

(یاسر پیرزادہ۔ ذرا ہٹ کے)

کراچی میں 300 ڈاکٹروں کو بھتے کی کالز موصول ہوئی ہیں۔ یہ کالز جنوبی افریقہ سے لی جارہی ہیں۔

(شرجیل میمن کا انکشاف)

حضرت لیا (حضرت ایوب علیہ السلام کی زوجہ محترمہ)

حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر مثالی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام دنیاوی نعمتیں عطا کیں اور پھر وہ نعمتیں آپ سے واپس لے لی گئیں، لیکن اچھے حال میں اور مصیبت میں صبر کا دامن نہ چھوڑا اور دونوں حالتوں میں ثابت قدم رہے اور آج بھی دنیا والوں کے لیے صبر کی اعلاترین مثال ہیں۔

حضرت لیا علیہ السلام اسی نبی کی وفا شعار، صابر، نیک اور راست گو بیوی تھیں۔ وہ اللہ کی شکر گزار بندی تھیں جنہوں نے سخت آزمائش کے وقت بھی اپنے شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ صبر کیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی اطاعت کی حلاوت سے نوازا۔ ابن عساکر نے ان کا نام لیا علیہ السلام بتایا ہے۔ یہ یعقوب علیہ السلام بن یوسف علیہ السلام بن یعقوب علیہ السلام بن اسحاق علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام کی بیٹی ہیں۔ ابن کثیر نے ان کا نام رحمتہ بنت افرائیم بتایا ہے۔

ایوب علیہ السلام نہایت امیر کبیر شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے تحاشا مال و دولت اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھرپور نوازا تھا جن میں سرفہرست وسیع و عریض سرسبز زرخیز زمینیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ پورا البثنیہ اپنی وادیوں اور پہاڑوں سمیت ان کی ملکیت تھا۔ ان کے پاس ایسے عمدہ اور خوش منظر گھوڑے تھے جن پر نگاہ نہ ٹکے۔ لاتعداد اونٹ، گائیں، بکریاں، ہر قسم کے مویشی ان کی ملکیت تھے۔ کہا جاتا ہے ایوب علیہ السلام کے پاس ایک ہزار بکریاں مع اپنے چرواہوں کے موجود تھیں اور ان کے خدام لونڈیوں اور غلاموں کا تو گویا کہنا ہی کیا، کمتر و تشن اور جانوروں کی خدمت پر مامور تھے۔

ایوب علیہ السلام نہایت متقی، نیک اور رحم دل انسان تھے۔ فقرا و مساکین کی مدد کرنا، یتیموں اور بیواؤں کی کفالت کرنا، مہمانوں کی خاطر کرنا، مسافروں کی اعانت کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔

ایوب علیہ السلام کی بیوی لیا اس پرآسائش زندگی میں خوش اور مگن تھیں مگر ساتھ ہی وہ اللہ کے حقوق سے بھی غافل نہ تھیں۔ ہر دم اس کی بے شمار نعمتوں کا شکر ادا کرتی رہتی تھیں۔ وہ عبادت گزار اور شکر گزار بندی تھیں جو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اپنے بیٹے بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں اور اپنے پروردگار کی مشکور و ممنون رہتیں جس نے ان پر اور ان کے شوہر پر بے تحاشا رزق، مال و دولت اور اولاد جیسی نعمتوں کی بارش کر دی تھی اور ان کو اپنے بندوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی۔

مولانا امین احسن اصلاحی "تدبر قرآن" میں لکھتے ہیں:

"سفر ایوب" میں ہے کہ (حضرت ایوب علیہ السلام) ان کی اس حالت پر شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بڑا حسد ہوا۔ انہوں نے ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ اگر ایوب علیہ السلام دن رات خدا کی عبادت میں لگے رہتے ہیں تو یہ کیا کمال ہوا۔ خدا نے جب اتنا مال و اسباب دے رکھا ہے تو عبادت نہ کریں تو اور کیا کریں۔ ہم تو جب جانیں جب خدا یہ ساری چیزیں ان سے چھین لے پھر بھی وہ اس کے عبادت گزار رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے انہیں محروم کر دیا۔ نہ ان کے پاس مال کی قسم کی کوئی چیز رہ گئی

نہ لونڈی، خدم و حشم باقی رہے۔ ایک ایک کر کے سب ہلاک ہوتے چلے گئے لیکن وہ اس عظیم مصیبت سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے حضور سجدہ شکر کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا "تو نے میرے بندے کو دیکھ لیا سب کچھ چھن جانے کے باوجود میرا ہی ہے۔"

اس پر شیطان نے کہا "یہ مال و اولاد کا معاملہ تھا اس لیے وہ صبر کر گیا۔ میں تو جب جانوں جب تو اسے شدید قسم کے جسمانی آزار میں مبتلا کر دے اور پھر بھی وہ تیرا عبادت گزار رہ جائے۔"

تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک ایسے مرض میں مبتلا کر دیا کہ ان کے سارے جسم پر پھوڑے نکل آئے مگر اس تکلیف کے بعد وہ اللہ کے ذکر میں اور بڑھ گئے اور اس آزمائش میں بھی انھوں نے شیطان کو شکست دے دی۔

اور کہنے لگے "اے پالنے والوں کے پالنے والے تو نے مجھ پر بہت بڑے احسان کیے ہیں مال دیا اولاد دی ہیں اس وقت میرا دل بڑا مشغول تھا اب تو نے سب کچھ لے کر میرے دل کو ان فکروں سے آزاد کر دیا۔ اب میرے دل میں اور تجھ میں کوئی حائل نہ رہا۔"

یہ بیماری کوئی ایک مدت تک نہیں کئی سالوں پر محیط تھی مگر اس حالت میں بھی حضرت ایوب علیہ السلام کے پایہ استقلال میں ذرہ بھر بھی لغزش نہ آئی اور وہ دن رات اپنے رب کا ذکر کرتے اور لمحہ لمحہ اسے یاد کرتے۔

ایوب علیہ السلام کا مرض طول پکڑتا گیا۔ بیماری نے شدت اختیار کر لی سب عزیز و اقارب نے ان سے منہ موڑ لیا۔

ان تمام حالات میں صرف اور صرف ان کی بیوی لیا علیہ السلام تھیں جو ہر دم ان کے ساتھ تھیں۔ جن کے دل میں اس حال میں بھی اپنے شوہر کے لیے محبت و ہمدردی تھی۔ وہ دن رات ان کی خدمت کیا کرتیں۔ ہر وقت ان کا خیال رکھتیں کیونکہ وہ گزرا وقت نہیں بھولی تھیں جب ہر طرح کی آسائش تھی اصحت و عافیت تھی تو ایوب علیہ السلام کس طرح ان کا خیال رکھتے تھے۔

اب صحت کا معاملہ یہ تھا کہ قضائے حاجت کے لیے وہ ان کے ساتھ جاتیں کیونکہ ان کے لیے چلنا پھرنا دشوار ہو چکا تھا۔ گھر بار مال و دولت ختم ہو چکا تھا۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہ تھا۔

وہ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور اپنے شوہر کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی رہیں۔ ان نامساعد حالات میں بھی ان کے ماتھے پر بل تک نہ پڑا اور اپنے صابر شوہر کے ساتھ مشکلات جھیلتی اور صبر شکر کے مراحل طے کرتی رہیں اور اپنے آپ کو اللہ کے حکم پر راضی رہنے والی عورت ثابت کر کے بہترین بیوی کی مثال قائم کی۔

یہ آیات باطنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو ابتلا سے درجات بلند کرنے، علم خدا اور ناگوار امور پر صبر و شکر کا اعلیٰ عملی نمونہ بنانے کے لیے آزماتا ہے۔

ایا علیہ السلام حضرت ایوب علیہ السلام کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھی ہوتیں۔ ایک دن حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ تکلیف جھیلتے زمانہ گزر گیا اور ان کے صبر و شکر میں کوئی کمی نہ آئی تو لیا نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے نبی آپ تو مستجاب الدعوات لوگوں میں سے ہیں، اللہ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو صحت یاب کر دے۔"

تو ایوب علیہ السلام فرمانے لگے کہ "ستر سال تک اللہ نے مجھے صحت و عافیت میں رکھا تو اگر ستر سال تک میں اسی حالت میں رہوں اور صبر کروں تو یہ بھی بہت کم ہے۔"

ان کی رضا و تسلیم سے بھرپور بات سن کر لیا کانپ اٹھیں۔ وہ ان کا ساتھ دیتی رہیں اور ان سے محبت اور تعلق نبھاتی رہیں کیونکہ وہ اللہ کے نبی ایوب علیہ السلام پر دل سے ایمان رکھتی تھیں۔

مطابق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایوب علیہ السلام تیرہ سال تک مصائب کے امتحان میں مبتلا رہے حتیٰ کہ تمام عزیز و اقارب قریب و بعید کے متعارف سبھی نے

ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی البتہ ان میں سے دو عزیز ضرور صبح و شام ان کے پاس آتے رہے۔ ایک مرتبہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایوب علیہ السلام نے ضرور کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے تب ہی تو وہ اس کی پاداش میں ایسی سخت مصیبت کے اندر مبتلا ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیا خدا ان پر مہربان نہ ہوجاتا اور ان کو شفا نہ ہوجاتی۔"

یہ بات دوسرے نے حضرت ایوب علیہ السلام سے کہہ سنائی۔

ایوب علیہ السلام یہ بات سن کر بہت بے چین اور مضطرب ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں سربسجود ہوکر دعاگو ہوئے اور ان کی دعا کو فوراً" بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت حاصل ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ رفع حاجت کے لیے اپنی جگہ سے اٹھے اور ان کی بیوی ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ جب فارغ ہوئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے تو خدا کی وحی نازل ہوئی کہ

"زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مارو۔"

اور جب انہوں نے ٹھوکر ماری تو پانی کا چشمہ ابل پڑا اور انہوں نے غسلِ صحت کیا اور پہلے سے زیادہ صحیح اور تندرست نظر آنے لگے۔ یہاں بیوی انتظار کررہی تھیں کہ ایوب علیہ السلام تازہ اور شگفتگی کے ساتھ سامنے نظر آئے۔ قطعاً" نہ پہچان سکیں اور ایوب علیہ السلام کے متعلق ان ہی سے دریافت کرنے لگیں۔ تب آپ علیہ السلام نے فرمایا میں ہی ایوب ہوں اور خدا کے فضل و کرم کا واقعہ سنایا۔

روز مرہ کے کھانے کے لیے ایوب علیہ السلام کے پاس ایک کٹھڑی گیہوں کی اور ایک جو کی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے گیہوں کو سونے اور جو کو چاندی میں بدل دیا۔

لیا علیہ السلام ہر وقت حضرت ایوب علیہ السلام کی تیمارداری میں مشغول رہا کرتی تھیں ایک مرتبہ انہوں نے ایوب علیہ السلام کی انتہائی تکلیف سے بے چین ہوکر کچھ ایسے کلمات کہہ دیے جو صبرِ ایوبی کو ٹھیس پہنچانے والے تھے اور اللہ کی جناب میں شکوہ لیے ہوئے تھے۔ ایوب علیہ السلام اس کو برداشت نہ کرسکے اور قسم کھا کر فرمایا کہ میں تجھ کو سو کوڑے لگاؤں گا۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام کی مدت امتحان ختم ہوگئی اور صحت یاب ہوئے تو قسم پوری کرنے کا سوال سامنے آیا۔ ایک جانب لیا علیہ السلام کی انتہائی وفاداری، غمگساری اور حسنِ خدمت کا معاملہ تھا اور دوسری جانب قسم کو سچا اور پورا کرنے کا سوال۔

ایوب علیہ السلام سخت تردد میں تھے کہ کیا کریں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس نیک بی بی لیا کی نیکی اور شوہر کی فرمانبرداری کا یہ صلہ دیا کہ ایوب علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ سو تنکوں کا ایک مٹھا بنائیں اور اس سے اپنی رفیقہ حیات کو ماریں تاکہ ان کی قسم بھی پوری ہوجائے اور لیا علیہ السلام کو تکلیف بھی نہ ہو۔ اس حکم سے اللہ کی نظر میں لیا علیہ السلام کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا:

"حضرت ایوب علیہ السلام غسل فرمارہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سونے کی چند ٹڈیاں ان پر برسائیں۔ ایوب علیہ السلام نے انہیں دیکھا تو مٹھی بھر کر کپڑے میں رکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو پکارا۔

"ایوب کیا ہم نے تم کو یہ سب کچھ دے کر غنی نہیں بنایا پھر یہ کیا؟"

ایوب علیہ السلام نے عرض کی "پروردگار یہ سب صحیح اور درست مگر تیری نعمتوں اور برکتوں سے کون بے پروا ہوسکتا ہے۔"

اللہ عزوجل نے کڑے امتحان میں سرخروئی حاصل کرلینے کے بعد ایوب علیہ السلام اور لیا علیہ السلام پر اپنے انعامات کی بارش کردی۔ ان کے اہل و عیال، مال و دولت دوگنے چوگنے کرکے انہیں لوٹا دیے اور جو مال متاع اور بال بچے دنیا میں چھن گئے تھے ان کے بدلے میں انہیں بے پناہ اجر و ثواب سے نوازا۔

سچ ہے اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(بہ شکریہ ماہنامہ بتول)

✡

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دہی بڑے چنا چاٹ

اجزا :

دہی	دو کپ
ابلے کابلی چنے	ایک کپ
مونگ، ماش کی دال	آدھا آدھا کپ
آلو، ٹماٹر	دو دو عدد
پیاز	ایک عدد
میٹھا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا، زیرہ، کٹی مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	حسب ذائقہ
ہینگ	ایک چٹکی
پاپڑی	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

مونگ اور ماش کی دالیں چار گھنٹے تک بھگونے کے بعد پیس لیں اور اس میں نمک، میٹھا سوڈا، تھوڑی سی کٹی ہوئی لال مرچ اور آدھا چمچہ پھینٹا ہوا دہی ڈال کر رکھ دیں۔ آمیزہ پتلا نہیں ہونا چاہیے۔ فرائنگ پین میں ایک کھانے کا چمچہ تیل گرم کرکے اس میں ہینگ ڈالیں پھر ثابت دھنیا اور ثابت زیرہ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کوٹ کر دال میں ملا دیں۔ کڑاہی میں دال کے بڑے بنا کر سنہرا ہونے تک تلیں پھر نمک ملے پانی میں ڈال دیں۔ دہی میں نمک اور بھنی کٹی ہوئی لال مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ آلو کو ابال کر چوکور کاٹ لیں اور کابلی چنوں کے ساتھ دہی میں ڈالیں پھر بڑے بھی پانی سے نکال کر دہی میں ڈال دیں۔ ٹماٹر، مرچ، پیاز اور ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں اور ہلکے ہاتھ سے سب کو مکس کر دیں۔ چاٹ مسالا، پاپڑی اور املی کی چٹنی کے ساتھ مزے دار دہی بڑے چنا چاٹ پیش کریں۔

ویجی ٹیبل آملیٹ

اجزا :

انڈے	چار عدد
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر، آلو	ایک ایک عدد
دودھ	ایک چوتھائی کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چوتھائی کپ

ترکیب :

انڈوں میں نمک، لال مرچ اور دودھ ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر اس میں چوپ کیے ہوئے آلو، پیاز، ٹماٹر، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر پھینٹیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کرکے آملیٹ کا آمیزہ ڈال کر آنچ ہلکی کر دیں۔ ڈھک کر ایک منٹ تک پکائیں۔ آملیٹ سیٹ ہو جائے تو پلٹ کر دوسری طرف سے پکائیں۔ دونوں طرف سے پک جائے تو پلیٹ میں نکال کر پراٹھے کے ساتھ پیش کریں۔

اسپیگھٹی فروٹ چاٹ

اجزا :

سیب، خربوزہ	ایک ایک عدد
کیلے	چھ عدد
آڑو	تین عدد
جیلی، فریش کریم	آدھا آدھا کپ
چینی	چار کھانے کے چمچے
اسپیگھٹی	آدھا پیکٹ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

اسپیگھٹی کو نمک اور تیل والے پانی میں ابال لیں

ٹھنڈے پانی سے گزار کر چھان لیں۔ تمام پھلوں کو چوکور کاٹ لیں۔ دو رنگ کی جیلی الگ الگ جما کر چوکور کاٹ کر رکھ لیں۔ فریش کریم میں دو چٹکی نمک اور چینی ڈال کر پھینٹ لیں۔ پھر کٹے ہوئے پھل اور اسپیگھٹی ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں۔ جیلی سے سجاوٹ کرکے فریج میں ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔ فریش کریم دستیاب نہ ہو تو

تب دہی استعمال کر سکتی ہیں لیکن اس صورت میں کیچپ اور آلو کی جگہ دو سرے۔ چھل استعمال کریں۔

چکن پکوڑے

اجزا :

چکن	تین پاؤ
پیاز	ایک عدد
لہسن	دو جوے
بیسن	آدھا پاؤ
پسا ہوا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

پیاز، لہسن، دو ہری مرچ اور آدھی گٹھی ہرا دھنیا کو آدھا کپ پانی میں بلینڈ کر کے پیسٹ بنا لیں۔ بیسن میں زیرہ، گرم مسالا، سرخ مرچ، ایک چٹکی میٹھا سوڈا اور نمک ڈال کر گھول لیں۔ اوپر والا آمیزہ بھی مکس کر لیں۔ چکن (بغیر ہڈی) کے ٹکڑے بیسن میں ڈال دیں۔ (چکن کو بغیر گوشت کے بھی ملایا جا سکتا ہے اور کیوبز میں کٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں بھی) اچھی طرح لپیٹ کر گرم تیل میں تلیں۔ سنہری ہو جائیں تو اتار لیں۔

چکن ٹکیاں

اجزا :

چکن قیمہ	ایک کپ
میدہ	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
ہری مرچ	دو عدد
سیاہ مرچ زیرہ	ایک ایک چائے کا چمچہ
اجوائن	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

فرائنگ پین میں تھوڑا سا تیل گرم کر کے چوپ کی ہوئی پیاز سنہری کر لیں۔ پیاز، لہسن اور ہری مرچ کتر کر شامل کریں، پھر نمک اور کٹی ہوئی کالی مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کرنے کے بعد قیمہ ڈال کر بھونیں۔ قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو ہرا دھنیا اور زیرہ ڈال کر چولہا بند کر دیں۔ میدے میں نمک، اجوائن اور تقریباً چار کھانے کے چمچے تیل ڈال کر گرم پانی سے گوندھ لیں اور آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر روٹی بیل کر کٹوری کی مدد سے گول کاٹ لیں۔ ایک طرف قیمہ کا آمیزہ رکھ کر دوسرا حصہ پلٹ دیں اور کناروں کو اچھی طرح دبا کر بند کر دیں۔ اسی طرح ساری ٹکیاں بنا کر گرم اور گہرے تیل میں تل لیں۔ چٹنی یا کیچپ کے ساتھ افطاری میں پیش کریں۔

آلو کا پراٹھا

اجزا :

آلو	آدھا کلو
آٹا	ایک کلو
اجوائن	ایک چٹکی
انار دانہ	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

آلو ابال کر میش کریں، پھر اس میں تمام اجزا مکس کر لیں۔ آٹے کا پیڑا بنا کر ایک چھوٹی روٹی بیل کر الگ رکھیں اور دوسری روٹی اسی سائز کی بیلیں۔ اس پر آلو والا آمیزہ رکھ کر اوپر بیلی ہوئی روٹی رکھیں اور ہلکے ہاتھ سے بیل کر تھوڑی بڑی کر لیں۔ کناروں کو اچھی طرح دبا کر بند کر لیں۔ تھوڑے سے تل چھڑک کر آٹے کی مدد سے گوندھیں پھر عام پراٹھوں کی طرح تل لیں۔

لائم جوس

اجزا :

لیموں	آٹھ عدد
لیمن سوڈا	ایک گلاس
چینی	دو چائے کے چمچے

لیمن سوڈا میں چینی ڈال کر گرائنڈ کریں۔ لیموں کو چھیل کر بیج نکال لیں اور لیمن سوڈا میں ڈال کر ایک بار پھر خوب گرائنڈ کر لیں۔ برف ڈال کر ٹھنڈا کریں اور افطار پر پیش کریں۔

خوبصورت بنیے



سکنجبین کے فائدے

گرم موسم میں سادہ لیکن صاف شفاف پانی زیادہ پینا مجرب نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر پانی سے ہٹ کر کچھ پینے کو جی چاہے تو سکنجبین سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اور جھاگ دار مشروبات سے تو یہ کہیں بہتر ہے۔ آیئے ہم بتاتے ہیں کہ ایک گلاس پانی میں آدھا لیموں نچوڑ کر پینے سے آپ کی صحت کو کتنا فائدہ ہو سکتا ہے۔

☆ لیموں میں وٹامن سی کی بہتات ہوتی ہے جو جسم کو بیماریوں سے بچانے والے نظام کو صحت مند رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ سانس کی نالیوں میں انفیکشن کا خطرہ گھٹ جاتا ہے۔ دمہ اور سانس کے دیگر مسائل میں بھی اسکوربک ایسڈ یعنی وٹامن سی استعمال کرنا مفید ہے۔ لیموں میں ایسے اجزا بھی ہوتے ہیں جو جراثیم کش خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں اور لیموں کا یہ جزو نزلہ زکام سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اسکوربک ایسڈ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ جسم میں فولاد کو جذب کرنے میں مدد دیتا ہے کیوں کہ آئرن جسم کے اعصابی نظام کی کارکردگی پر گہرا اثر رکھتا ہے۔

☆ اگرچہ لیموں کا ذائقہ قدرے تیزابی محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہ جسم کے تیزابی مادوں کی تیزابیت معتدل کرتا ہے۔ واضح رہے کہ تیزابیت ہی کی وجہ سے جسم میں درد بھی ہو جاتا ہے' وزن بڑھ سکتا ہے اور دیگر طبی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں' لیکن لیموں کا شربت ان تمام خرابیوں کو ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆ لیموں کا شربت کھانا ہضم کرنے کے لیے بھی بہترین نسخہ ہے۔ لیموں کا رس جگر کو صاف اور فعال کرتا ہے۔ لیموں میں شامل وٹامن سی معدے میں زخم بننے کے خطرے کو بھی کم کر دیتا ہے۔

★ لیموں میں شامل وٹامن سی اور دیگر تمام اینٹی آکسیڈنٹس جسم کو فری ریڈیکل سے پہنچنے والے نقصانات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بڑھاپے کی زیادہ تر علامتوں کا سبب بھی فری ریڈیکلز ہوتے ہیں۔ اگر سکنجبین کی صورت میں اینٹی آکسیڈنٹ جسم کو فراہم کیے جائیں تو فری ریڈیکلز کے نقصانات کی تلافی ممکن ہے۔ ایسی صورت میں جسم پر جھریاں بھی کم نمایاں ہوں گی۔ لیموں کا شربت پینے کے علاوہ لیموں کا عرق ان داغ دھبوں پر براہ راست لگایا بھی جا سکتا ہے جو بڑھاپے کی منزل میں پہنچنے کے بعد جلد پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ لیموں کا شربت خون میں موجود فاسد مادوں کو بھی خارج کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ جس سے جلد کی شگفتگی اور شادابی برقرار رہتی ہے۔

☆ لیموں میں سوزش رفع کرنے کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس لیے دباؤ' چوٹ یا زخم کو ٹھیک کرنے میں وٹامن سی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

☆ ہر صبح کا آغاز اگر آپ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر کریں تو دن بھر آپ کا ہاضمہ ٹھیک رہ سکتا ہے اور رات کو نظام ہضم میں کوئی فاسد مادہ اگر اٹک گیا ہو تو لیموں کا استعمال اسے جسم سے خارج کر دیتا ہے۔